

قدرت الشهاب

ماي



ترتیب

| | |
|-----|------------------|
| 5 | دیباچہ |
| 11 | مال جی |
| 23 | ۱۸- سول لائے |
| 32 | اقبال کی فریاد |
| 37 | آہار قدیمہ |
| 42 | اے بنی اسرائیل |
| 53 | ایک پنچھر |
| 61 | آپ بیتی |
| 68 | اور عائشہ آگئی |
| 79 | غم جانال |
| 85 | ریلوے جنکشن |
| 92 | سردار جسونت سنگھ |
| 99 | نمبر پلیز |
| 107 | سرخ فیٹہ |

| | |
|-----|-----------------|
| 116 | ایک ڈپٹی |
| 125 | کے کے آم |
| 134 | پھوڑے والی ٹانگ |
| 148 | شینوگر افر |
| 157 | شلوار |
| 163 | جگ جگ |
| 170 | آیا |
| 176 | تلاش |
| 184 | دورنگا |
| 191 | جلترنگ |
| 197 | لے دے |
| 202 | کراچی |
| 207 | پیالہ پیگ |

دیباچہ

مشی پر سیم چند سے لے کر اب تک کے افسانہ نگاروں کے درمیان انداز بیان کی متعدد مماثلتیں موجود ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس دور کے افسانہ نگاروں کی انفرادیتیں آپس میں اس طرح پیوست ہیں کہ ایک دوسرے سے الگ پہچانا دشوار ہے۔ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ ایک ہی دور میں سانس لینے اور ایک ہی قسم کے سائل سے نہنہ کی وجہ سے ان افسانہ نگاروں کے اسلوب نگارش کی سرحدیں بعض مقامات پر ایک دوسرے کو چھوٹی ہوئی گزر جاتی ہیں۔ قدرت اللہ شہاب بھی افسانہ نگاروں کی اسی پود سے تعلق رکھتا ہے جن کے سائل یکساں تھے اور جو حقیقت پسندی کی راہ سے ان سائل سے نہنہ تھے، مگر کم سے کم ”ماں جی“ کے مطالعہ سے تو مجھ پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا ہے کہ شہاب کا انداز بیان اپنے ہم عصروں میں سے کسی سے بھی مماش نہیں ہے۔ بعض مقامات پر شہاب کی سادہ زبان کے علاوہ اس کی بے تکلفی اور بے ساختگی منتو کی یاد ضرور دلاتی ہے۔ مگر منتو کے سادہ جملوں کی باقاعدہ نوکیں اور دھاریں ہوتی تھیں۔ اس کے بر عکس شہاب اپنے سادہ جملوں میں بظاہر سادہ سی بات کہہ کر آگے بڑھ جاتا ہے مگر افسانہ مکمل کر لینے کے بعد پڑھنے والے کے تحت الشعور میں ان جملوں کا گھرا اور بھرپور مفہوم دکھتا رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شہاب کا افسانہ ایک بار پڑھ لینے کے بعد اسے ایک بار پھر پڑھنے کو بھی چاہتا ہے۔ یہ خصوصیت بہت کم افسانہ نگاروں کو حاصل ہے۔

”ماں جی“ میں شہاب کے صرف افسانے شامل نہیں ہیں۔ اس مجموعے میں افسانوں کے علاوہ خاکے، مکالے، انشائیں اور سفرنامے بھی ہیں۔ مجموعے کی ترتیب کا یہ

طریقہ ہمارے مروجہ معیاروں کے مطابق نہیں ہے مگر اس مجموعے کے افسانے خاکوں سے، اور خاک کے مکالموں سے، اور مکالے انسائیوں سے، اور انسائیے سفرناموں سے پوری طرح مربوط ہیں اور ان کے درمیان باہمی ربط، شاپ کے کمائی سنانے کے منفرد انداز سے پیدا ہوا ہے۔ وہ خاک کے، انسائیے اور سفرنامے لکھتے ہوئے بھی افسانہ نگار ہی رہتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس طرح شاپ، شاید قطعی غیر شوری طور پر، اردو افسانے کے ایک نئے ادب کی جلوہ گری کا سامان کر رہا ہے۔ آج کل ہمارا جدید تر افسانہ تجدید کا شاہکار ہے (اور تجدید کو حقیقت نگاری کا رد عمل کہا جاتا ہے، حالانکہ وہ دراصل حقیقت سے فرار کا ایک بار عرب نام ہے۔) جب ہمارا نیا افسانہ تجدید کے چنگل سے نکلے گا — اور اردو افسانے کو اگر زندہ رہنا اور نکھرنا ہے تو اسے اس گور کہ دھنے سے نکلا ہی ہو گا۔ — تو اردو افسانے کی بہت میں شاپ کا یہ اجتناد نئی نسل کی رہنمائی کرے گا۔ ظاہر ہے کہ فن افسانہ نگاری کے بعض متყہ تقاضے تو ضرور ہیں مگر یہ صرف تقاضے ہیں، سانچے نہیں ہیں۔ ہر افسانہ اپنا سانچہ آپ ہی تیار کرتا ہے بلکہ بعض اوقات تو افسانہ نگار اپنے ہی افسانے کے سامنے بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس صورت میں یہ بالکل ضروری نہیں ہے کہ افسانہ آج بھی اسی طرح لکھا جاتا رہے جس طرح پرستیم چند یا کرشن چندر یا منتو یا بیدی نے لکھا تھا۔ شاعری کی طرح افسانہ نگاری کے بھی بے شمار بہتی امکانات ہیں۔ صرف تجربے کا حوصلہ شرط ہے۔ شاپ میں یہ حوصلہ موجود ہے۔ اور اس مجموعے کے مندرجات اس حقیقت پر شاہد ہیں۔

شاپ متنوع موضوعات کا افسانہ نگار ہے۔ وہ کسی ایک موضوع، انسانی زندگی کے کسی پللو کا "پیشہ لٹ" نہیں ہے۔ جو بھی موضوع اس کے گھرے اور باریک مشاہدے سے گزرا ہے اور جس بھی واقعے نے اس کے احساس کو چھیڑا ہے، اسے افسانے یا افسانوی تحریر کی صورت میں اس اضافے کے ساتھ پیش کر دیا ہے جو کسی تحریر کو فن پارہ بناتا ہے۔ حقیقت اور فنی حقیقت میں اسی اضافے کا فرق ہے۔ یہیں سے خبر نگار اور افسانہ نگار کی راہیں ایک دوسرے سے الگ ہوتی ہیں۔ خبر کا رد عمل یہ ہوتا ہے کہ کسی مقام پر ایک خوشنگوار یا ناگوار واقعہ ہوا ہے، مگر افسانے کا رد عمل یہ ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ہو رہا ہے اور یہ واقعہ ہم پر سے گزر رہا ہے۔ اس لیے توفن کو کردار سازی کا منصب حاصل

ہے۔ یہاں مجھ پر الزام عاید ہو سکتا ہے کہ میں شَاب کے فن کو مقصدت سے "آلودہ" کر رہا ہوں۔ مجھے یہ الزام قول ہے کیونکہ میری نظر میں یہ "آلودگی" سچ اور اعلیٰ فن کی سب سے بڑی متاع ہے۔ پھول خوبصورت چیز ہے مگر پھول آگانے والے کے ہاتھ سوندھی سوندھی مٹی سے نے ہوئے ہاتھ اس سے بھی زیادہ خوبصورت ہیں۔ تخلیق کا ہیشہ باقی رہنے والا حُسن اسی "آلودگی" میں ہے اور میں خوش ہوں کہ شَاب کا یہ مجموعہ اسی حُسن سے "آلودہ" ہے۔

شَاب کے افسانوں اور خاکوں وغیرہ کے بے حد متنوع موضوعات، عام مروجہ افسانوی موضوعات سے کمرا لگ ہیں۔ کما جا سکتا ہے کہ یہ سب اس کی متنوع زندگی کی دین ہے۔ مگر لوگوں نے تو شَاب سے بھی زیادہ متنوع زندگیاں بسر کی ہیں لیکن نہ ان کے زہنوں کے پھر پھملے اور نہ ان کے دلوں کے بخربی میں سے کوئی اکھوا پھوٹا۔ یہ فین کار شَاب ہی ہے جو اپنے مشاہدے کے دروازے ہیشہ کھلے رکھتا ہے۔ اور کوئی شخصی سی بخوبی تفصیل بھی ایسی نہیں جو اس کے دماغ و دل پر اپنا عکس ڈالے بغیر گزر جائے۔ میں شَاب کے مشاہدے پر بطور خاص اس لیے زور دے رہا ہوں کہ اس کا بے خلافانہ اور بے ساختہ انداز بیان اس امر کی دلیل ہے کہ اس نے جو کچھ بھی لکھا ہے، براہ راست اپنے ذاتی مشاہدے سے لکھا ہے۔ اور اس کا مشاہدہ اس انتہائیک گمرا اور مکمل ہے کہ اگر اس نے کہیں بیرون اور خاکروبوں کو بھی بات کرتے ہوئے دکھایا ہے تو یہ باتیں بیرون اور خاکروبوں ہی کے روزمرہ کی ہیں۔ حریت کی بات یہ ہے کہ ایک اعلیٰ افسر کو اس "خلوق" کے مشاہدے اور مطالعے کا وقت کھا سے ملا۔ اس سوال کا جوابی بھی ہو سکتا ہے کہ سی ایس پی افسر شَاب اور ادیب شَاب دو الگ الگ فحصیتیں نہیں ہیں۔ اور اگر ہم اپنی آسانی کے لیے دونوں کو الگ الگ کر دیں تو پھر یوں سمجھ لیجئے کہ ایک شَاب نے ان کی نفیات کی ایک ایک پرت کو چھان لیا۔

"ماں جی" میں شَاب ایک طنز نگار کی صورت میں بھی نمایاں ہوتا ہے۔ طنز کا غصر اس کی سابقہ تخلیقات میں بھی موجود ہے مگر اس مجموعے میں یہ غضر بہت بلیغ ہو گیا ہے۔ اس کا طنز کسی ایک طبقے یا کسی ایک ادارے کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ وہ معاشرے پر، ادب کی مروجہ قدروں پر، نام نہاد تقدس پر، حدیہ ہے کہ کاروبار حکومت پر بھی طنز کرتا

ہے اور طنز کا یہ وار بڑا بھرپور ہوتا ہے۔ طنز نگاری بہت مشکل فن ہے۔ یہ سب ادیبوں کے بس کاروگ نہیں۔ کامیاب طنز نگاری کے لیے نہ صرف ایک خاص مزاج درکار ہوتا ہے بلکہ مشاہدہ و مطالعہ کا بے پناہ ذخیرہ بھی ضروری ہے اور پھر ان مشاہدات کا منطقی اور سائنسی تجزیہ کرنے کی قوت بھی لازمی ہے۔ مزاج تو ہم لفظوں کے الٹ پھیر سے بھی پیدا کر سکتے ہیں مگر طنز کرنے کے لیے تعلم کی وسعت اور احساس کی شدت سے مسلح ہونا پڑتا ہے۔ شباب اس اسلئے سے پوری طرح آراستہ ہے۔ مثال کے طور پر میں اس کے صرف ایک سفر نامے ”اے بنی اسرائیل“ سے چند اقتباسات پیش کروں گا:

”پولیس کے سپاہی غیر معمولی طور پر موٹے تھے اور گرمیوں کی وجہ سے اپنی دردیوں سے بیزار۔ یہ سپاہی زیادہ تر ٹھیلوں یا کھمبوں کا سما را لیے اونگھ رہے تھے۔ جب بھی آنکھ کھلی تو یوں ہی کسی کو دھکا دے کر، کسی کو ڈانٹ ڈپٹ کر کے اپنے فرانپز منصی سے عمدہ برآ ہو رہے تھے۔

اگر دوسرے مسافروں اور قلیوں کی نگاہیں بُری طرح ان پر نہ جمی ہوتیں تو یہ بزرگ (روم کیتھولک پادری) نرسوں کو اپنے مقدس سینوں سے ضرور چھٹا لیتے۔ بہت سے عرب شہزادے، جو اپنے ملک یا اپنے محلات میں شراب پینے سے مغذور ہیں، اپنے پرائیویٹ جمازوں میں جوق در جوق یہاں (بیروت میں) آتے ہیں اور راتوں رات داؤ عیش دے کر صح سویرے اپنے فرانپز منصی پر واپس حاضر ہو جاتے ہیں۔ بیروت کا شمار بھی دنیا کے ان مذب شرود میں ہے جہاں غریب ہونا تو کوئی جرم نہیں، البتہ بھیک مانگنا ضرور جرم ہے۔

اس خاندان میں ایک چھ سات سال کا لڑکا تھا۔ ایک نو سال کی لڑکی تھی۔ ان کی ماں ایک ادھوری بھار کی طرح جسے وقت سے پلے خزان نے پامال کر ڈالا ہو۔ وہ کبھی اپنے بچوں کی طرف دیکھتی، کبھی راہ گیروں کی طرف اور کبھی اس سپاہی کی طرف جو بید کی چھڑی گھما گھما کر بھک منگوں کو بھگا رہا تھا۔ مجھے روکتے دیکھ کرو وہ لڑکا میری طرف بڑھا اور بڑی لجاجت سے پوچھنے لگا۔ ”کیا آپ میری تصویر کھینچنا چاہتے ہیں؟“

طنز کا تیر سیدھا ہن میں جا کر ترازو ہو جاتا ہے مگر اتنے مؤثر طنز کے لیے شباب کو کسی تکلف، کسی ہیر پھیر، کسی بناؤٹ کی ضرورت نہیں پڑی۔ یہ سادگی بڑی ریاضت کے

بعد حاصل ہوتی ہے۔ میں نے بعض معروف سلیس نگاروں کے ہاں بھی تصنیع کے انبار لگئے ہوئے دیکھے ہیں۔ یہ لوگ پڑھنے والے کو سلاست کا دھوکا دے کر دراصل اپنا تصنیع چھپاتے ہیں۔ ان کی سلاست اپنی سلاست پر اتراتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، مگر شاب کی سادگی میں بلا کی پُر کاری ہے۔

شاب کے ہاں مجھے اگر کوئی خامی نظر آئی ہے تو وہ یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کو افسانے کے موضوع یا اس کے کرواروں سے لا تعلق نہیں رکھ سکا۔ وہ ایک مشائق افسانہ نگار کی طرح آغاز تو عدم وابستگی سے کرتا ہے مگر کہیں نہ کہیں اس کی وابستگی عیاں ہو جاتی ہے۔ اصطلاحی زبان میں اسے افسانہ نگاری کی مکنیک کی خلاف ورزی کہہ لیجئے مگر میں نے محسوس کیا ہے کہ جس چیز نے شاب کی اس خامی کو بیشتر مقامات پر خوبی بنا دیا ہے، وہ موضوع کے ساتھ اس کا خلوص اور پھر اس خلوص کی شدت ہے۔ عدم وابستگی کی کوشش کے باوجود وابستگی کا یہ بالواسطہ اظہار مجھے ترکِ محبت کا فیصلہ کرنے والے اس عاشق کی یاد دلاتا ہے جو اپنے محبوب کو یہ فیصلہ سنانے کے بعد جب پلٹے تو رو دے!

اس مجموعے میں "اور عائشہ آگئی" "ریلوے جنکشن" "سردار جسونت سنگھ" "نمبر پلینر" "پکے پکے آم" "جگ جگ" "آیا" اور "تلائش" کے سے نک سک سے درست افسانے بھی ہیں، "ایک پنچھر" "سینو گرافر" "شلوار" اور "جلتھنگ" کے سے جذبات بھرے رومان بھی ہیں، "اے بنی اسرائیل" کے سے رُلا دینے والے سفرنامے بھی ہیں، "اقبال کی فریاد" "آثارِ قدیمه" "سرخ فیٹہ" اور "ایک ڈسپیچ" کے سے پارہ ہائے طنز بھی ہیں۔ ان میں رابرٹ لانگ اور بیروت کے بیرے اور گوراں اور اس لڑکی باربرا کے سے ہمیشہ یاد رہنے والے کروار بھی ہیں جو متعدد مقامات پر مختلف ناموں سے نمودار ہوتی ہے اور اس کی گرفت کہیں بھی ادھوری نہیں۔ — مگر میں حیران ہوں کہ اس ادب پارے کو کیا نام دوں جس سے اس مجموعے کا آغاز ہوا ہے اور جس سے اس مجموعے نے اپنا نام پایا ہے۔ میں اسے افسانہ یا انشائیہ یا سکیچ یا تاثر یا تذکرہ — کچھ بھی کہنے کا فیصلہ کروں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں اس گراں مایہ تحریر کے ساتھ بے انصافی کر رہا ہوں "ماں جی" ان سب نشری اصناف ادب سے وابستہ ہو کر بھی ان سب سے کوئی الگ اور بلند چیز ہے۔ اردو ادب میں اس کی واحد مثال عصمت چفتائی کا "دوزخی" ہے مگر کیا

ہم "ماں جی" اور "دوزخی" پر نشری ادب کی کسی بھی مروجہ صنف کا ٹپٹا گا سکتے ہیں؟ اس کے باوجود اثر انگلیزی کے لحاظ سے کوئی بڑے سے بڑا افسانہ یا سکیج یا تذکرہ اردو ادب کے ان دو غیر معمولی شاہکاروں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میرا عالمی ادب کا مطالعہ بہت وسیع نہیں تو کچھ ایسا محدود بھی نہیں مگر دوسری زبانوں کے ادب میں بھی "ماں جی" کے پائے کی کوئی چیز میری نظر سے کبھی نہیں گزرا۔ شاید اگر "ماں جی" کے سوا کبھی کوئی چیز نہ لکھتا تو جب بھی ادب اسے صہیوں تک فراموش نہ کر سکتا۔ "ماں جی" کو میں صرف شہاب ہی کا نہیں، پورے اردو ادب کا کارنامہ قرار دیتا ہوں ۔۔۔ اور پھر انسان کے اس مقدس ترین رشتے کا کارنامہ بھی جس کے بعد صرف ایک ہی رشتہ باقی رہ جاتا ہے اور وہ بندے اور خدا کا رشتہ ہے۔

احمد ندیم قاسمی

۲۰ جنوری ۱۹۶۸ء

ماں جی

ماں جی کی پیدائش کا صحیح سال معلوم نہ ہو سکا۔

جس زمانے میں لاکل پور کا ضلع نیانیا آباد ہوا تھا۔ بنجاب کے ہر قبیلے سے غریب الحال لوگ زمین حاصل کرنے کے لیے اس نئی کالونی میں جو ق در جو ق کھنچ چلے آ رہے تھے۔ عرفِ عام میں لاکل پور، جھنگ، سرگودھا وغیرہ کو ”بار“ کا علاقہ کہا جاتا تھا۔

اس زمانے میں ماں جی کی عمر دس بارہ سال تھی۔ اس حساب سے ان کی پیدائش پچھلی صدی کے آخری دس پندرہ سالوں میں کسی وقت ہوئی ہوگی۔

ماں جی کا آبائی وطن تحصیل روپڑ ضلع انبلہ میں ایک گاؤں منیلہ نامی تھا۔ والدین کے پاس چند ایکڑ اراضی تھی۔ ان دنوں روپڑ میں دریائے ستلج سے نہر سمند کی کھدائی ہو رہی تھی۔ نانا جی کی اراضی نہر کی کھدائی میں ضم ہو گئی۔ روپڑ میں انگریز حاکم کے دفتر سے ایسی زمینوں کے معاوضے دیے جاتے تھے۔ نانا جی دو تین بار معاوضے کی تلاش میں شر گئے۔ لیکن سیدھے آدمی تھے۔ کبھی اتنا بھی معلوم نہ کر سکے کہ انگریز کا دفتر کہا ہے اور معاوضہ وصول کرنے کے لیے کیا قدم اٹھانا چاہیے۔ انجام کار صبر و شکر کر کے بیٹھ گئے اور نہر کی کھدائی میں مزدوری کرنے لگے۔

انہی دنوں پر چہ لگا کہ بار میں کالونی کھل گئی ہے اور نئے آباد کاروں کو مفت زمین مل رہی ہے۔ نانا جی اپنی بیوی، دو بیٹوں اور ایک بیٹی کا کنبہ ساتھ لے کر لاکل پور روانہ ہو گئے۔ سواری کی توفیق نہ تھی۔ اس لیے پاپا راہ چل کھڑے ہوئے۔

راستے میں محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتے۔ نانا جی جگہ بہ جگہ قلی کا کام کر لیتے یا کسی ٹال پر لکڑیاں چیر دیتے۔ نانی اور ماں جی کسی کا سوت کات دیتیں یا مکانوں کے فرش

اور دیواریں لیپ دیتیں۔ لاکل پور کا صحیح راستہ کسی کو نہ آتا تھا۔ جگہ جگہ بھکلتے تھے۔ اور پوچھ پوچھ کر دنوں کی منزل ہفتوں میں طے کرتے تھے۔

ڈیرہ دو میینے کی مسافت کے بعد جڑا نوالہ پہنچے۔ پایادہ چلنے اور محنت مزدوری کی مشقت سے سب کے جسم ندھال اور پاؤں سوچے ہوئے تھے۔ یہاں پر چند ماہ قیام کیا۔ نانا جی دن بھر غلہ منڈی میں بوریاں اٹھانے کا کام کرتے۔ نانی چرخہ کات کر سوت پہنچتیں اور مال جی گھر سنجھاتیں جو ایک چھوٹے سے جھونپڑے پر مشتمل تھا۔

انہیں دنوں بقر عید کا توار آیا۔ نانا جی کے پاس چند روپے جمع ہو گئے تھے۔ انہوں نے مال جی کو تین آنے بطور عیدی دیے۔ زندگی میں پہلی بار مال جی کے ہاتھ اتنے پیے آئے تھے۔ انہوں نے بہت سوچا لیکن اس رقم کا کوئی مصرف ان کی سمجھ میں نہ آسکا۔ وفات کے وقت ان کی عمر کوئی اسی برس کے لگ بھگ تھی لیکن ان کے نزدیک سورپے، دس روپے، پانچ روپے کے نوٹوں میں امتیاز کرنا آسان کام نہ تھا۔ عیدی کے تین آنے کئی روز مال جی کے دوپٹے کے ایک کونے میں بندھے رہے۔ جس روز وہ جڑا نوالہ سے رخصت ہو رہی تھیں مال جی نے گیارہ پیسے کا تیل خرید کر مسجد کے چراغ میں ڈال دیا۔ باقی ایک پیسہ اپنے پاس رکھا اس کے بعد جب کبھی گیارہ پیسے پورے ہو جاتے وہ فوراً مسجد میں تیل بھجا دیتیں۔ ساری عمر جعرات کی شام کو اس عمل پر بڑی وضع داری سے پابند رہیں۔ رفتہ رفتہ بہت سی مسجدوں میں بھلی آگئی۔ لیکن لاہور اور کراچی جیسے شرودیں میں بھی انہیں ایسی مسجدوں کا علم رہتا تھا جن کے چراغ اب بھی تیل سے روشن ہوتے ہیں۔ وفات کی شب بھی مال جی کے سرانے مل کے رومال میں بندھے ہوئے چند آنے موجود تھے۔ غالباً یہ پیسے بھی مسجد کے تیل کے لیے جمع کر رکھتے تھے چونکہ وہ جعرات کی شب تھی۔

ان چند آنوں کے علاوہ مال جی کے پاس نہ کچھ اور رقم تھی، نہ کوئی زیور، اسباب دنیا میں ان کے پاس کتنی کی چند چیزیں تھیں۔ تین جوڑے سوتی کپڑوں کے، ایک جوڑا لسی جوتا، ایک جوڑا ربوکے چپل، ایک عینک، ایک انگوٹھی جس میں تین چھوٹے چھوٹے فیروزے جڑے ہوئے تھے۔ ایک جائے نماز، ایک تسبیح اور باقی اللہ اللہ۔

پہنچنے کے تین جوڑوں کو وہ خاص اہتمام سے رکھتی تھیں۔ ایک زیب تن دو سرا

اپنے ہاتھوں سے دھو کر تکینے کے نیچے رکھا رہتا تھا۔ تاکہ استری ہو جائے۔ تیرا دھونے کے لیے تیار۔ ان کے علاوہ اگر چوتھا کپڑا ان کے پاس آتا تو وہ پچکے سے ایک جوڑا کسی کو دے دیتی تھیں۔ اسی وجہ سے ساری عمر انہیں سوت کیس رکھنے کی حاجت محسوس نہ ہوتی۔ لمبے سے لمبے سفر پر روانہ ہونے کے لیے انہیں تیاری میں چند منٹ سے زیادہ نہ لگتے تھے۔ کپڑوں کی پوٹلی بنا کر انہیں جائے نماز میں پیٹا۔ جاڑوں میں اونی فرد اور گرمیوں میں ململ کے دوپٹے کی بکل ماری اور جہاں کئے چلنے کو تیار۔ سفر آخرت بھی انہوں نے اس سادگی سے اختیار کیا۔ میلے کپڑے اپنے ہاتھوں سے دھو کر تکینے کے نیچے رکھے۔ نما دھو کر بال سکھائے اور چند ہی منٹوں میں زندگی کے سب سے لمبے سفر پر روانہ ہو گئیں۔ جس خاموشی سے دنیا میں رہی تھیں، اسی خاموشی سے عقبی کو سدھا رکھیں۔ غالباً اسی موقع کے لیے وہ اکثر یہ دعا مانگا کرتی تھیں، کہ اللہ تعالیٰ ہاتھ چلتے چلاتے اٹھا لے۔ اللہ کبھی کسی کا محتاج نہ کرے۔

کھانے پینے میں وہ کپڑے لتے سے بھی زیادہ سادہ اور غریب مزاج تھیں۔ ان کی مرغوب ترین غذا کمی کی روٹی، دھینے پودینے کی چینی کے ساتھ تھی۔ باقی چیزوں خوشی سے تو کھالیتی تھیں، لیکن شوق سے نہیں۔ تقریباً ہر نوالے پر اللہ کا شکر ادا کرتی تھیں۔ پھلوں میں کبھی بست ہی مجبور کیا جائے تو کبھی کبھار کیلے کی فرماش کرتی تھیں۔ البتہ ناشتے میں چائے کے دو پیالے اور تیرے پر سادہ چائے کا ایک پیالہ ضرور پیتی تھیں۔ کھانا صرف ایک وقت کھاتی تھیں۔ اکثر وہ پیشتر دوپہر کا شازو نا در رات کا گرمیوں میں عموماً مکھن نکالی ہوئی پتلی نمکین لسی کے ساتھ ایک آدھ سادہ چپاتی ان کی محبوب خوراک تھی۔ دوسروں کو کوئی چیز رغبت سے کھاتے دیکھ کر خوش ہوتی تھیں اور ہمیشہ یہ دعا کرتی تھیں۔ سب کا بھلا۔ خاص اپنے یا اپنے بچوں کے لیے انہوں نے براہ راست کبھی کچھ نہ مانگا۔ پہلے دوسروں کے لیے دعا مانگتی تھیں اور اس کے بعد خلق خدا کی حاجت روائی کے طفیل اپنے بچوں یا عزیزیوں کا بھلا چاہتی تھیں۔ اپنے بیٹوں یا بیٹیوں کو اپنی زبان سے کبھی ”میرے بیٹے“ یا ”میری بیٹی“ کہنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ ہمیشہ ان کو اللہ کا مال کہا کرتی تھیں۔ کسی سے کوئی کام لیتا ماں جی پر بہت گران گزرتا تھا۔ اپنے سب کام وہ اپنے ہاتھوں خود انجام دیتی تھیں۔ اگر کوئی ملازم زبردستی ان کا کوئی کام کر دیتا تو انہیں ایک عجیب قسم

کی شرمندگی کا احساس ہونے لگتا تھا اور وہ احسان مندی سے سارا دن اسے دعائیں دیتی رہتی تھیں۔

سادگی اور درویشی کا یہ رکھ رکھا کچھ تو قدرت نے ماں جی کی سرشت میں پیدا کیا تھا۔ کچھ یقیناً زندگی کے زیر دم نے سکھایا تھا۔

جز احوالہ میں کچھ عرصہ قیام کے بعد جب وہ اپنے والدین اور خورد سال بھائیوں کے ساتھ زمین کی تلاش میں لاکل پور کی کالونی کی طرف روانہ ہوئیں تو انھیں کچھ معلوم نہ تھا کہ انھیں کس مقام پر جانا ہے اور زمین حاصل کرنے کے لیے کیا قدم اٹھانا ہے۔ ماں جی پتا یا کرتی تھیں کہ اس زمانے میں ان کے ذہن میں کالونی کا تصور ایک فرشتہ سیرت بزرگ کا تھا جو کہیں سرراہ بیٹھا زمین کے پروانے تقسیم کر رہا ہو گا۔ کئی ہفتے یہ چھوٹا سا قافلہ لاکل پور کے علاقے میں پاپیا دہ بھکلتا رہا۔ لیکن کسی راہ گزر پر انھیں کالونی کا خفر صورت رہنمائے مل سکا آخر تک آکر انہوں نے چک نمبر ۳۹۲ میں جوان دنوں نیازیاً آباد ہو رہا تھا ذیرے ڈال دیئے۔ لوگ جو ق در جو ق وہاں آکر آباد ہو رہے تھے۔ نانا جی نے اپنی سادگی میں یہ سمجھا کہ کالونی میں آباد ہونے کا شایدی یہی ایک طریقہ ہو گا۔ چنانچہ انہوں نے ایک چھوٹا سا احاطہ گھیر کر گھاس چھونس کی جھونپڑی بنائی اور بخرا راضی کا ایک قطعہ تلاش کر کے کاشت کی تیاری کرنے لگے۔ انھیں دنوں محلہ مال کا عملہ پڑتاں کے لیے آیا۔ نانا جی کے پاس آلات منٹ کے کانٹذات نہ تھے۔ چنانچہ انھیں چک سے نکال دیا گیا اور سرکاری زمین پر ناجائز جھونپڑا بنانے کی پاداش میں ان کے برتن اور بستر قرق کر لیے عملے کے ایک آدمی نے چاندی کی دو بالیاں بھی ماں جی کے کانوں سے اتار لیں۔ ایک بالی اتارنے میں ذرا دیر ہوئی تو اس نے زور سے کھینچ لی جس سے ماں جی کے باہمیں کان کا زیریں حصہ بڑی طرح سے پھٹ گیا۔

چک نمبر ۳۹۲ سے نکل کر جو راستہ سامنے آیا اس پر چل کھڑے ہوئے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ دن بھر لوچلتی تھی۔ پانی رکھنے کے لے مٹی کا پیالہ بھی پاس نہ تھا۔ جہاں کہیں کوئی کنوں نظر آیا ماں جی اپنا روپہ بھگو لیتیں تاکہ پیاس لکنے سے اپنے چھوٹے بھائیوں کو چھاتی جائیں۔ اس طرح وہ چلتے چلتے چک ۵۰ میں پنجے جہاں ایک جان پچان کے آباد کارنے نانا جی کو اپنا مزارع رکھ لیا۔ نانا جی مل چلاتے تھے۔ نانی موسیٰ چرانے لے

جاتی تھیں۔ ماں جی کھیتوں سے گھاس اور چارہ کاٹ کر زمیندار کی بھیسوں اور گایوں کے لیے لایا کرتی تھیں۔ ان دنوں انہیں اتنا مقدور بھی نہ تھا کہ ایک وقت کی روٹی بھی پوری طرح کھا سکیں۔ کسی وقت جنگلی بیروں پر گزارہ ہوتا تھا۔ کبھی خربوزے کے چھلکے اُبال کر کھا لیتے تھے۔ کبھی کسی کھیت میں کچی انبیاں گردی ہوئی مل گئیں تو ان کی چنی بنا لیتے تھے۔ ایک روز کہیں سے توریے اور کٹتے کا ملا جلا ساگ ہاتھ آگیا۔ نانی محنت مزدوری میں معروف تھی۔ ماں جی نے ساگ چولے پر چڑھایا۔ جب پک کر تیار ہو گیا اور ساگ کو الٰن لگا کر گھونٹنے کا وقت آیا تو ماں جی نے ڈوئی ایسے زور سے چلانی کہ ہندڑا کا پیندا انٹوٹ گیا اور سارا ساگ بہ کر چولے میں آپڑا۔ ماں جی کو نانی سے ڈانت پڑی اور مار بھی۔ رات کو سارے خاندان نے چولے کی لکڑیوں پر گرا ہوا ساگ الگیوں سے چاٹ چاٹ کر کسی قدر پیٹ بھرا۔

چک نمبرے ۵۰ نانا جی کو خوب راس آیا۔ چند ماہ کی محنت مزدوری کے بعد نئی آباد کاری کے سلسلے میں آسان قطبوں پر ان کو ایک مریعہ زمین مل گئی۔ رفتہ رفتہ دن پھر نے لگے اور تین سال میں ان کا شمار گاؤں کے کھاتے پیتے لوگوں میں ہونے لگا۔ جوں جوں فارغ الیابی بڑھتی گئی توں توں آبائی وطن کی یادستانے گئی۔ چنانچہ خوشحالی کے چار پانچ سال گزارنے کے بعد سارا خاندان ریل میں بیٹھ کر منیلہ کی طرف روانہ ہوا۔ ریل کا سفر ماں جی کو بہت پسند آیا۔ وہ سارا وقت کھڑکی سے باہر منہ نکال کر تماشہ دیکھتی رہیں۔ اس عمل میں کوئی کے بہت سے ذرے ان سے آنکھوں میں پڑ گئے جس کی وجہ سے کئی روز تک وہ آشوبِ چشم میں جلتا رہیں۔ اس تجربے کے بعد انہوں نے ساری عمر اپنے کسی بچے کو ریل کی کھڑکی سے باہر منہ نکالنے کی اجازت نہ دی۔

ماں جی ریل کے تھڑ کلاس ڈبے میں بہت خوش رہتی تھیں۔ ہم سفر عوامیں اور بچوں سے فوراً گھل مل جاتیں۔ سفر کی تھکان اور راستے کے گرد غبار کا ان پر کچھ اثر نہ ہوتا۔ اس کے بر عکس اوپنچے درجوں میں بہت بیزار ہو جاتیں۔ ایک دو بار جب انہیں مجبوراً ایرانڈیشن ڈبے میں سفر کرنا پڑا تو وہ تحک کر چور ہو گئیں۔ اور سارا وقت قید کی صورت کی طرح ان پر گراں گزرا۔

منیلہ پنج کر نانا جی نے اپنا آبائی مکان درست کیا۔ عزیز و اقارب کو تھائے

دیے۔ دعویٰ میں اور پھر ماں جی کے لیے بڑھوئی نے کامل سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس زمانے میں لاکل پور کے مریعہ داروں کی بڑی دھوم تھی۔ ان کا شمار خوش قسمت اور باعزت لوگوں میں ہوتا تھا۔ چنانچہ چاروں طرف سے ماں جی کے لیے پے درپے پیام آنے لگے۔ یوں بھی ان دنوں ماں جی کے بڑے خانہ بائٹھ تھے۔ برادری والوں پر رعب گانختے کے لیے تانی جی انہیں ہر روز نئے کپڑے پہناتی تھیں اور ہر وقت دلنوں کی طرح سجا کر رکھتی تھیں۔

کبھی کبھار پرانی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے ماں جی بڑے معصوم فخر سے کما کرتی تھیں۔ ان دنوں میرا تو گاؤں میں لکنا تک دو بھر ہو گیا تھا۔ میں جس طرف سے گزر جاتی لوگ ٹھمک کر کھڑے ہو جاتے اور کما کرتے یہ خیال بخش مریعہ دار کی بیٹی جا رہی ہے۔ دیکھنے کوں ساخوش نصیب اسے بیاہ کر لے جائے گا۔

”ماں جی! آپ کی اپنی نظر میں کوئی ایسا خوش نصیب نہیں تھا؟“ ہم لوگ چیز نے کی خاطر ان سے پوچھا کرتے۔

”توبہ توبہ پُت۔“ ماں جی کانوں پر ہاتھ لگاتیں۔ ”میری نظر میں بھلا کوئی کسے ہو سکتا تھا۔ ہاں میرے دل میں اتنی سی خواہش ضرور تھی کہ اگر مجھے ایسا آدمی ملے جو دو حرف پڑھا لکھا ہو تو خدا کی بڑی نمرانی ہو گی۔“

ساری عمر میں غالباً یہی ایک خواہش تھی جو ماں جی کے دل میں خود اپنی ذات کے لیے پیدا ہوئی۔ اس کو خدا نے یوں پورا کر دیا کہ اسی سال ماں جی کی شادی عبد اللہ صاحب سے ہو گئی۔

ان دنوں سارے علاقے میں عبد اللہ صاحب کا طویلی بول رہا تھا۔ وہ ایک امیر کبیر گمراہ کے چشم و چراغ تھے لیکن پانچ چھ برس کی عمر میں یتیم بھی ہو گئے اور بے حد مغلوک الحال بھی۔ جب باپ کا سایہ سر سے اٹھا تو یہ اکٹھاف ہوا کہ ساری آبائی جائیداد رہن پڑی ہے۔ چنانچہ عبد اللہ صاحب اپنی والدہ کے ساتھ ایک جھونپڑے میں اٹھ آئے۔ زر اور زمین کا یہ انجام دیکھ کر انہوں نے اسی جائیداد بنانے کا عزم کر لیا جو مہاجنوں کے ہاتھ گروی نہ رکھی جا سکے۔ چنانچہ عبد اللہ صاحب دل و جان سے تعلیم حاصل کرنے میں منہک ہو گئے۔ وظیفے پر وظیفہ حاصل کر کے اور دو دو سال کے امتحان

ایک ایک سال میں پاس کر کے پنجاب یونیورسٹی کے میزیکولیشن میں اول آئے۔ اس زمانے میں غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ کسی مسلمان طالب علم نے یونیورسٹی امتحان میں ریکارڈ قائم کیا ہو۔

اڑتے اڑتے یہ خبر سریسید کے کاؤنوس میں پڑ گئی جو اس وقت علی گڑھ مسلم کالج کی بنیاد رکھے تھے۔ انہوں نے اپنا خاص مشی گاؤں میں بھیجا اور عبداللہ صاحب کو وظیفہ دے کر علی گڑھ بلا لیا۔ یہاں پر عبداللہ صاحب نے خوب بڑھ چڑھ کر اپنا رنگ نکالا۔ اور بی۔ اے کرنے کے بعد انہیں برس کی عمر میں وہیں پر انگریزی، عربی، فلسفہ اور حساب کے لکھر رہ گئے۔

سریسید کو اس بات کی دھن تھی کہ مسلمان نوجوان زیادہ سے زیادہ تعداد میں اعلیٰ ملازمتوں میں جائیں۔ چنانچہ انہوں نے عبداللہ صاحب کو سرکاری وظیفہ دلوایا کہ وہ انگلستان میں جا کر آئی، ایسی کے امتحان میں شریک ہوں۔

چھپلی صدی کے بڑے بوڑھے سات سمندر پار کر کے سفر کو بلاۓ ناگہانی سمجھتے تھے۔ عبداللہ صاحب کی والدہ نے بیٹی کو ولایت جانے سے منع کر دیا۔ عبداللہ صاحب کی سعادت مندی آڑے آئی اور انہوں نے وظیفہ واپس کر دیا۔

اس حرکت پر سریسید کو بے حد غصہ بھی آیا اور وہ بھی ہوا۔ انہوں نے لاکھ سمجھایا بجھایا، ڈرایا، دھمکایا لیکن عبداللہ صاحب اُس سے مس نہ ہوئے۔

”کیا تم اپنی بُوڑھی ماں کو قوم کے مفاد پر ترجیح دیتے ہو؟“ سریسید نے کڑک کر

پوچھا۔

”جی ہاں“ عبداللہ صاحب نے جواب دیا۔

یہ نکا سا جواب سُن کر سریسید صاحب آپ سے باہر ہو گئے۔ کمرے کا دروازہ بند کر کے پہلے انہوں نے عبداللہ صاحب کو لاتوں، مکوں، تھپڑوں اور جوتوں سے خوب پیٹا اور کالج کی نوکری سے برخاست کر کے یہ کہہ کر علی گڑھ سے نکال دیا۔ ”اب تم ایسی جگہ جا کر مرو جہاں سے میں تمہارا نام بھی نہ سن سکوں۔“

عبداللہ صاحب جتنے سعادت مند بیٹے تھے۔ اتنے سعادت مند شاگرد بھی تھے۔

نقشے پر انہیں سب سے دور افتاؤ اور دشوار گزار مقام گلگت نظر آیا۔ چنانچہ وہ ناک کی

سیدھے گلگت پہنچے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں کی گورنری کے عمدے پر فائز ہو گئے۔ جن دنوں مار جی کی منگنی کی فکر ہو رہی تھی۔ انہی دنوں عبداللہ صاحب بھی چھٹی پر گاؤں آئے ہوئے تھے۔ قسمت میں دونوں کا سنجوک لکھا ہوا تھا۔ ان کی منگنی ہو گئی اور اور ایک ماہ بعد شادی بھی ٹھہر گئی تاکہ عبداللہ صاحب ولمن کو اپنے ساتھ گلگت لے جائیں۔

منگنی کے بعد ایک روز مار جی اپنی سیمیلوں کے ساتھ پاس والے گاؤں میں میلہ دیکھنے گئی ہوئی تھیں۔ اتفاقاً یا شاید وانستہ عبداللہ صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔

مار جی کی سیمیلوں نے انہیں گھیر لیا اور ہر ایک نے چھیڑ چھیڑ کر ان سے پانچ پانچ روپے وصول کر لئے۔ عبداللہ صاحب نے مار جی کو بست سے روپے پیش کئے۔ لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ بہت اصرار بڑھ گیا تو مجبوراً مار جی نے گیارہ پیسے کی فرمائش کی۔

”انتے بڑے میلے میں گیارہ پیسے لے کر کیا کرو گی؟“ عبداللہ صاحب نے پوچھا۔ ”اگلی جمعرات کو آپ کے نام سے مسجد میں تیل ڈلوا دوں گی۔“ مار جی نے جواب دیا۔

زندگی کے میلے میں بھی عبداللہ صاحب کے ساتھ مار جی کا لین دین صرف جمعرات کے گیارہ پیسیوں تک ہی محدود رہا۔ اس سے زیادہ رقم نہ کبھی انہوں نے مانگی نہ اپنے پاس رکھی۔

گلگت میں عبداللہ صاحب کی بڑی شان و شوکت تھی۔ خوبصورت بنگلہ، وسیع باغ، نوکر چاکر، دروازے پر سپاہیوں کا پرہ۔ جب عبداللہ صاحب دورے پر باہر جاتے تھے یا واپس آتے تھے تو سات توپوں کی سلامی دی جاتی تھی۔ یوں بھی گلگت کا گورنر خاص سیاسی انتظامی اور سماجی اقتدار کا حامل تھا۔ لیکن مار جی پر اس سارے جاہ و جلال کا ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ کسی قسم کا چھوٹا بڑا ماحول ان پر اثر انداز نہ ہوتا تھا۔ بلکہ مار جی کی اپنی سادگی اور خود اعتمادی ہر ماحول پر خاموشی سے چھا جاتی تھی۔

ان دنوں سرما لکم ہیلی حکومت برطانیہ کی طرف سے گلگت کی روی اور چینی سرحدوں پر پولٹیکل ایجنسٹ کے طور پر مامور تھے۔ ایک روز لیڈی ہیلی اور ان کی بیٹی مار جی سے ملنے آئیں۔ انہوں نے فرماک پہنچے ہوئے تھے۔ اور پنڈلیاں کھلی تھیں۔ یہ بے

جانبی مال جی کو پسند نہ آئی۔ انہوں نے لیڈی ہیلی سے کہا ”تمہاری عمر تو جیسے گزرنی تھی گزر ہی گئی ہے۔ اب آپ اپنی بیٹی کی عاقبت تو خراب نہ کرو۔“ یہ کہہ کر انہوں نے مس ہیلی کو اپنے پاس رکھ لیا اور چند میینوں میں اسے کھانا پکانا، سینا پرونا، برتن مانجھنا، کپڑے دھونا سکھا کر مال باپ کے پاس واپس بھیج دیا۔

جب روس میں انقلاب برپا ہوا تو لارڈ کچندرحدوں کا معائنہ کرنے گلگت آئے۔ ان کے اعزاز میں گورنر کی طرف سے ضیافت کا اہتمام ہوا۔ مال جی نے اپنے ہاتھ سے دس بارہ قسم کے کھانے پکائے۔ کھانے لذیذ تھے۔ لارڈ کچندر نے اپنی تقریر میں کہا ”مژہ گورنر، جس خانماں نے یہ کھانے پکائے ہیں، براہ مریانی میری طرف سے آپ ان کے ہاتھ چوم لیں۔“

دعوت کے بعد عبداللہ صاحب فرحاں و شاداں گھر لوئے تو دیکھا کہ مال جی باور پر جی خانے کے ایک گوشے میں چٹائی پر بیٹھی نمک اور مرچ کی چنی کے ساتھ مکنی کی روٹی کھا رہی ہیں۔

ایک اچھے گورنر کی طرح عبداللہ صاحب نے مال جی کے ہاتھ چوٹے اور کہا ”اگر لارڈ کچندر نے فرمائش کرتا کہ وہ خود خانماں کے ہاتھ چومنا چاہتا ہے تو پھر تم کیا کرتیں؟“

”میں“ مال جی نشک کر بولیں۔ ”میں اس کی موچھیں پکڑ کر جڑ سے اکھاڑ دیتی پھر آپ کیا کرتے؟“

”میں“ عبداللہ صاحب نے ڈرامہ کیا ”میں ان موچھوں کو روٹی میں لپیٹ کر دائرائے کے پاس بھیج دیتا اور تمہیں ساتھ لے کر کھیں اور بھاگ جاتا، جیسے سرستد کے ہاں سے بھاگا تھا۔“

مال جی پر ان مکالموں کا کچھ بھی اثر نہ ہوتا تھا۔ لیکن ایک بار —— مال جی رشک و حسد کی اس آگ میں جل بھُن کر کباب ہو گئیں۔ جو ہر عورت کا ازالی ورثہ ہے۔ گلگت میں ہر قسم کے احکامات ”گورنری“ کے نام پر جاری ہوتے تھے۔ جب یہ چرچاں مال جی تک پہنچا تو انہوں نے عبداللہ صاحب سے گلہ کیا۔

”بھلا حکومت تو آپ کرتے ہیں لیکن گورنری گورنری کہہ کر مجھ غریب کا نام بچ

میں کیوں لایا جاتا ہے خواہ مخواہ!

عبداللہ صاحب علی گڑھ کے پڑھے ہوئے تھے۔ رُگِ طرافت پھر ک اٹھی اور بے اعتنائی سے فرمایا۔ ”بھاگوان یہ تمہارا نام تھوڑا ہے۔ گورنری تو دراصل تمہاری سوکن ہے۔ جو دن رات میرا پچھا کرتی رہتی ہے۔“

مذاق کی چوت تھی۔ عبداللہ صاحب نے سمجھا بات آئی گئی ہو گئی لیکن ماں جی کے دل میں غم بیٹھ گیا۔ اس غم میں وہ اندر کر گئے لگیں۔

کچھ عرصہ کے بعد کشمیر کا مہاراجہ پرتاپ سنگھ اپنی مہارانی کے ساتھ گلگت کے دورے پر آیا۔ ماں جی نے مہارانی کو اپنے دل کا حال سنایا۔ مہارانی بھی سادہ عورت تھی۔ جلال میں آگئی۔ ”ہائے ہمارے راج میں ایسا ظلم۔ میں آج ہی مہاراج سے کوئی گی کہ وہ عبداللہ صاحب کی خبر لیں۔“

جب یہ مقدمہ مہاراج پرتاپ سنگھ تک پہنچا تو انہوں نے عبداللہ صاحب کو بلاکر پوچھ گھو کی۔ عبداللہ صاحب بھی حیران تھے کہ بیٹھے بھائے یہ کیا افتاد آپڑی۔ لیکن جب معاملے کی تھہ تک پہنچ تو دونوں خوب ہے۔ آدمی دونوں ہی وضع دار تھے۔ چنانچہ مہاراجہ نے حکم نکالا کہ آئندہ سے گلگت کی گورنری کو وزارت اور گورنر کو وزیر وزارت کے نام سے پکارا جائے۔ ۱۹۳۷ء کی جنگِ آزادی تک گلگت میں یہی سرکاری اصطلاحات رائج تھیں۔

یہ حکم نامہ سُن کر مہارانی نے ماں جی کو بلاکر خوشخبری ٹھنائی کہ مہاراج نے گورنری کو دیس نکلا دے دیا ہے۔

”اب تم دودھوں نماو، پوتوں پھلو۔“ مہارانی نے کہا۔ ”کبھی ہمارے لیے بھی دعا کرنا۔“

مہاراجہ اور مہارانی کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اس لیے وہ اکثر ماں جی سے دعا کی فرائش کرتے تھے۔

اولاد کے معاملے میں ماں جی کیا واقعی خوش نصیب تھیں؟ یہ ایک ایسا سوال یہ نشان ہے جس کا جواب آسانی سے نہیں سوچتا۔

ماں جی خود ہی تو کہا کرتی تھیں کہ ان جیسی خوش نصیب ماں دُنیا میں کم ہی ہوتی

ہے۔ لیکن اگر صبر و شکر، تسلیم و رضا کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو اس خوش نصیبی کے پردے میں کتنے دکھ، کتنے غم، کتنے صدمے نظر آتے ہیں۔

اللہ میاں نے ماں جی کو تین بیٹیاں اور تین بیٹے عطا کئے۔ دو بیٹیاں شادی کے کچھ عرصے بعد یکے بعد دیگرے فوت ہو گئیں۔ سب سے بڑا بیٹا عین عالم شباب میں انگلتان جا کر گزر گیا۔

کہنے کو تو ماں جی نے کہہ دیا کہ اللہ کامال تھا اللہ نے لے لیا۔ لیکن کیا وہ اکیلے میں چھپ چھپ کر خون کے آنسو رویا نہ کرتی ہوں گی؟

جب عبداللہ صاحب کا انتقال ہوا تو ان کی عمر بیس سال اور ماں جی کی عمر پچھن سال تھی۔ سہ پھر کا وقت تھا۔ عبداللہ صاحب بان کی کھودری چارپائی پر حسب معمول گاؤں تکیہ لگا کر نیم دراز تھے۔ ماں جی پائیتی پر بیٹھی چاقو سے گنا چھیل چھیل کر ان کو دے رہی تھیں۔ وہ مزے مزے سے گنا چوس رہے تھے اور مذاق کر رہے تھے۔ پھر یکا یک وہ سنجیدہ ہو گئے اور کہنے لگے ”بھاگوان شادی سے پہلے میلے میں میں نے تمیں گیارہ پیسے دیے تھے۔ کیا ان کو واپس کرنے کا وقت نہیں آیا؟“

ماں جی نے نئی نویلی دلنوں کی طرح سر جھکا لیا اور گنا چھیلنے میں مصروف ہو گئیں۔ ان کے سینے میں بیک وقت بہت سے خیال اُمّہ آئے ”ابھی وقت کہاں آیا ہے۔ سرتاج شادی کے پہلے گیارہ پیسوں کی تو بڑی بات ہے۔ لیکن شادی کے بعد جس طرح تم نے میرے ساتھ نباہ کیا ہے۔ اس پر میں نے تمہارے پاؤں دھو کر پینے ہیں۔ اپنی کھال کی جوتیاں تمیں پہنانی ہیں۔ ابھی وقت کہاں آیا ہے میرے سرتاج۔“

لیکن قضا و قدر کے بھی کھاتے میں وقت آچکا تھا۔ جب ماں جی نے سر اٹھایا تو عبداللہ صاحب گنے کی قاش منہ میں لیے گاؤں تکیہ پر سور ہے تھے۔ ماں جی نے بتیرا بلایا، ہلایا، چکارا لیکن عبداللہ صاحب ایسی نیند سو گئے تھے جس سے بیداری قیامت سے پہلے ممکن ہی نہیں۔

ماں جی نے اپنے باقی ماندہ دو بیٹوں اور ایک بیٹی کو سینے لگا لگا کر تلقین کی ”بچہ، روٹا مت۔ تمہارے آبا جی جس آرام سے رہے تھے، اسی آرام سے چلے گئے۔ اب روٹا مت۔ ان کی روح کو تکلیف پہنچے گی۔“

کہنے کو تو مار جی نے کہہ دیا کہ اپنے آبا کی یاد میں نہ رونا، ورنہ ان کو تکلیف پہنچے گی۔ لیکن کیا وہ خود چوری چھپے اس خاوند کی یاد میں نہ روئی ہوں گی۔ جس نے باشہ سال کی عمر تک انہیں ایک العزول من سمجھا اور جس نے ”گورنری“ کے علاوہ اور کوئی سوکن اس کے سر پر لا کر نہیں بٹھائی۔

جب وہ خود چل دیں تو اپنے بچوں کے لیے ایک سوالیہ نشان چھوڑ گئیں، جو قیامت تک انہیں عقیدت کے بیان میں سرگردان رکھے گا۔

اگر ماں جی کے نام پر خیرات کی جائے تو گیارہ پیسے سے زیادہ ہمت نہیں ہوتی۔ لیکن مسجد کا ملا پریشان ہے کہ بھلی کاریٹ بڑھ گیا ہے اور تیل کی قیمت گراں ہو گئی ہے۔ ماں جی کے نام پر فاتحہ دی جائے تو مکنی کی روٹی اور نمک مرچ کی چٹنی سامنے آتی ہے لیکن کھانے والا درویش کہتا ہے کہ فاتحہ درود میں پلاو اور زردے کا اہتمام لازم ہے۔

ماں جی کا نام آتا ہے تو بے اختیار رونے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن اگر روایا جائے تو ذر گلتا ہے کہ ان کی روح کو تکلیف نہ پہنچے اور اگر ضبط کیا جائے تو خدا کی قسم غبط نہیں ہوتا۔

۱۸۔ رسولِ لائس

فروری ۱۹۴۲ء میں میرا تبادلہ اُڑیسہ ہوا اور کٹک میں مجھے ہوم ڈیپارٹمنٹ کے ڈپٹی سیکرٹری کے طور پر تعینات کیا گیا۔

اس زمانے میں اُڈیسہ کے وزیر اعلیٰ سری ہری کرشن مہتاب تھے۔ ہوم ڈیپارٹمنٹ کا شعبہ ان کے ماتحت تھا۔ چارج لینے کے بعد میں ان سے ملنے گیا تو انہوں نے پوچھا کہ مجھے رہنے کے لیے کون سا گھر ملا ہے۔ میں نے کہا اُڈیسہ گورنمنٹ مجرداً فردوں کو رہائشی جگہ دینے کے حق میں نہیں ہے۔ اس لیے میں اب تک سرکٹ ہاؤس میں مقیم ہوں۔ مہتاب صاحب مسکرانے اور کہا ”اگر گھر حاصل کرنا ہے تو گے ہاتھوں شادی بھی کر ڈالو۔“

میں نے وزیر اعلیٰ کو مطلع کیا کہ ان کی حکومت نے یہ ضابطہ بھی بنا رکھا ہے کہ شادی کے بعد جب تک کئی پچھے پیدا نہ ہو جائیں کسی افرکو سرکاری مکان نہیں مل سکتا۔

لگے ہاتھوں فی الفور کئی بچوں کا باپ بننا میرے بس کا روگ نہیں تھا چنانچہ میں کافی عرصہ تک سرکٹ ہاؤس میں رہا۔

ایک روز کچھ فاٹلیں لے کر ہری کرشن مہتاب صاحب کے پاس گیا، تو انہوں نے پھر میرے مکان کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ وزیر اعلیٰ ہونے کے باوجود مہتاب صاحب بڑے پُر خلوص اور نیک دل انسان تھے۔ اور اپنے ساتھ کام کرنے والوں کے ذاتی مسائل کی طرف خاص طور پر توجہ دیا کرتے تھے۔

”میرے ذہن میں ایک کوئی نہیں ہے۔“ مہتاب نے کہا ”لیکن اس میں کچھ جن

بُھوت بھی رہتے ہیں۔ اگر تمہیں اس کی صحبت قبول ہو تو وہ مکان ابھی مل سکتا ہے۔“
جن بھوتوں کے ساتھ مجھے ابھی تک ذاتی تعارف کا شرف حاصل نہیں ہوا تھا۔
قصوں اور کہانیوں میں بننے والی یا مافق العادات مختلف میرے نزدیک ایک ممکن وہم کا
درجہ رکھتی ہے۔ میں نے اس موقع پر غنیمت سمجھا اور وہیں بیٹھے بیٹھے متاب صاحب
نے سول لائنز کی نمبر اٹھارہ کی کوئی بھی مجھے الٹ کر دی۔

یہ ایک چھوٹی سی خوشناک بھی تھی۔ لیکن سالماں سال سے غیر آباد رہنے کی وجہ سے
اس کے درودیوار سے وحشت نپک رہی تھی۔ کوئی کے ساتھ ایک وسیع و عریض لان
تھا۔ چاروں طرف لمبی لمبی گھاس اگی ہوئی تھی۔ زرد زرد سوکھے ہوئے پتے ڈھیروں ڈھیر
بکھرے پڑے تھے۔ جا بجا تازہ اور پرانے گوبر پر ٹھکیاں بھجنھنا رہی تھیں۔ ایک چھوٹے
سے تالاب میں کائی جبی ہوئی تھی۔ صحن کے جنوبی گوشے میں جامن کا درخت تھا۔ شمال
مغرب میں ایک درخت سے بہت سی چگاڑیں اٹھی ہوئی تھیں۔ ناریل کے پیڑ کے نیچے
ایک فاقہ زده بلی دھوپ سینک رہی تھی۔ برآمدے میں دو آوارہ کتے اپنے بچوں کے ساتھ
گرد نیس کھجرا رہے تھے۔ اور چگاڑوں کی طرف منہ اٹھا اٹھا کر لمبی لمبی تانوں میں رو رہے
تھے۔

میرے ساتھ ایک کشیری ملازم رمضان تھا۔ اس نے سارا دن لگا کر مکان کو جهاز
پونچھ کر صاف کر دیا۔ دوسری صبح جب وہ شیو کا پانی لے کر آیا تو اس کا منہ لکا ہوا تھا۔
ان دونوں بھار، بنگال اور اڑیسہ میں جا بجا ہندو مسلم فساد ہو رہے تھے۔ رمضان نے رونی
صورت بناؤ کر کما کر رات جب وہ اپنے کوارٹر میں سویا پڑا تھا تو ایک ہندو دبے پاؤں اندر
آیا اور اس کی چارپائی الٹ کر بھاگ گیا۔ رمضان نے اس کا تعاقب کیا تو انہیں اس
کا منہ کھٹاک سے دروازے کے ساتھ لگا، کیونکہ اندر سے کنڈی بند تھی۔

”اگر وہ ہندو باہر سے آیا تھا تو کمرے کی کنڈی اندر سے کیسے بند ہو گئی؟“

”اس میں بھی سالے ہندوؤں کی چال ہو گی۔“ رمضان نے وثوق سے جواب دیا۔
اس کے ذہن میں ہندو مسلم تعصّب یوں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا کہ اب اس میں مافق
الفطرت حدیثات کے لیے کوئی جگہ باقی نہ رہی تھی۔

۱۸۔ سول لائنز کی جو خصوصیات سب سے پہلے کھنکی وہ یہ تھی کہ وقا ”فوقا“ اس

کی چھت انگڑائیاں سی لیتی محسوس ہوتی تھی۔ رات اور دن میں کئی بار چھت کٹاں کٹاں بجتی تھی، جیسے لوہے کی گرم چادر ٹھنڈی ہو کر چھتی ہے۔

ایک رات گیارہ بجے کے قریب میں بجلی بجھا کر بستر پر لینا تو دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے سوچا کہ شاید رمضانی کوئی چیز بھول گیا ہے، لینے آیا ہے۔ لیکن دروازہ کھولا تو برآمدہ خالی تھا۔ البتہ ہوا کا ایک گرم سا جھونکا میرے چہرے سے ضرور لگا۔ فروری کی وہ رات خوب ٹھنڈی تھی لیکن برآمدے میں یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کیس پاس ہی الاو جل رہا ہے۔

اس رات کے بعد یہ دستک ایک معمول بن گئی۔ جیسے ہی بجلی بجھا کر لینا، دروازے پر تھپا تھپ دو تین بار دستک ضرور ہوتی۔ ایک رات جب یہ دستک نہ ہوئی تو مجھے عجیب سا لگا۔ میں بجلی بجھا کر لیٹ ہی رہا تھا کہ سوچ کھٹاک سے بجا اور بجلی خود بخود روشن ہو گئی۔ میں بجلی بجھانے کے لیے اٹھا تو میرے سلپر کمیں نظر نہ آئے۔ پلنگ کے نیچے جھانکا۔ ادھر ادھر تلاش کیا۔ لیکن سلپر ندارد۔ اسی اثناء میں سوچ خود بخود کٹکٹایا اور بجلی بجھ گئی۔ میں دوبارہ لینا تو سرہانے کے نیچے چڑھ رہا تھا کہ اٹھا کر دیکھا تو دو سلپر بڑے سلیقے سے غلاف کے اندر دھرے تھے۔

کوئی کاڑ را ینگ روم سونے کے کرے سے ملحت تھا۔ درمیان میں ایک دروازہ تھا جو عموماً کھلا رہتا تھا۔ دروازے میں بزرگ کی جالی کا ایک باریک سا پردہ لٹکا رہتا تھا۔ یک ایک دروازے کا پردہ ہلا، اور ڈرا ینگ روم میں سرسرا ہٹ سی ہوئی۔ جیسے ریشم کا تھان کھل رہا ہو۔ پھر چوڑیاں مکھیں اور ایک نسوانی آواز نے چند ہچکیاں لیں۔ فرش پر اونچی ایڑی والے زنانہ جوتوں کے چلنے پھرنے کی آواز پیدا ہوئی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پردے کے پیچھے سے جھانکا۔ کمرے میں اندر ہمرا تھا۔ لیکن فضا میں حنا کے عطر کی خوشبو بیچی ہوئی تھی۔ میں نے ڈرا ینگ روم کا بلب روشن کر کے ماہول کا جائزہ لیا۔ ایک اداں خاموشی کے سوا وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ واپس آ کر پلنگ پر لینا تو چھت پر بہت سے بھاری بھر کم قدموں کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی کئی پتھر پے درپے اندر برنسے گئے۔ پھر پتھر میرے واں میں باسیں، آگے پیچھے زور زور سے گرتے تھے لیکن مجھے لگتے نہ تھے۔ دروازہ کھڑکی اور روشن دان بند تھے، لیکن پتھروں کا مینہ بدستور برستا رہا۔ باہر کافی زور کی بارش

ہو رہی تھی۔ لیکن کمرے میں گرنے والے پھر بالکل خشک تھے۔ ایک اینٹ جو میرے بازو کے عین پاس آ کے گری، کوئی ڈھائی سیر و زنی تھی۔

صحیح سوریہ میں نے ان تمام پھروں کو اکٹھا کر کے باہر پھینک دیا تاکہ رمضانی کے دل میں ہندوؤں کی خشت زنی کا رعب نہ بیٹھ جائے لیکن جب وہ میرے لیے چائے لے کر آیا تو بڑی بے بسی سے مجھے خبر دی کہ ساری رات کئی ہندو اس کے کمرے میں کوڑے کر کر کٹ کے نوکرے پھینکتے رہے ہیں۔ ایک بار تو ایک انسانی کھوپڑی بھی اس کی چار پانی پر آ کے گری۔ رمضان بڑے دل گردے کا کشمیری تھا۔ کیونکہ جب میں نے اسے رائے دی کہ رات کو ڈرائینگ روم میں آ کر سورہا کرے تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ ”صاحب اگر میں نے کواڑ چھوڑ دیا تو یہ سالے ہندو سمجھیں گے کہ یہ مسلمان بڑا بودا ہے۔“

اس روز میں نے دوپھر کے کھانے پر ایک دوست کو بلایا ہوا تھا۔ کھانے میں پلاو، کوفتہ اور سیخ کباب تھے۔ جب میں نے نوالہ منہ میں ڈالا تو میرے دانتوں میں ریت ایسی کوئی چیز پکھر کچر کرنے لگی۔ معاً مجھے خیال آیا کہ رمضان نے مصالحہ کچھی سل پر پیسا ہے اور سارے کھانے میں کرک آگئی۔ جس چیز کا نوالہ منہ میں ڈالتا تھا اس میں سکنکریاں سی کڑکڑانے لگتی ہیں۔ لیکن میرا دوست بڑے مزے سے ہر چیز نوش جان فرماء رہا تھا اور اس نے ایک بھی ریت یا سکنکریوں کی شکایت نہ کی۔

کھانے کے بعد میں نے ایک پان لیا۔ منہ میں ڈالتے ہی میرے دانت بُری طرح جھنجھنائے کیونکہ پان میں سپاریوں کی جگہ چھوٹی چھوٹی سکنکریاں بھری ہوئی تھیں۔ سترے کی چہائی میں بھی ریت کے ذرے تھے۔ سیب کا مکڑا کچھی روڑے کی طرح کلتا تھا۔ یہاں تک کہ جب میں نے ایک کیلا چھیل کر کھانے کی کوشش کی تو اس میں بھی کچر کچر کرتی ہوئی مٹی کی آمیزش پائی۔

شام کے وقت میں ڈرائینگ روم میں اکیلا بیٹھا تھا۔ لیکاک کمرے میں بختے ہوئے گوشت کی لپیٹیں آنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد سوچی کے گرم گرم طوے کی سوندی سوندی خوشبو پھیل گئی۔ اس کے بعد لیکاک ایک بہت بڑی چکاڑ زور سے بجلی کے بلب پر آکر لگی۔ بلب ٹوٹ گیا۔ اور اندر ہمراہ ہوتے ہی مجھے یوں نظر آیا جیسے میرے سامنے فرش پر

ایک انسانی جسم سفید چادر میں لپٹا ہوا ہے۔ میں چھلانگ لگا کر باہر نکلنے لگا تو کمرے کے سارے دروازے ٹھپ بند ہو گئے۔ چھت پر باجا سا بجئے لگا، جس میں ڈھول، طبلہ اور شہنائی کے ساز خاص طور پر نمایاں تھے۔ باہر برآمدے میں یوں سنائی دیتا تھا، جیسے بڑے بڑے شہرہ زور گھوڑے پکے فرش پر سرپٹ بھاگ رہے ہوں۔ گھپ اندر ہیرے میں میں نے ایک دروازے کو زور سے کھولنے کی کوشش کی تو ساری چوکھت اکھر کر دھڑام سے زین پر آگئی۔ میں لپک کر برآمدے میں آگیا۔ یا ایک اکھری ہوئی چوکھت اپنی جگہ پر ایستادہ ہو گئی۔ کھٹ کھٹ کر کے کمرے کے سارے دروازے اور کھڑکیاں کھل گئے۔

اس وقت رات کے ساری ہے آٹھ بجے تھے، میں بڑی بے صبری سے رمضان کا انتظار کرنے لگا کہ وہ کھانا لے کر آئے تو مجھے گوشت پوسٹ کا ایک جیتا جاتا انسان نظر آئے۔ جب کافی دیر تک رمضان نہ آیا تو میں نے اپنے ڈرائیور کو آواز دے کر کہا کہ وہ رمضان کو بلا لائے۔ ڈرائیور بھی باور پی خانہ میں جا کر غائب ہو گیا۔ کچھ دیر انتظار کے بعد میں خود وہاں گیا۔ باور پی خانہ خالی تھا۔ چولے میں آگ بجھی ہوئی تھی۔ دروازے کے پاس رمضان خاموش پڑا تھا۔ اس کے نزدیک ڈرائیور بھی دنیا و مافہما سے بے خبر لینا ہوا تھا۔ میں نے ان کے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے تو وہ دونوں جمائیاں لے کر اُٹھ بیٹھے۔ جیسے ابھی طویل نیند سے بیدار ہوئے ہوں۔ رمضان نے اپنی گھری دیکھی، ساری ہے نوبجے کا عمل تھا۔

”اوہ صاحب اتنی دیر ہو گئی۔“ اس نے معدتر طلب آواز میں کہا ”ابھی تک کھانا بھی تیار نہیں ہوا۔“

پھر اس نے زیرِ لب جملہ اہل ہنود کو چند گالیاں دیں جو کالے جادو کا عمل کر کے بیچارے مسلمانوں کو خواہ مخواہ پریشان کر رہے تھے۔

رمضان نے جلدی جلدی دو انڈوں کا آمیٹ بنا یا۔ میں نے آمیٹ کا ایک ٹکڑا کاٹا تو اس میں سے گاڑھے گاڑھے خون کی دھار سی بسہ نکلی۔ یوں بھی آمیٹ سڑی بساندی مچھلی کی طرح بدیودار مردار سا ہو گیا۔ میں نے جلدی جلدی اس سڑاند چھوڑتی شے کو کاغذ میں لپیٹ کر باہر پھینک دیا۔ اگر کہیں غلطی سے رمضان کو پتہ لگ جاتا تو ہندوؤں کے کالے علم کا یہ کرشمہ دیکھ کر اس کے تن بدن کی ساری اسلامی ریکیں بُری طرح دکھنے

لگتیں۔

لیکن میری کوشش کے باوجود اس کالے علم نے بہت جلد رمضان کے دل و دماغ پر پوری طرح تسلط جمالیا۔ میں نے اسے استور روم میں بھیجا کہ وہ میرا گراموفون اور کچھ ریکارڈ نکال لائے۔ تھوڑی دیر بعد وہ پسینے میں شرابور واپس آیا اور رونی صورت بنا کر بولا۔ ”صاحب کوئی حرام زادہ استور میں گھسا بیٹھا ہے اور دروازہ کھولنے نہیں دیتا۔“

میں رمضان کے ساتھ استور روم گیا اور اس کے دروازے کو دھکایا۔ کواڑ تھوڑا سا کھلا، پھر غلیل کے ربڑ کی طرح زنانے کے ساتھ واپس گھوم کر بند ہو گیا۔ ہم دونوں نے کواڑ کے ساتھ کندھے لگا کر زور سے دھکیلا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شے اندر سے پوری قوت کے ساتھ دروازے کو بند رکھنے پر تلی ہوئی ہے۔ یکاکی رمضان کو ایک ترکیب سوجھی۔ وہ چاروں شانے چت زمین پر لیٹ گیا اور اپنے دونوں پاؤں دروازے کے ساتھ ملا کر پورے زور کے ساتھ اسے دھکلینے لگا۔ دروازہ چٹا خ سے کھل گیا اور رمضان اسی طرح لینا ہوا تیز رفتاری کے ساتھ اندر گھستا چلا گیا یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی اسے ٹانگوں سے کپڑ کر بری طرح گھسیت رہا ہے۔ کمرے میں گھپ اندر ہی رہا۔ میں نے بھلی جلانی تو رمضان اٹھ کر کپڑے جھاڑ رہا تھا۔ اس کا پیٹ اور کہیاں بُری طرح چھل گئی تھی اور کپڑوں پر جا بجا خون کے دھبے پڑے ہوئے تھے۔

رمضان لنگڑاتا ہوا خاموشی سے باہر چلا گیا۔ میں نے گراموفون اور چند ریکارڈ اٹھائے اور ڈرائینگ روم میں چلا گیا۔ اتنے میں میرا ڈرائیور اندر آیا اور بولا۔ ”صاحب رمضان گاڑی میں باہر جانا چاہتا ہے، لے جاؤں“

”کہاں جائے گا۔“ میں نے پوچھا۔

”شاید شر جائے گا صاحب۔“

”لے جاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”جلدی واپس آنا۔“

رات کے اندر ہیرے میں جب میری موڑ کپونڈ سے باہر نکلی، تو اس کی پچھلی سُرخ بیان دُور تک نظر آتی رہیں۔ سُرخ روشنی کو دیکھتا رہا۔ جب کار کی بیان نظر سے او جھل ہو گئیں تو پیچھے سے کسی نے میرے کندھے پر ایک ہلاکا سا ہاتھ رکھ دیا۔ میں اچک کر پیچھے مڑا تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ مگر اس غیر مرئی لس کی جھنجھنا ہٹ بھٹ دیر تک میرے رُگ و

پے میں سرسراتی رہی۔ ماحول کی اس گورستانی کیفیت کو توڑنے کے لیے میں نے سہل کا ایک پسندیدہ ریکارڈ گراموفون پر رکھ دیا اور چالی دینے کے لیے باجے کی کنجی کو گھماایا۔ چالی لگنے کی بجائے بڑی سرعت کے ساتھ الٹی طرف گھونٹنے لگی۔ میں نے سوچا شاید چالی پہلے ہی سے پوری طرح چڑھی ہوئی ہے۔ چنانچہ میں نے سوئی بدل کر ساؤنڈ بکس کو ریکارڈ پر رکھ کے چلا دیا۔ ریکارڈ میں سے پہلے ایک ننھے سے بچے کے روئے کی آواز آئی۔ پھر کسی عورت کی سکیاں سنائی دینے لگیں۔ اور پھر گویا ایک بھونچال سا آگیا۔ ریکارڈ میں بھیانک آوازیں آنے لگیں۔ جیسے بہت سارے گلے بیک وقت بے دردی سے گھونٹنے جا رہے ہوں۔ یوں بھی سارے کمرے میں ایک خوفناک سارتعاش چھاگیا اور کھڑکیوں اور دروازوں میں بیسمیلوں سنکھے بجھنے لگے۔ ان ناقوسوں کی آوازوں کی تھی جیسی ہندوار تھیوں کے ساتھ سنکھے پھونکنے پر برآمد ہوتی ہے۔ بجلی کی روشنی مدھم ہوتے ہوتے مومن بتنی کی طرح ہلکی ہو گئی اور دھیمی دھیمی روشنی میں سُرخ سُرخ انگارے سے تیرنے لگے۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا۔ جیسے میرے گرد و پیش بہت سی لاشیں چڑھ جل رہی ہوں۔

شمثان بھومی کے یہ وحشت ناک لمحے بے حد طویل ہو گئے، اور صدیاں گزرنے کے بعد جب میری کار کی تیز تیز روشنی دوبارہ کھڑکی پر پڑی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے سارے مکان کو تیز تیز شعلوں نے اپنی آغوش میں لپیٹ لیا ہے۔ رمضان لکڑاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک سفید ریش بزرگ تھے۔ جنہوں نے سبز منکوں کی تسبیح گلے میں ڈالی ہوئی تھی۔ ان کے ہاتھ میں موٹا سا عصا تھا اور سر پر درویشوں والی چوگوشہ نوپی تھی۔

یہ درویش حاجی علی اکبر مانوس تھے۔ حاجی صاحب کنک کی جامع مسجد کے خطیب تھے اور ایک خوش بیان شاعر ہونے کے علاوہ ان کی نیکی اور پاپ سائی کا بھی بہت چرچا تھا۔ گراموفون بدستور آہ و فغا میں مصروف تھا۔ اور سکموں کی جگہ چاک کرنے والے آواز سرگ میں چیزوں کی طرح گونج رہی تھی۔ حاجی اکبر مانوس چند ساعت دم بخود کھڑے رہے پھر انہوں نے ایک کاغذ پر کچھ لکھ کے گراموفون کے ساؤنڈ بکس پر رکھ دیا۔ ساؤنڈ بکس زخمی ٹانگ کی طرح لٹکھا گیا۔ ایک دو ثانیوں کے لیے اس میں سے کھڑا کھڑ کی آواز آئی اور پھر ریکارڈ میں سہل کی اپنی آواز ”اک بغلہ بنے نیارا۔“ گانے

گئی۔ حاجی علی اکبر مانوس مسکرانے اور اپنی جیب سے تسبیح نکال کر فرش پر دوزانوں بیٹھے گئے۔ میں نے گراموفون بند کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ ساؤنڈ باکس پر دھرا ہوا کاغذ اٹھا کر دیکھا تو اس پر کلمہ طیبہ لکھا ہوا تھا۔

گراموفون تو ٹھیک ہو گیا لیکن سنکھوں اور ناقوسوں کی آواز اب کچھ اور بھی شدید ہو گئی۔ کمرے کی دیواروں کے ساتھ یہ آوازیوں گونجتی جیسے طوفان میں سمندر کی بڑی بڑی لمحیں ساحل سے نکلا گر گر جتی ہیں۔

حاجی علی اکبر مانوس آنکھیں بند کر کے تسبیح پھیرنے لگے۔ رفمان بھی پاس ہی مؤدب بیٹھے گیا اور اپنی جیب سے دعائے گنج العرش نکال کر درود کرنے لگا۔ جوں جوں حاجی صاحب کا مراقبہ عمیق ہوتا گیا، چاروں طرف گونجتی ہوئی آوازوں میں ایک نامعلوم سی تسلیکین پیدا ہونے لگی۔ جیسے آگ کے تیز تیز شعلوں پر ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہو۔ پھر رفتہ یہ پھوار بڑھی۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ ساری خوفناک آوازیں ایک لمبی سی سکلی میں سائیں سائیں کرنے لگیں۔ ہولے ہولے یہ سائیں سائیں بھی فضائیں تحلیل ہوتی گئیں اور اس کی آواز چھبوں سے گزرنے والی بوندوں کی ٹپ ٹپ میں تبدیل ہو گئی۔ پھر یہاں کیک ایک ایک چھناناکا سا ہوا اور سارے ماحول پر تنائما سا چھا گیا۔ اس تنائی میں ایک اونچی سی تان، اُٹھی اور غٹ غٹ کر کے سارے کمرے میں بوقت کے پانی کی طرح بھر گئی۔ دھند اور غبار کا ایک ریلا سا آیا اور مکان کی اینٹ اینٹ سے بے حد خوش الحان قرأت میں اذان کی صدا آنے لگی۔ یہ اذان مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک پھیل گئی اور اس کی بلند آہنگی اور خوش الحانی سارے عالم پر ایک زر کار شامیانے کی طرح چھا گئی۔

کچھ عرصہ کے بعد ایک روز میں سری ہری کشن مہتاب کے پاس بیٹھا تھا۔ انہوں نے نہ کرو پوچھا۔ نایئے نئے مکان میں کسی بھوٹ پریت سے سابقہ تو نہیں پڑا؟

”بھوٹ پریت تو عورتوں اور بچوں پر زیادہ اُترتے ہیں۔“ میں نے مذاق میں بات ٹالنے کی کوشش کی۔ ”میں اکیلا رہتا ہوں میرے پاس بھلا وہ کیا کرنے آئیں گے۔“

”تعجب“ وزیر اعلیٰ نے کہا ”اس مکان میں جو روح آتی ہے وہ ایک جوان اور خوبصورت لڑکی کی ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ تم میں ضرور دچپی لے گی۔“

”وہ لڑکی کون تھی؟“ میں نے استجواباً پوچھا۔

ممتاز صاحب نے اپنی دودھ جیسی سفید کھدر کی ٹوپی سر سے اتار کر میز پر رکھ دی۔ ان کے چہرے پر کھانیاں سنانے والی بوڑھی دادیوں اور نانیوں والا مود طاری ہو گیا۔ وہ آلتی پالتی مار کر کرسی پر بیٹھ گئے اور بولے کوئی تیس برس قبل اس کوئی میں ایک انگریز افسر رہتا تھا۔ اس کے پاس ایک طرح دار آیا تھی۔ آیا کا نام سو شیلا تھا۔ سو شیلا بڑی خوبصورت اور خوش مزاج لڑکی تھی۔ اور خوب بن سنور کے رہا کرتی تھی۔ انگریز افسر کا دل سو شیلا پر بُری طرح آگیا۔ اور اس نے شادی کا چکہ دے کر اس پری کو شیشے میں اتار لیا اور سو شیلا نے اس انگریز کو اپنا دیوتا سمجھ کر اس کی خوب خدمت کی۔ ایک روز جب اس نے شریملی دلوں کی طرح یہ راز انشا کیا کہ وہ عنقریب ہی ماں بننے والی ہے، تو صاحب بہادر کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس نے راتوں رات سو شیلا کا گلا گھونٹ کر اسے مار ڈالا جب سو شیلا کا گلا گھونٹا جا رہا تھا تو عین اسی وقت اس کے بطن سے ایک مردہ بچی پیدا ہوئی۔ انگریز افسر نے ان دونوں لاشوں کو اسی کوٹھڑی کے کسی کونے میں دبا دیا۔ کہتے ہیں کہ اس روز سے بچاری سو شیلا کی روح اپنی بچی کی لاش اٹھائے اس کوئی میں بھٹک رہی ہے۔“

”اس انگریز افسر کا کیا بنا؟“ میں نے پوچھا۔

وہ زمانہ خالص انگریزی راج کا تھا۔ ”ممتاز صاحب نے ایک ممتاز کانگریسی لیڈر کی تلمذی سے کہا ”وہ افسر اس کٹک کا کمشنز بھی بنا۔ اسے بہت سے خطابات بھی ملے اور ولایت میں وہ آج بھی بڑی شان سے زندہ ہے۔“

اقبال کی فریاد

آزادی سے قبل تو خیر دوسری بات تھی۔ لیکن اب اللہ کے فضل و کرم سے آپ کو پاکستان مل گیا ہے تو اب ذرا مجھے بھی دم لینے دیجئے۔ شکایت کرنا تو مومن کی شان کے خلاف ہے۔ لیکن جس بے دردی سے آپ میرا پیچھا فرمائے ہیں۔ اس میں میرے اور میری شاعری دونوں کے لیے بڑی عبرت کی نشانیاں ہیں۔

جلے جلوس میں گڑ بڑ کا احتمال ہو تو اس کی روک تھام کے لیے اقبال کا شعر۔ دھوواں دھار تقریر میں سانس پھولنے لگے تو دم لینے کے لیے اقبال کا شعر۔ رسالوں میں بچی کچی جگہ پر کرنے کے لیے اقبال کا شعر۔ ریڈیو میں فالتو لمحات گزارنے کے لیے اقبال کا شعر۔ گرمی گفتار ہو یا گالی گلوچ، نصیحت ہو یا نصیحت، وقت بے وقت، جگہ بے جگہ میرے غریب اشعار کا حلیہ بُری طرح بگاڑا جاتا ہے۔ خوشامد اور چاپلوسی ہو تو طاڑلا ہوتی کا بیان ہوتا ہے۔ فرعونیت میں اسرار خودی فاش کئے جاتے ہیں۔ شراب اور رباب میں رموز بے خودی کی تلاش ہوتی ہے۔ چندے کے وقت شاہین بچوں کے بال پر اچھائے جاتے ہیں۔ چور بازاروں میں دہقان کی روزی اور خوشہ گندم کی داستان چلتی ہے۔ دن کے وقت تقدیرِ ام اور شمشیر و سنان کے نعرے بلند ہوتے ہیں۔ رات کے وقت طاؤس و رباب کی باری آتی ہے۔ یہ بھی نعیمت ہے کہ آہِ سحر میرے لیے تیر کا چھوڑ دی جاتی ہے۔ اور اللہ کا نام ساقی کے پرد ہوتا ہے۔ ورنہ خدا جانے ان دو زمینوں میں بھی کیا کیا گل کھلانے جاتے۔ سینما والے اپنے اشتہاروں میں ”ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ“ کی تلقین فرماتے ہیں۔ ایک آملہ ہیر آئیل والے نے تیل کی بو تکوں پر ”گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر“ کے لیبل چسپاں کر رکھے ہیں۔ ایک خاندانی حکیم صاحب اپنی مقویات

اور خیرے کے سرموں کی بدولت میرا عشق میری نظر بخش دینے کے دعویدار ہیں ایکشنوں میں خاص طور پر میرے قلب و نظر اور عشق و خرد کا بے دریغ استعمال ہوتا ہے اور رفاه عام کی بہت سی انجمنیں قبر کے کتبوں کے لیے میرے اشعار بلا معاوضہ منتخب کرنے کے لیے ہمیشہ کمربستہ رہتی ہیں۔ ان کے علاوہ میرے خاص کرم فرماؤں میں قولوں اور ریڈیو والوں کا درجہ بہت بلند ہے۔ اگر ان اصحاب کی کوششیں بار آور ہوئیں تو عجب نہیں کہ بہت جلد میرے کلام کو پاکستان سے ہجرت کی سعادت نصیب ہو جائے۔ یہ وہ سنت نبوی ہے جو میں جیتنے جی خود نہ بھاسکا۔ لیکن اگر میرے پرستار کی اعانت سے میرے کام کو یہ درجہ اب مل سکتا ہے تو زہ نصیب۔ دراصل یہ تو یہ ہے کہ فی زمانہ آپ میری شاعری میں کچھ اس طرح الجھ گئے ہیں کہ نہ جائے رفتہ نہ پائے ماندن۔ ایک فیشن ہے چھوڑیے تو مشکل نہ چھوڑیے تو مشکل۔ لیکن اگر قولوں اور ریڈیو والوں کی برکت سے میرا کلام اُٹھ گیا تو ہم خدا ہم ثواب والی بات ہو گی۔ یعنی بیٹھائے بھائے مفت میں آپ کا پیچھا بھی چھٹ جائے گا اور مجھے بھی کچھ دم لینے کی مملت نصیب ہو گی۔

قولوں کا دستور تھا کہ وہ عموماً فارسی پر اپنی نظر عنایت رکھتے تھے۔ اردو میں ان کا زور نظیر اکبر آبادی کے خمسوں اور حالتی کے مسدس کے علاوہ اور کسی چیز پر زیادہ نہیں چلا۔ لیکن جوں ہی اس فقیر سے شاعری کا گناہ سرزد ہوا ان کی ساری توجہ ایک طوفان کی طرح میری طرف اُٹھ آئی۔ اب یہ حالت ہے کہ ”شکوہ اور جواب شکوہ“ کے علاوہ میری دوسری معصوم نظموں کو بھی ”سر، تال،“ تلفظ اور گلے کے ایسے پچ و خم میں سے گزارا جاتا ہے کہ ان کی صورت منخ ہو کر کچھ سے کچھ بن جاتی ہے۔ یوں تو قولیاں عام طور پر اولیائے کرام کے مزاروں پر ہوتی ہیں۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ مجھے درجہ ولایت عطا نہیں ہوا۔ اس لیے اس فقیر کی قبر قولوں کی دسترس سے محفوظ ہے۔ لیکن اب یہ نیا گل کھلا کر قبر کی جگہ اس غریب کے نام پر قولیوں کا دستور زور پکڑنے لگا ہے۔ چنانچہ جب شادی بیاہ یا چھلم کی رسوم کا بہانہ نہ ہو تو پُر ٹکف دعوتوں کے بعد محض شوقیہ ”اقبال کی قولیوں“ سے جی بھلایا جاتا ہے۔ اُمید تھی کہ شاید مشاعرے اس رسم کو توڑنے میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن مملکت خداداد میں قولوں کی تعداد کسی عنوان شاعزوں سے کم نہیں ہے۔ اس لیے یہ دونوں مشاغل یکساں رفتار سے جاری ہیں۔

خدا کے فضل سے قواليوں اور ریڈیو میں کچھ ایسا چولی دامن کا ساتھ ہے کہ جب کہیں قوالی ہو رہی ہو تو ریڈیو کا گمان ہوتا ہے اور ریڈیو چل رہا ہو تو قوالی کا رنگ جم جاتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ریڈیو والوں نے میری عزت افزائی کے لیے اور بہت سے طریقے آیجاد کر رکھے ہیں۔ فلمی گانوں کا فرمائش پروگرام وقت مقررہ سے ایک آدھ منٹ پہلے ختم ہو جائے تو عموماً ”اقبال کا ایک شعر“ کام آتا ہے۔ اگر عین موقع پر کوئی مقرر حاضرنہ ہو سکے تو تقریر کا موضوع خواہ ”کیمیائی کھاد“ ہو یا ”پاکستانی کھالیں“ اس کی جگہ بڑی بے تکلفی سے ”اقبال سے ایک ملاقات“ یا ”اقبال کا فلسفہ خودی“ رکھ دیا جاتا ہے۔ کیونکہ آپ کی دنیا میں اقبال کے ملاقاتیوں کی تعداد کچھ کم نہیں ہے۔ بلکہ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے، ان کی تعداد میں کچھ اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ اور خدا کے فضل سے میرے فلسفہ خودی کے ماہرین کا فیض بھی بڑا عام ہے۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ ادھر یہ تقریں شروع ہوئیں، ادھر ریڈیو کے شائیقین نے سوئی گھما کر دوسرے اسٹیشنوں کی راہ لی۔ اللہ اللہ ایک زمانہ تھا کہ میرا کلام سننے کے لیے لوگ عید کے چاند کی طرح انتظار کرتے تھے۔ انہم حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسے مجھے ابھی تک یاد ہیں اور میں قیامت تک جامع مسجد لاہور کا وہ سماں بھی نہیں بھول سکتا جب نماز جمعہ کے بعد میں نے حضور رسلت مآب میں جنگ طرابلس والی نظم پڑھی تھی۔ آپ کو غالباً یاد ہو گا کہ ایک بار میں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجاکی تھی کہ میرا نور بصیرت عام کر دے۔ شاید یہ اسی دعا کا اثر ہے کہ اب کراچی ہو ڈھاکہ، لاہور ہو یا پشاور صبح ہو یا شام ریڈیو کا ٹھنڈن دبائیے، کسی نے کسی جگہ سے ہر وقت اقبال کا کلام نشر ہو رہا ہے۔ کہیں گلدستہ بائی ہے کہیں سلطان جان یادا نم علی یا حاتم خان ہے کہیں شرافت علی، ٹرافت علی اور ان کے ہمنوا ہیں۔ کبھی یہ گمان گزرتا ہے کہ درویشوں کی ٹولی گا گا کر بھیک مانگ رہی ہے۔ کبھی رونے کی رسیسل کا شہر ہوتا ہے۔ کبھی مرہی خوانی کا سماں بندھتا ہے۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ اکثر لوگ اقبال کے کلام کا اعلان سنتے ہی ریڈیو کی سوئی گھما دیتے ہیں۔ ورنہ جس نے ایک بار دل لگا کر ان را گنیوں کو سنا وہ ہمیشہ کے لیے ان نظموں کو کتابی صورت میں پڑھنے سے بھی بیزار ہو گیا۔

اکثر اشتہار بازوں، قوالوں اور ریڈیو والوں کی مساعی جیلیہ کے باوجود خدا نخواستہ میرے نام یا کلام یا کلام کا کچھ حصہ سلامت بچ گیا تو رہی سی کسر نکالنے کے لیے بزرگوں

کی ایک جماعت بھی خدمت کے لیے تیار ہے۔ یہ وہ بزرگ ہیں جو میرے ہم نوالہ اور ہم پیالہ تھے، جن کی صحت میں میں نے گناہ و ثواب، عقل و عشق، خودی و بے خودی کی بے شمار منزلیں طے کی تھیں اور جن کے سینے میں ابھی تک میرے غیر مطبوعہ اشعار کے گنجائے گرائے مایہ محفوظ ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان میں سے اکثر حضرات ایسے ہیں جن سے اس خاکسار کو کبھی ملاقات کا شرف بھی حاصل نہ ہوا تھا۔ لیکن اب جس وثوق سے میری زندگی کے راز ہائے سرستہ فاش کرنے میں مشغول ہیں اسے دیکھ کر بھی تو مجھے اپنے متعلق شبہ ہونے لگتا ہے۔ بچارے منکر نکیر الگ پریشان ہیں کہ یہ کیا شخص تھا جس کے اعمال خود ہماری نظر سے پوشیدہ رہے۔ چنانچہ اب یہ معمول ہو گیا ہے کہ کسی صاحب نے گفتگو کا یوں آغاز کیا کہ ”ایک روز جب میں حضرت علامہ مرحوم کی خدمت میں حاضر تھا۔ اس گنگا رکے اعمال نامے کی از سر نو جانچ پڑتا ہوئے گئی۔ پہلے مرزا غالب بھی بہت ناراض تھے کہ یہ دنیا والے بڑے بے حیا ہیں۔ ان کے ذاتی اور بخوبی خطوط تک کو اٹھا کر چھاپ ڈالا۔ لیکن جب میں نے اپنے خطوط کا حشران سے گوش گزار کیا تو وہ مسکرائے اور فرمائے لگے ”میاں اقبالِ غم نہ کرو، یہ بڑے دل گردے والی اُمت ہے جس نے اللہ کے رسول پر بھی بے شمار اللہ سید می حدیثیں ایجاد کرنے سے پہیز نہیں کیا“ وہ بھلا تمہارے جیسے خاکپائے رسول کو کہاں چھوڑتی۔ ہائے حقیقت خرافات میں کھو گئی۔ یہ اُمت روایات میں کھو گئی۔“

اب رہا اقبال ڈے کا معاملہ۔ یہ رسم میری زندگی ہی میں شروع ہو گئی تھی لیکن اب میں دیکھتا ہوں کہ زمانے کے انداز بدل گئے۔ اقبال ڈے پر بیچارے اقبال کے سوا ہر چیز کا خوب اہتمام کیا ہوتا ہے۔ سیاست دانوں، طالب علموں، ادیبوں اور تاجریوں کی ہر پارٹی اپنی اپنی پالی الگ جاتی ہے۔ سیاست دان دھواد دار تقریبیں کرتے ہیں کہ سند رہیں اور بوقت انتخاب کام آئیں۔ طالب علم امتحانات ملتوي کرنے پر زور دیتے ہیں۔ ادیب ایک دوسرے کی گپڑی اچھائی کا مشغله سنبھالتے ہیں اور تاجر لوگ امپورٹ ایکسپورٹ لائنسوں کی مشکلات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ سرکاری درباروں میں بڑے ٹھٹے کے انتظامات ہوتے ہیں اور افرگنی صوفیوں اور ایرانی قائلیوں پر مخلفیں منعقد ہوتی ہیں۔ غرباً پارکوں اور باغخوازوں میں جلسے منعقد کرتے ہیں۔ کھانے پینے کے شوقین ٹی پارٹیاں

رچاتے ہیں۔ کہیں کہیں مشاعرہ بھی ہوتا ہے اور میرے دیرینہ کرم فرمائیو والوں کے
دم قدم سے لظم خوانی اور قولیوں کا رنگ بھی خوب جاتا ہے۔ اگر گماگھی میں فی سبیل
اللہ کچھ توجہ میری طرف بھی منعطف ہوتی ہے تو کبھی محمود کا اقبال سامنے آتا ہے۔ کبھی
ایاز کا کبھی بندے کا اقبال ظاہر ہوتا ہے۔ کبھی بندہ نواز کا۔ لیکن یچارے مومن کے اقبال
کو کوئی نہیں پوچھتا۔ کہ جس کے لیے میرے دیدہ ترکی بے خوابیاں، میرے دل کی پوشیدہ
بے تابیاں۔ میرے نالہ نیم شب کا نیاز میری خلوت و انجمن کا گداز، اُمتنیں، میری
آرزوں میں، میری اُمیدیں، میری جستجوں میں ہمیشہ بے قرار رہتی تھیں۔

اگرچہ عالم بالا میں اقبال ڈے منانے کا رواج نہیں۔ لیکن رضوان کی مریانی سے
اس روز ہم سب کو چھٹی ضرور عطا ہوتی ہے۔ معلوم نہیں آپ کے ہاں کیا دستور ہے؟“

آثار قدیمہ

آج سے کوئی ایک ہزار سال کے بعد جب دُنیا میں ایتم یعنی ذرہ عظیم کا دور دورہ ہو گا۔ اور ماہرین آثار قدیمہ بیسویں صدی کے متعلق چھان بین کریں گے تو امید ہے کہ ان کے تاثرات کچھ مندرجہ ذیل قسم کے ہوں گے۔

اویب:

کچھ کھوپڑیاں ایسی ملی ہیں جن سے اس نظریے کی وضاحت ہوتی ہے کہ اس زمانے میں ایک قوم بنام اویب بھی آباد تھی۔ کھوپڑیوں کی مدد سے اس قوم کے متعلق صحیح معلومات بہم پہنچانا مشکل امر ہے کیونکہ کچھ کھوپڑیاں اٹھی ہیں اور کچھ سیدھی۔ البتہ دیگر مثالوں کی بنا پر اس کے بہت سے کوائف تحقیق ہو چکے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسل کنی شاخوں میں بھی ہوئی تھی۔ شاعر، افسانہ نویس، نقاد، مقالہ نگار، یہ چار بڑی شاخیں تھیں۔ ان میں بہت سے فرقوں کا اپنا اپنا الگ الگ مسلک تھا۔ ترقی پسند، غزل گو، بے قافیہ و بے ردیف، بے سروپا۔ بہم وغیرہ وغیرہ۔ آپس میں جو تی ہزار کے علاوہ ان کا دوسرا محبوب مشغله عورت تھی۔ جیسا کہ ہم کسی اور جگہ بیان کر چکے ہیں۔ ایام جہالت میں عورت ایک مشہور مخلوق تھی۔ اسے جنسِ لطیف کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا لیکن اس کا اصل مقصد نسل انسانی کی بقا کا کام تھا۔ یہ کام آج کل ہماری حکومت میں ایسی شعاعوں سے لیا جاتا ہے۔

نسل انسانی کی بقا کے علاوہ عورت کو اور بھی بہت سی باتوں کی لست تھی مثلاً شاعروں، افسانہ نویسوں اور مصوروں پر سوار ہونا۔ اس زمانے کا ایک شعر ہے۔

ہند کے شاعر صورت گر و افسانہ نویس

آہ بے چاروں کے اعصاب پر عورت ہے سوار
ایک دوسرے بیان کے مطابق معاملہ اس کے بر عکس تھا۔ لیکن اس بیان کی ابھی
تک تصدیق نہیں ہو سکی۔

ادبیوں پر سوار ہونے کے علاوہ عورت نامی صنف کا ایک اور مشغله حسن تھا یہ
معلوم نہیں کہ اس مشغله کی اصلی نوعیت کیا تھی۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ حسن کا
عشق سے گرا لگا تھا۔ جیسا کہ آپ امراض دیوانگی کے سلسلہ میں سن چکے ہیں۔ عشق
ایک خطرناک متعددی مرض تھا جو دل میں فساد خون اور دماغ میں خلل کی وجہ سے پیدا
ہوتا تھا۔ اس زمانے کے انسانوں میں دل سینے کے باہمیں طرف گوشت کے ایک لوٹھڑے
کا نام تھا جہاں اب ہم نے بر قی ڈائٹ نمو لگائے ہوئے ہیں اور دماغ کی جائے وقوع کھوپڑی
کے نیچے تھی، جہاں اب ضرورت کے لحاظ سے مختلف کینڈل پاور کے قلمیے آوریزاں کیے
جاتے ہیں۔ قیاس ہے کہ جس طرح چوہوں سے پلیگ اور مکھیوں سے ہیضے کے جرا شیم
پھیلتے تھے۔ اسی طرح عورت سے عشق کی وبا پھوٹی تھی۔ چونکہ قومِ ادیب عورت کی پیرو
تھی اس لیے یہ مرض اس قوم میں بڑی شدت سے پایا جاتا تھا۔

اس قوم کے دو مشہور فرقوں یعنی رجعت پندوں اور ترقی پندوں کے بہت سے
حالات دستیاب ہو چکے ہیں۔ رجعت پندوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ہنرنے سے زیادہ
روئے سونے سے زیادہ جانے اور مکانوں کی جگہ سایہ دیوار کے شوقین تھے۔ تارے گناہ
ان کا محبوب مشغله تھا۔ گلیوں میں دو ناگلوں کی بجائے سر کے بل چلتے تھے۔ اور قالینوں
کی جگہ آنکھیں بچھانے کے عادی تھے۔ کپڑے وہ کبھی پہننے تھے، کبھی چھاڑ دالتے تھے۔ اور
ان کی خوراک میں دل، جگر، خون، زہر، شراب، شربت اور انواع و اقسام کی گالیاں شامل
تھیں۔

اس کے بر عکس ترقی پند نہ ہنتے تھے، نہ روتے تھے، نہ جاگتے تھے، نہ
کھاتے نہ پینتے تھے۔ البتہ ان میں لکھنے کا بہت شوق تھا۔ لیکن یہ تحقیق نہیں ہو سکا کہ وہ
کیا لکھتے تھے۔ یہ بات وہ خود بھی نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ اسی وجہ سے انھیں ترقی پند کما
جاتا تھا۔ اس لحاظ سے ان کا وجود ارتقاء انسانی میں ایک اہم سنگ میل کا درجہ رکھتا
ہے۔ ان کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے پہلی مرتبہ دل و دماغ، عقل و فہم، ہوش و

حوالہ کے بت توڑا لے اور انسان کے ذہن کو روایتی قیود سے آزاد کیا۔

رجعت پسندوں اور ترقی پسندوں میں صرف ایک مشاہدہ تھی۔ وہ یہ کہ دونوں ایک دوسرے کو اُٹا دیکھتے تھے۔ رجعت پسندوں کا دعویٰ تھا کہ ترقی پسند سیدھے نہیں اُوندھے ہیں۔ اور ترقی پسند رجعت پسندوں کے متعلق یہی نظریہ رکھتے تھے۔ یہ معلوم نہیں ہوا کہ دونوں میں سے کس کا دعویٰ صحیح تھا۔ لیکن قیاس ہے کہ دونوں میں بہت سے لوگ سیدھے تھے، اور بہت سے اُوندھے۔

ایڈیٹر:

بیسویں صدی کے حشرات الارض میں اخبارات کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ کیونکہ ان کا کافی پانی تک نہ مانگتا تھا۔ اخباروں کو کائیں کا مرض ہی نہیں بلکہ جنون تھا جو تو یہ ہے کہ ان کی زندگی کا دارود اس فن پر تھا۔

جس طرح سانپ پالنے والے کو سپرا اور ریچھ والے کو قلندر کہا جاتا تھا۔ اسی طرح اخبار والے کو ایڈیٹر کہتے تھے۔ ایڈیٹر کا کام یہ تھا کہ وہ موسم کے مطابق اخبارات کو پال پوس کرتیار رکھتا تھا تاکہ وقت آنے پر وہ کائیں کے فرائض بطريقِ احسن سرانجام دے سکیں۔ اس عمل میں کبھی کبھی ایڈیٹر خود بھی کٹ جاتے تھے لیکن جس طرح نیولے کو سانپ کے زہر کے متعلق جڑی بوئیوں کا علم تھا۔ اسی طرح ایڈیٹروں کے پاس بھی اخبار کے کائیں کا منتر موجود تھا۔ چنانچہ وہ خود اس زہر سے کبھی نہیں مرتے تھے۔ ایڈیٹر کو کبوتروں کی طرح اخباروں کی خبر سانی کے لیے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ کبوتروں جو پیغام لے کر اڑتے تھے اسے من و عن منزل مقصود تک پہنچادیتے تھے۔ لیکن اخباروں کو رائی کا پرست اور سوئی کا بحالا بنانے میں کمال کی مهارت حاصل تھی۔

اخباروں کی خوراک گپ تھی۔ اور ایڈیٹر لوگ گز بڑ پر گزارہ کرتے تھے۔ یہ خوراکیں ایامِ جہالت میں کثرت سے کاشت کی جاتی تھیں۔ لیکن جب سے ایسی شعاعوں نے کرۂ ارض کو منور کیا ہے، اخباروں اور ایڈیٹروں کے ساتھ ساتھ گپ اور گز بڑ بھی ناپید ہو گئی ہے۔ بہت سی جستجو کے بعد اب تک ہمیں صرف دو ایڈیٹروں کے ڈھانچے ملے ہیں۔ ان میں یہ خصوصیت ہے کہ اگر انہیں پاس پاس رکھا جائے تو فوراً ایک دوسرے کی طرف پینچھے موڑ لیتے ہیں۔ اور اگر انہیں ایک دوسرے سے دور رکھا جائے تو وہ آپس میں

سر جوڑ کر بیٹھنے کی کوشش فرماتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے یہ لوگ آپس میں ہستے بولتے تھے تو بھی اتفاق رائے سے۔ اس لحاظ سے ان کا شمار بھی ترقی پسندوں میں ہونا چاہیے۔ ادیبوں اور ایڈیٹریوں میں چوپی دامن کا ساتھ تھا۔ جب ادیبوں کی صورت مسخ ہونے لگتی تھی تو وہ ایڈیٹر بن بیٹھتے تھے اور جب ایڈیٹریوں کے چہرے گزتے تھے تو وہ ادیب کہلاتے تھے۔

سیاست دان:

پہلے یہ خیال تھا کہ سیاست دان شاید اگالدان کی قسم کا کوئی طرف ہو گا۔ لیکن اب یہ خیال غلط ثابت ہو چکا ہے۔ دراصل وہ ساربان، کوچوان اور پہلوان کے زمرہ میں شامل تھے۔ جس طرح ساربان اور کوچوان اونٹ، گھوڑے، گدھے یا نچر کی نکیل تھامتے تھے۔ اسی طرح سیاست دان عوام کی لگام اپنے ہاتھ میں رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس کے علاوہ پہلوانوں کی طرح دنگل فرمانا بھی آپ کا شیوه تھا۔ گھوڑوڑ کی طرح سیاست دانوں کی دوڑ بھی ایک دلچسپ تماشہ ہوا کرتی تھی۔ یہ بات نہیں کہ خدا نخواستہ سیاست دان خود دوڑ لگاتے تھے، بلکہ وہ تو بس عوام کو دوڑانے پر ہی اکتفا کرتے تھے۔ ہاں البتہ دنگلوں میں وہ خود بہ نفس نیس اکھاڑوں میں اتراتے تھے اور بڑے گھسان کارن پڑتا تھا۔ کبھی قوم سیاست دان کی گردن پر اور کبھی سیاست دان قوم کی گردن پر۔ دوٹ ایک قسم کا ہتھیار تھا، جو ایسے موقعوں پر استعمال کیا جاتا تھا۔ دوٹ کی ساخت غالباً اس بوٹ کی ہی تھی جو اس زمانے میں پاؤں میں پہنا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی دنگلوں میں یہ دونوں یکساں چلتے تھے۔

سیاست دانوں کا ایک اور مشغله بیان بازی تھا۔ یہ اصل میں پنگ بازی، بیشرازی کی قسم کا ایک فن تھا، جس میں کبھی کبھی باتوں ہی باتوں اور کھیل ہی کھیل میں ہاتھا پائی تک نوٹ آ جاتی تھی اور بڑے زوروں کی سر پھٹوں ہوا کرتی تھی۔ جس وقت سیاست دان دنگا فساد میں مصروف نہ ہوں تو وہ سر را ہے کچڑا اور گپڑیاں اچھال کر اپنا جی بھلایا کرتے تھے۔

سیاست دان فکر معاش سے آزاد ہوتے تھے۔ بنی اسرائیل کے بعد یہی ایک قوم تھی جس پر آسمان سے من و سلوٹ نازل ہوتا تھا۔

اگرچہ آج کل یہ نسل ناپید ہے لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ اس قوم کے چند بزرگ کسی طرح فرار ہو کر یا جو ج ماجون کی بستی میں روپوش ہو گئے ہیں۔ وہاں پھر انہوں نے ایک تازہ دستور اساسی مرتب کیا ہے۔ جس کے مطابق وہ میدانِ حشر میں ایک جزل ایکشن لڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اے بنی اسرائیل

تیرے روز صبح سویرے ہی بیروت کا ساحل نظر آنے لگا۔

عرب طالب علم دوڑ دوڑ کر سب سے اوپر والے عرش پر چڑھ گئے اور بڑی خوش الحانی سے اپنے قومی ترانے گانے لگے۔ فرانسیسی نرسوں کو خاص طور پر یہ گیت پسند آئے۔ غالباً وہ مجھ سے بھی پاکستان کا قومی ترانہ سننے کی فرمائش کرنا چاہتی تھی۔ لیکن میں ان کا ارادہ بھانپ کر ادھر ادھر کھٹک گیا۔ کیونکہ اپنے قومی ترانے کے الفاظ اگر مجھے یاد تھے تو دھن بھانا میرے بس کی بات نہ تھی۔

جب جہاز بند رگاہ میں داخل ہوا تو سب سے پہلے جو چیز نظر آئی وہ لوگوں کا ہجوم تھا جو ساحل پر کھڑے کھڑے زور سے چین رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں اور گردنوں کے خمکیں اشارے ان کی آواز کا برابر ساتھ دے رہے تھے۔ دور سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ بلوہ ہو رہا ہے۔ نزدیک پہنچ تو گمان ہونے لگا کہ وہ لوگ جملہ جہاز والوں کو غصتے میں گالیاں دے رہے ہیں۔ کچھ دری کے بعد راز کھلا کر یہ لوگ بند رگاہ کے قلی ہیں۔ اور آنے والے مسافروں کو اپنی خدمات پیش کر رہے ہیں۔

ساحل پر جا بجا سُرخ ٹوبیاں نظر آتی تھیں جن پر تیل کی چکنائی اور میل نمایاں تھی۔ کپڑے بھی میلے کچلیے اور پھٹے پرانے تھے۔ شور و غل۔ ریل پیل، حکم دھکا عام تھی۔ اس دشت کو دیکھ کر بے ساختہ گھر کی یاد آتی تھی۔ پولیس کے سپاہی غیر معمولی طور پر موٹے تھے اور گرمی کی وجہ سے اپنی وردیوں سے بیزار۔ یہ سپاہی زیادہ تر ٹھیلوں یا کھبوں کا سارا لیے اونگھے رہے تھے۔ جب بھی آنکھ کھلی تو یوں ہی کسی کو دھکا دے کر کسی کو ڈانٹ ڈپٹ کر اپنے منصبی فرائض سے عمدہ برآ ہو رہے تھے۔

یہاں رومن کیتھولک پادریوں کی منزل آگئی تھی اور وہ اپنا سامان اتر واکر بادل نخواستہ فرانسیسی نرسوں سے رخصت ہو رہے تھے۔ پہلے انھوں نے نرسوں کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دیر تک انھیں سملایا۔ پھر بڑی بے صبری سے چٹا خ چٹا خ الوداعی بو سے لیے۔۔۔ اگر دوسرے مسافروں اور قلیوں کی نگاہیں بُری طرح ان پر نہ جمی ہوتیں تو یہ بزرگ نرسوں کو اپنے مقدس سینوں سے ضرور چھٹا لیتے۔

پادریوں نے طوعاً و کہاً جہاز چھوڑا اور کشم ہاؤس کے دروازے تک جاتے جاتے کئی بار فرانسیسی نرسوں کی طرف مژمڑ کر دیکھا۔ جواب اپنے ہینڈ بیگ کھول کر اپنے رخساروں کے پاؤڑ اور ہونٹوں کی لپ اسٹک کو از سرنوتا زہ کرنے میں مشغول ہو گئی تھیں۔ بو سے مقدس ہستیوں کے ہوں یا گنگا روں کے، عورتوں کے پاؤڑ اور لپک اسٹک پر ان کا اثر ایک سا ہی ہوتا ہے۔

یہاں جہاز کو چند گھنٹوں کے لیے رکنا تھا۔ مسافروں کو بیروت کا شرکھانے کے لیے ایک ٹورسٹ ایجنسی نے بہت سی ٹیکسیوں کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ جیسی شاندار ٹیکسیاں یہاں نظر آ رہی تھیں، ویسی موڑ کاریں غالباً یورپ کے بڑے شروں کو بھی کم ہی نصیب ہوتی ہوں گی۔ فورڈ شیور اور پیک کے ماڈل عام تھے۔ کہیں کہیں کیدھی لک کاریں بھی ٹیکسیوں کے طور پر چلتی نظر آتی تھیں۔ امریکہ کے بڑے بڑے شروں کے بعد غالباً بیروت ہی ایسا شرہ ہے جس کی سڑکوں پر بیک وقت اس قدر نئی امریکی گاڑیاں چلتی ہیں۔

یوں بھی بیروت کے چہرے مرے پر کئی قسم کا بین الاقوامی رنگ و روغن چڑھا ہوا ہے۔ زبان اور آداب میں یہ شر فرانسیسی ہے۔ موڑوں کے ماڈل، بو شرلوں کے ڈیزائن اور یونیورسٹیوں کی ڈگریوں کے لحاظ سے امریکن ہے۔ ہوٹلوں کے کاروبار اور پُر فضا پہاڑی مقامات کی نسبت نہ صرف بیروت بلکہ سارا لبنان مشرق وسطیٰ کا سو شرکر لینڈ ہے اور جیسا کہ میرے ایک لبنانی دوست مصطفیٰ الحسینی نے مجھے ہالینڈ میں بتایا تھا بیروت کی نشاط گاہوں اور نائٹ کلبوں کو پیرس کی ہمسری کا بجا طور پر دعویٰ ہے۔ چنانچہ بہت سے عرب شہزادے، جو اپنے ملک یا اپنے محلات میں شراب پینے سے محفوظ ہیں۔ اپنے پرائیویٹ جہازوں میں جو ترقی و رجوق یہاں آتے ہیں اور راتوں رات دادِ عیش دے کر صبح سوریے اپنے فرائض منصبی پر واپس حاضر ہو جاتے ہیں۔ میری ٹیکسی کے ڈرائیور نے

بڑے فخر کے ساتھ مجھے وہ ہوئی بھی دکھایا جس پر مصر کے سابق شاہ فاروق کی محبوب رقصہ سمیع جمال ٹھہری ہوئی تھی۔ ہوئی کے دروازے پر سمیع جمال کی بڑی تصویر آؤ زد اتھی۔ تصویر میں اس کے کھلے بال گھنگھور گھٹا کی طرح نظر آتے تھے۔ اور وہ اپنی بڑی بڑی غزالی آنکھوں سے باہر چوک کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ جمال ایک پولیس کانٹیبل بڑی مستعدی سے ٹریفک کنٹرول کرنے میں مصروف تھا۔ میکسی ڈرائیور نے مجھے بڑے جذبے سے مطلع کیا کہ اس چوک میں ہر تیس منٹ کے بعد ایک حادثہ ہوتا ہے۔ غالباً یہ لمحہ بھی حادثے والا تیسواں منٹ تھا۔ کیونکہ اچانک ہماری میکسی نے پلے ایک راہ گیر اور پھر بہ نفسِ نفس خود چوک والے کانٹیبل کو اپنی زد میں لینے کی سرتوز کوشش کی۔ بے چارہ راہ گیر تو کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن ٹریفک کانٹیبل نے سیٹ بجا بجا کر ہمارا تعاقب کرنے کی تھوڑی بہت کوشش ضرور کی۔ لیکن میکسی ڈرائیور نے ایکسی لیٹر دبای کر رفتار اور بھی تیز کر دی اور ہم خطرناک پہاڑی موڑوں کو کسی خاص معجزے کی مدد سے طے کرتے ہوئے ٹریفک کانٹیبل اور سمیع جمال دونوں کی زد سے باہر نکل آئے۔ میکسی ڈرائیور نے معدورت کرتے ہوئے مجھے یقین دلایا کہ اس چوک میں ایسے حادثات کوئی خلافِ معمول چیز نہیں ہیں۔ سمیع جمال کی آنکھوں میں ایسا جادو ہے کہ راہ گیر ڈرائیور اور ٹریفک کانٹیبل سب بیک وقت اسی کی طرف دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان حالات میں اگر ٹریفک میں تصادم کے واقعات رونما نہ ہوں تو یہ انسان کی بڑی کور ذوقی ہو گی۔

بیروت کی سڑکوں پر حادثات کا ہونا کچھ سمیع جمال کی سحر کار آنکھوں ہی پر موقوف نہیں ہے۔ بلکہ ہم جماں کہیں بھی جاتے تھے مجھے یہی احساس ہوتا تھا کہ ہم مسلسل حادثے کی زد میں متعلق ہیں۔ کھلی سڑکوں اور گنجان گیوں میں میکسی ایک ہی رفتار سے بھاگتی جا رہی تھی اور اس کی سپینڈ پسپنٹیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے شاید ہی نیچے گرتی تھی۔

کوٹ پتلوں والے راہ گیروں کے درمیان تو میکسی بڑے اطمینان سے ہارن بجاتے ہوئے گزر جاتی۔ لیکن عباوں والوں کے درمیان ڈرائیور متذبذب ہو جاتا۔ ڈرائیور نے وضاحت کی، بولا:

”پتلوں والے راہ گیر کی ناگزینیں دور سے واضح طور پر نظر آ جاتی ہیں اور پتہ چل

جاتا ہے کہ وہ کدھر سے کدھر کو جا رہا ہے۔ اس کے برعکس عبا کے نیچے دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ راہ گیر آگے کی طرف جا رہا ہے یا پیچے کی طرف۔ ”مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ مغربی لباس کا یہ افادی پہلواب تک میری نظر سے پوشیدہ تھا۔

امریکن یونیورسٹی کے قریب ایک فیشن ایبل ریستوران کے سامنے تیکسی روک کر ڈرائیور نے مجھے ہدایت کی کہ کوئی خوش مذاق سیاح اس ریستوران میں بیٹر کا گلاس یا چائے کی پیالی نوش کیے بغیر بیروت سے واپس نہیں جاتا۔ اپنی سیاحت اور خوش مزاجی کی لاج رکھنے کے لیے میں نے بھی اندر جا کر چائے کا آرڈر دیا۔

ریستوران میں زیادہ تر لوگ غیر ملکی تھے اور غالباً وہ سب سیاح تھے اور اپنی تیکسیوں کے ڈرائیور کی ہدایات کے مطابق اپنی خوش مزاجی کی داد لینے آئے تھے۔ ایک نوجوان بیرے نے مجھے چائے لا کر دی۔ اس کی موچھیں باریک اور تیکھی تھیں۔ سفید وردی میں ملبوس وہ کسی جاسوسی ناول کا ہیرو دکھائی دیتا تھا، جو بھیں بدل کر کسی گھرے راز کی تلاش میں ہو ٹلوں کی ملازمت کر رہا ہو۔ چائے کا ٹرے کا ٹرے میز پر رکھ کر وہ میرے پاس مودب کھڑا ہو گیا۔ اور فرنچ نما انگریزی میں بولا۔ ”آپ کون ہیں؟“ ”میں پاکستانی ہوں۔“

”مرحباً! اُس نے اپنے ہاتھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”اور آپ؟“ میں اخلاقاً پوچھا۔

”الحمد لله کہ میں مسلمان ہوں۔“

بیرے کے اس بے ساختہ جواب نے مجھے چونکا دیا۔ عربوں کے متعلق مشہور ہے کہ وہ سب سے پہلے عرب ہوتے ہیں۔ پھر شامی یا لبنانی یا عراقي یا مصری ہوتے ہیں اور اس کے بعد مسلمان۔ لیکن تیکھی موچھوں والا یہ نوجوان بیرا نہ صرف سب سے پہلے مسلمان تھا بلکہ وہ اپنے مسلمان ہونے پر بغیر کسی حجاب کے خدا کا شکر بھی ادا کر رہا تھا۔

”مجھے بھی مسلمان ہونے کا فخر حاصل ہے۔“ میں نے کہا۔

”الحمد لله، الحمد لله!“ بیرے نے پھر خوشی سے اپنے ہاتھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا

”آپ نے اخوان المسلمين کا نام سننا ہے کیا؟“

”اخوان کو کون نہیں جانتا۔“ میں نے جواب دیا۔

”میں بھی اس تحریک کا ایک ادنی سا خادم ہوں۔“ بیرے نے فخر سے کہا۔ ”ہم ساری دنیا کے مسلمانوں کے بھائی اور خدمت گار ہیں۔

”کیا آپ پاکستان کی فارن سروس میں ہیں؟“ بیرے نے اچانک پوچھا۔

”جی نہیں۔“ میں نے کہا۔ — ”آپ کو یہ خیال کیوں آیا؟“

”مشرق و سطحی میں جو سیاح آتے ہیں وہ اکثر سفارت خانوں کے افر ہوتے ہیں یا وہ گرجوں کے پادری ہوتے ہیں، یا ان کا تعلق تیل کے چشمون سے ہوتا ہے۔“ بیرے کے چہرے پر غیر معمولی سنجیدگی آگئی۔ ”سفارت خانوں سے وہ ہماری حکومتوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ گرجوں کے ذریعے وہ ہمارے دین میں داخل دیتے ہیں اور تیل کے چشمون سے وہ ہمارے پیٹ کنٹرول کرتے ہیں۔ پھر اس نے نکھیوں سے ادھر ادھر دیکھا اور گردن جھکا کر سرگوشی میں کہنے لگا۔ ”ہم اخوان ایسے سیاحوں پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں۔“

باتوں ہی باتوں میں بیرے نے مجھے بتایا کہ اس ریستوران کا مالک ایک فلسطینی عیسائی ہے اور یہاں کام کرنے والا ہر بیرون اسے پانچ سے چھ پونڈ تک ہر ہفتہ تنخواہ دیتا ہے۔

”بیرون ریستوران کے مالک کو تنخواہ دیتا ہے؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”یہ تو الٹی بات ہوئی۔“

”یہاں یہ بات بالکل سیدھی ہے۔“ بیرے نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”ہمارا گزارہ محض گاہوں کی بخشش پر ہے۔ امریکن سیاح بہت زیادہ ہیں۔ وہ ہمیں اچھا ٹپ دیتے ہیں۔ اور ہمیں اپنی آمدی کا دسوال حصہ ریستوران کے مالک کی نذر کرنا پڑتا ہے۔“ چائے ختم کر کے میں نے بل طلب کیا۔

”آپ میرے مہمان ہیں۔ آپ کابل میں خود ادا کروں گا۔“ بیرے نے بڑے خلوص سے کہا۔

میرا دل چاہتا تھا کہ بیرے سے کوئی کب بل نہیں تو مجھ سے کم از کم ٹپ ہی قبول کر لے تاکہ ریستوران کے مالک کی تنخواہ میں کمی واقع نہ ہو۔ لیکن بیرے کی متاثر اور خلوص کے سامنے مجھے کچھ کہنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ وہ مجھے باہر ٹکسی تک چھوڑنے آیا۔

جب تیکسی روانہ ہوئی تو مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ میں ریستوران کے ایک بیرے سے نہیں، بلکہ دنیا کے ایک بہت بڑے مفکر سے مل کر آ رہا ہوں۔ اس نوجوان بیرے میں ایک اچھے مبلغ کی صداقت اور ایک سچے مومن کی فراست کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ایسے سادہ اور پرکشش کردار میں نے بہت کم دیکھے تھے۔

بیروت کے مضافات میں جا بجا چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں کی آبادیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان میں فلسطین کے عرب مہاجر رہتے تھے۔ مہاجر کراچی میں ہوں یا بیروت میں۔ ان کے جھونپڑوں پر وہی کثافت اور چھروں پر وہی فلاکت برستی ہے۔ جس طرح کراچی میں، یہاں مہاجر بستیوں کے درمیان بڑی سرعت سے سینٹ کی بڑی بڑی عمارتیں بلند ہو رہی ہیں۔ بالکل اسی طرح بیروت میں بھی فلسطینی مہاجروں کے ارد گرد بلند و بالا خوبصورت مکان تعمیر ہو رہے تھے اور چند امریکن سیاح جو ان جھونپڑیوں اور مکانوں کی تصویریں اتار رہے تھے، بڑی گرجوشی کے ساتھ عربوں کی سیاست پر بھی رائے زنی فرمائے تھے۔

”خدا کی قسم۔“ ایک سیاح کہہ رہا تھا۔ ”جس دن بھی ان جھونپڑے والوں نے اٹھ کر ان خوبصورت عمارتوں کو جلانا شروع کر دیا،“ تب سے مشرق و سطھی میں کیونزم کا غلبہ ہو جائے گا۔“

”بائی جو! تم میرے پالتو خرگوش کے بچوں سے بھی زیادہ کوتاہ اندیش ہو۔“ دوسرے سیاح نے اپنے ساتھی کو پیار سے گالی دی۔ ”کیونزم آگ لگنے کا انتظار نہیں کرتا کیونزم کا راستہ تو اسی روز ہموار ہو گیا تھا جب ان غلیظ جھونپڑوں کے درمیان ان معقول عمارتوں کی بنیاد رکھی گئی تھی۔“

”تم دونوں کُتیا کے بچے ہو۔“ تیسرے امریکن نے فیصلہ صادر کیا۔ ”جب تک یہاں اسلام کا جذبہ غالب رہے گا۔ کیونزم کے آنے یا نہ آنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔“ اسلام کا یہ کار آمد جذبہ کئی رنگ سے غالب آتا ہے — نزیمہ کے پاس جو سُگریٹ لا سُٹر تھا اس پر نقری حروف میں کلمہ طیبۃ لکھا ہوا تھا۔ بیروت، بغداد، دمشق اور قاہرہ میں ایسے سُگریٹ لا سُٹر جا بجا فروخت ہوتے ہیں۔ سفری ایجنسیاں اپنے ہدایت ناموں میں مشتبہ کرتی ہیں کہ مشرقی ممالک میں کچی سبزیاں سلااد اور ٹھماڑنہ کھائیے۔ کیونکہ ان

میں مملک جو اشیم ہوتے ہیں۔ اور کالے یا سفید رنگ کے چلتے پھرتے خیموں میں نہ جھا کئے، کیونکہ ان میں عورتیں ہوتی ہیں۔ جب تک مشقی عورت خود آنکھ نہ لڑائے اس سے آنکھ نہ ملائیے، کیونکہ اس سے ان کا نہ ہب بگز جاتا ہے۔

بندرگاہ کے قریب ایک کھلا میدان ٹاٹ اور ٹین اور چٹائیوں کے چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں سے کھچا کھج بھرا ہوا تھا۔ میدان کے چاروں طرف لوہے کے خاردار تار کھنپھنپھوئے تھے اور پولیس کے کچھ سپاہی پرے پر مامور تھے۔ میدان میں سینکڑوں مرد اور عورتیں بھیڑ بکریوں کی طرح محصور تھیں اور فضا میں دُور تک بول و برآز کی غفونت پھیلی ہوئی تھی۔ تمازِ آفتاب میں یہ سارا میدان انگیٹھی کی طرح دیکھ رہا تھا۔ کچھ ضعیف عورتیں ایک چادر کو پانی میں ترکر کے بار بار اپنے چڑوں پر مل رہی تھیں۔

ٹیکسی ڈرائیور نے بتایا کہ یہ لوگ فلسطین کے مهاجر نہیں ہیں بلکہ یہ میدان حajoں کا کمپ ہے جو حکومت نے خود اپنے خرچ سے قائم کر رکھا ہے۔ کئی کئی مہینوں تک دور دراز سے لوگ آ آ کر اس کمپ میں جمع ہوتے رہتے ہیں۔ جو خوش نصیب ہیں انہیں ہوائی یا سمندری جہاز میں جگہ مل جاتی ہے۔ باقی لوگ انتظار کر کے واپس چلے جاتے ہیں۔

ٹیکسی ڈرائیور کے اندازے کے مطابق (جو باقاعدہ اعداد و شمار پر مبنی تھا) کمپ میں ایسے لوگ بھی تھے جو دو دو تین تین چار چار سال سے بندرگاہ پر انتظار کرنے کے بعد بے نیلی مرام واپس جا رہے تھے۔ اگر علمائے کرام کراچی یا بیروت یا قاہرہ سے بھی واپس لوٹ جائے تو اسے ایک حج کا ثواب مل سکتا ہے۔

حاجی کمپ کے ایک گوشے میں نماز عصر کی جماعت ہو رہی تھی۔ باقی دنیاۓ اسلام کی طرح اس کمپ میں بھی حاجی زیادہ تھے اور نمازی کم۔ ایک بوڑھی عورت بڑے خضوع و خشوع سے سر بسجود تھی۔ اس کی چادر میلی تھی اور کرتے کا دامن پھٹا ہوا تھا۔ یوں اس سارے ماحول پر ایک ایسی المناک غربت اور صعوبت چھائی ہوئی تھی۔ یہاں پر انسان اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کے سوا اور کیا عرض کر سکتا ہے۔

”بے شک ہم تمہیں کچھ خوف اور بھوک سے اور مال و جان اور پھلوں کی کمی سے ضرور آزمائیں گے۔ صبر کرنے والوں پر جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ

ہم خدا ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جانے والے ہیں۔ ایسے لوگوں کو خوشخبری دے دو کہ ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے رحمتیں اور عنایتیں ہیں اور یہی لوگ ہمت والے ہیں۔“

بیروت کا شمار بھی دنیا کے ان مہذب شرود میں ہوتا ہے جہاں غریب ہونا تو کوئی جرم نہیں۔ البتہ بھیک مانگنا ضرور منع ہے۔ بند رگاہ کے باہر پولیس کا ایک سپاہی بید کی چھڑی گھما گھما کر بہت سے گداؤں کو منتشر کر رہا تھا جو آتے جاتے سیاحوں پر بھوکی چیلوں کی طرح جھپٹتے تھے۔ فلسطینی مهاجروں کا ایک خاندان سپاہی کی نظر بچا کر ایک کونے میں سما کھرا تھا۔ ظاہرا وہ دستِ سوال دراز نہیں کر رہے تھے۔ مگر ان کے چڑے اپنی زبان بے زبانی سے پکار پکار کر اپنی بھوک اور اپنی بے بسی ہی کی فریاد کر رہے تھے۔ اس خاندان میں ایک چھ یا سات سال کا لڑکا تھا۔ ایک نوسال کی لڑکی تھی۔ ان کی ماں ایک ادھوری بہار کی طرح، جسے وقت سے پہلے ہی خزان نے پامال کر دالا ہوا۔ وہ کبھی اپنے بچوں کی طرف دیکھتی۔ کبھی راہ گیروں کی طرف، اور کبھی اس سپاہی کی طرف جو بید کی چھڑی گھما گھما کر بھیگ منگوں کو بھگا رہا تھا۔ مجھے رکتے ہوئے دیکھ کر وہ لڑکا میری طرف بڑھا اور بڑی لجاجت سے پوچھنے لگا۔ ”کیا آپ ہماری تصویر کھینچتا چاہتے ہیں؟“

جس طرح کراچی کے فقیر دیا سلاٹی یا بوب پالش کا سارا لے کر بھیک ملتے ہیں۔ اسی طرح فلسطین کے مهاجر تصویریں کھینچوا کر بخشش کی فریاد کرتے ہیں۔ ان کے خوبصورت خدوخال تیکھے تیکھے نقش اور اداس آنکھیں سیاحوں کے لیے بڑی جاذب نظر ہوتی ہیں اور وہ ان کے فوٹو اتار کر فراخ دلی سے بخشش دیتے ہیں اور اس طرح اہل فلسطین پر اپنی ہمدردی، منصف مزاجی اور غیر جانبداری کی معرفت کر دیتے ہیں۔

تصویر کی فرماںش مُن کر میرا جی چاہا کہ بچے کو اٹھا کر گلے سے لگا لوں اور کہوں میرے معصوم فرشتے ابھی خدا نے وہ مصور پیدا ہی نہیں کیا جو تیری تصویر کا حق ادا کر سکے۔ تیرے کپڑے پھٹنے ہوئے ہیں۔ اس جھلکتی دھوپ میں تیرے پاؤں ننگے اور تیری سسی ہوئی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی بھی خشک ہو چکی ہے۔ وہ تیری ماں ہے جسے قدرت نے شباب کی منزل سے پہلے ہی بوڑھا کر دیا ہے۔ اس کے بھٹخے ہوئے ہونٹوں پر فریاد لرز رہی ہے۔ لیکن سپاہی کے ذر سے وہ اپنا منہ نہیں کھول سکی۔ یا شاید اس کے سوکھے

ہونٹوں پر ایک غصب ناک بد دعا تڑپ رہی ہے جو اس نے اس کے ڈر کے مارے روک رکھی ہے کہ کہیں اس کی بد دعا سے دنیا کا بھی وہی حشرناہ ہو جو عاد اور نوحؑ کی قوموں کا ہوا تھا۔ اور وہ تیری گھریا سی بہن جس نے ایک ہاتھ سے ماں کا دامن تھاما ہوا ہے اور وہ دوسرے ہاتھ پر تھیں واپس بلا رہی ہے تاکہ کوئی راہ گیر تمہیں زبردستی اٹھا کرنے لے جائے۔ اس نئی ملتی کے پاؤں بھی نگے ہیں۔ اس کے کپڑوں میں بھی سوراخ ہیں۔ اس کے شری بال ریشم کے اُنجھے ہوئے چکھوں کی طرح پریشان اور گھنگریا لے ہیں۔ ان خوبصورت بالوں میں رست کے ذرے ابرک کی طرح چمک رہے ہیں۔ اس کی پلکیں گھنی اور نوک دار ہیں — اداں آنکھوں میں نیلی نیلی جھیلوں کی بے پناہ گراہیاں خوابیدہ ہیں — اگر یہ بچی آسمان پر پیدا ہوئی ہے۔ اور بنی آدم اور بنی اسرائیل کے ہاتھوں میں خدا کا یہ شاہکار بھوک سے — مر جایا ہوا ہے۔ خوف سے سما ہوا ہے، بے گھر ہے، بے سار، اور بے حد اداں ہے —

اس بچی کی جلد زیتون کے تیل کی طرح تازہ اور شفاف ہے۔ اس کی رگوں میں جو خون گردش کر رہا ہے۔ اس میں ڈھائی ہزار سال سے فلسطین کے چشموں کا پانی اور فلسطین کے پھولوں کی نگت اور فلسطین کے انگوروں کا رس رچا ہوا ہے۔ اس لڑکی کے وجود میں یہ دشمن کی اُن گنت صدیوں کے قدس کی امانت پوشیدہ ہے۔ اس کی پرورش بڑے بڑے برگزیدہ پیغمبروں کے زیر سایہ ہوئی ہے۔ اس کی تربیت بھی آسمانی صحیفوں کے ہاتھ ہے جو خدا نے اس ارض مقدس پر نازل فرمائے۔ اس لڑکی کے آباؤ اجداد ڈھائی ہزار سال سے فلسطین کی خاک میں دفن ہو رہے ہیں۔ لیکن آج یہ لڑکی روٹی کے ایک ٹکڑے کے لیے ننگے پاؤں اور ننگے سر بیروت کی گلیوں میں پریشان حال ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ کیونکہ بنی اسرائیل کی بھکنی ہوئی بھیڑوں کو اچانک وہ گھریاد آنے لگا ہے جہاں سے دو اڑھائی ہزار سال قبل خدا نے انھیں نکال باہر کیا تھا۔ یہودیوں کا سب سے نیا صحیفہ BALFOUR DECLARATION کی طرف سے نازل ہوا تھا اور جس میں بشارت دی تھی کہ شاہ انگلستان کی حکومت فلسطین میں یہودیوں کے لیے ایک قومی گھر تھیا کرنے کے حق میں ہے اور اس سلسلے میں یہودیوں کی ہر ممکن مدد کرے گی۔

جس عقیدت مندی سے یہودی اس انسانی بشارت کی پیروی کر رہے ہیں۔ اگر اسی جذبہ سے انہوں نے اپنی الہامی کتاب توریت کو اپنایا ہوتا تو شاید بنی اسرائیل کو ان گنت صدیوں تک دربدار کی خاک نہ چھانی پڑتی۔

اے بنی اسرائیل وہ دن یاد کرو جب خدا نے تمہیں سارے جہان کے لوگوں سے بڑھایا تھا۔ جب خدا نے تمہیں قوم فرعون کے پنجے سے چھڑایا تھا جو تمہیں بڑے دکھ دیتے تھے۔ تمہارے بچوں پر تو چھری پھیرتے تھے لیکن تمہاری عورتوں کو اپنی خدمت کے لیے زندہ رہنے دیتے تھے۔ جب خدا نے تمہارے لیے دریا کو نکڑے نکڑے کر دیا اور تم کو بچا کر فرعون کے آدمیوں کو تمہارے دیکھتے دیکھتے ڈبو دیا۔ جب خدا نے تم پر ابر کا سایہ کیا اور تم پر من و سلوٹی اتارا۔ جب موسیٰ نے اپنی لامھی پتھر پر ماری اور اس میں سے تمہارے لیے پانی کے بارہ چیختے پھوٹ نکلے۔

اے بنی اسرائیل وہ دن بھی یاد کرو جب خدا نے تم سے عمد لیا تھا کہ تم حق کے ساتھ باطل کونہ ملاو گے اور خدا کی آیات کو سستے داموں نہ پتپو گے۔ لیکن تم نے یہ وعدہ ایفانہ کیا اور تم نے بڑی ہٹ دعمری سے پچھڑے کو اپنا خدا بنا لیا۔ تم نے من و سلوٹی کی نعمت سے اکتا کر ساگ پات اور سکنڈی اور لمن اور سور و پیاز کی فرماںش کی۔ اپنی اکڑ میں آ کر تم نے بعض پیغمبروں کو جھٹلایا اور بعض کو جان سے مار ڈالا اور خدا نے تمہاری نافرمانیوں کی پاداش میں کبھی تم کو خود اپنے ہاتھوں سے قتل کا حکم دیا۔ کبھی تمہیں آسمانی بجلی سے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ کبھی تم راندہ درگاہ ہو کر بندر بنادیے گئے۔ کبھی تمہارے سر پر طور کا پھاڑ لٹکا دیا گیا۔

اے بنی اسرائیل بے شک تمہارے دل پتھر ہو چکے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت۔ کیونکہ پتھروں میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان سے نہیں جاری ہو جاتی ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں اور پانی رنسنے لگتا ہے۔

اے بنی اسرائیل آج تمہاری نسل بھی اس طرح مسخ ہو چکی ہے جس طرح کہ تم نے خدا کے کلام توریت کی شکل بدل دی تھی۔

تمہاری رگوں میں جو لوگردش کر رہا ہے اس میں اسرائیلی خون کی آمیزش بہت ہی کم ہے۔ ہزاروں سال سے تم دنیا کے گوشے گوشے میں مارے مارے پھر رہے ہو اور

تمہاری نسل دوسری قوموں میں خلطِ ملط ہو کر اب اپنی امتیازی حیثیت نہیں رکھتی۔ یوں بھی تم نے خدا کے رسولوں کی جگہ اب امریکہ اور انگلستان میں اپنی مرضی کے پیغمبر تلاش کر رکھے ہیں اور تمہاری موجودہ توریت BALFOUR DECLARATION MANOATE ہے، لیکن یاد رکھو اس عرب بچی کا سماں اور اس کی غمزدہ ماں کی دلی ہوئی آہ تمہارے سر پر کوہ طور سے بھی زیادہ خطرناک پہاڑ کی طرح لٹک رہی ہے۔ اس معموم بچے کی بے بس نگاہوں تلنے غضب ناک اور قرناک بجلیاں ترپ رہی ہیں۔ اگرچہ آج کل بند رنچانے کا رواج عام نہیں ہے۔ لیکن اگر خدا اپنی بات کا سچا ہے تو تم امریکہ اور انگلستان میں ڈھلنے ہوئے سونے اور چاندی کے مچھڑوں کی جس قدر چاہے پوچا کرو۔ لیکن عذاب کا جو چکر تمہارے پاؤں میں پڑا ہوا ہے۔ اور اس سے تمہیں نجات نہیں مل سکتی۔

ایک پنکھر

سسرام کا شرکتی لحاظ سے تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک تو یہاں شیر شاہ سوری کا مقبرہ ہے۔ دوسرے یہاں آغا جانی کا بازار ہے اور تیسرا اسی شریں ایک بار رانو کی موڑ کار کے دو نائز پنکھر ہو گئے تھے۔

جس طرح شیر شاہ سوری کی عظمت آغا جانی کے بازار کے پس منظر کے بغیر ادھوری رہ جاتی ہے۔ اسی طرح رانو کی کار کے بغیر سسرام کا شرکبھی اپنی تاریخی اہمیت کو بیٹھا ہے۔ آغا جانی کے بازار کا قصہ یوں ہے۔ کسی زمانے میں اس مقام پر ایک قصبہ آباد تھا۔ یہاں کے سردار کا لقب آغا تھا۔ اس کی ایک بیٹی تھی، جسے لوگ جانی کہتے تھے۔ غالباً جانی اس کا نام نہ تھا بلکہ اس لفظ کی دلفریب شانِ محبوبیت سے قیاس ہوتا ہے کہ وہ بے حد خوبصورت اور حسین و جمیل لڑکی تھی جس پر بہت سے لوگ دل و جان سے فریفتہ تھے۔ ان میں سے ایک فرید خاں بھی تھا۔

فرید خاں خواب دیکھنے کا شوقین تھا۔ خوبصورت خواب، بھیانک خواب جنگ و جدال کے خواب، ہندوستان کی بادشاہت کے خواب۔ جانی کے خواب، جانی کی آنکھوں، جانی کے بالوں کے، جانی کی مسکراہٹوں کے دلفریب سپنے۔ اور جب اس کے خوابوں کی تعبیر نکلی۔ اور شیر شاہ نے ہندوستان کی بادشاہت کا تاج پہننا تو ایک تیز رفتار قاصد یہ پیغام لا یا کہ ”جانی! میرا انتظار کرنا۔ میں بہت جلد اپنی ملکہ عالم کے حضور میں آ رہا ہوں۔“ شیر شاہ بادشاہت کرتا رہا۔ اور جانی انتظار۔ انجام کار، شیر شاہ پر ایک سنگاخ تاریخی مقبرہ تعمیر ہو گیا۔ اور جانی کے نام پر جانی بازار کی بنیاد پڑ گئی۔ جہاں ہر روز اس شہید و فاکی یاد میں بیسیوں جانیاں بن سنوار کر کے سو سو کینڈل پاور کے برقی معملوں کے عین

نیچے کریاں سجا کر — خیر، یہ تو ایک دوسری کمانی ہے۔ یہاں پر قصہ تورانو کی موڑ کار کا تھا۔ جسے پچھر بھی ہوتا تھا تو سسرا میں۔ اب اگر وہ شیر شاہ کے مقبرے یا جانی کے بازار کی طرف جا نکلتی تو اسے کون روک سکتا تھا؟ اگر وہ شیر شاہ کے مزار پر چلی جاتی تو شاید وہاں پر سوئی ہوئی خاک کی چٹکی میں ایک لمحہ کے لیے آگ سی بھڑک اٹھتی۔ اور اگر وہ جانی کے بازار کی طرف جا نکلتی تو — خیر، یہ بھی حُسنِ اتفاق تھا کہ وہ شیر شاہ کے مقبرے یا جانی کے بازار کی طرف جانے کے بجائے پچھر بھی طرف چلی آئی۔

اس وقت عدالت کے سامنے چوری کا کوئی معمولی سامقدمہ زیر ساعت تھا۔ پنڈت کیسری ناتھ شرما بڑے جوش و خروش سے ایک گواہ پر جرح فرمा� رہے تھے۔ وہ مقامی عدالتوں کے سب سے زیادہ سر بر آور رہ، خزانث اور کمنہ مشق و کیل تھے۔ جب وہ گواہ سے کوئی مفید مطلب کی بات کہلوایتے تھے تو بصد ادب و احترام، جھک کر چرب زبانی سے فرماتے تھے کہ ”عالیٰ جناب عدالت اس فقرے کو نوٹ کر لے۔“ لیکن ان کی بھینگی آنکھ جو مدعی، مدعاعلیہ، گواہ اور مجسٹریٹ کو ایک ہی ترچھے زاویے سے دیکھنے کی عادی تھی، پکار پکار کر کہتی تھی کہ ”اڑے او مجسٹریٹ کے بچے، اس فقرے کو یاد رکھنا!“ گواہ کی جرح پورے طور پر ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ عدالت نے اچانک مقدمے کی ساعت اگلی پیشی تک ملتی کر دی۔ پنڈت کیسری ناتھ شرانے لاکھ کما کہ ”حضور ابھی صفائی کے دو گواہ اور بھی موجود ہیں۔ جناب عالی! وہ بڑی مشکل سے کلکتہ سے بلائے گئے ہیں۔ سرکار والا وہ آج رات کی گاڑی سے واپس جانے پر مصروف ہیں۔“ ان کی بھینگی آنکھ نے بھی اپنی مخصوص زبان میں بہت سے اٹھے سیدھے وار کیے۔ لیکن عدالت کا فیصلہ اٹھ تھا۔ ابھی ابھی عدالت نے ملاحظہ فرمایا تھا کہ آج اس کی سرزین پر سُرخ حاشیہ کے سینڈلوں والے دو خوبصورت اور نازک پاؤں یوں محو خرام تھے جیسے کسی ستار پر دو حتائی انگلیاں مدھر مدھر سر میں درباری کا الاپ بجا رہی ہوں۔ پچھری کے احاطے میں اچانک ایک مددوш سی شیم بس گئی تھی۔ اور سفید جاریٹ پر بڑے بڑے گلابی پھولوں والی ایک سائزی نے ساری فضا کو گلناوار کر دیا تھا۔ چاروں طرف ایک سناثا سا چھا گیا جیسے کمشز صاحب بہادر اچانک کسی ہنگامی معائینے پر نمودار ہو گئے ہوں! عدالت کو ایک حسین مقدمے کے تخیل نے سرشار کر دیا تھا۔ عبد الوہاب پیش کار کچھ عرصے کے لیے پان کی پیک نگناہ بھول گیا اور

اس کے چند قطرے سامنے پڑی ہوئی تعزیرات ہند کی جلد پر ٹپک گئے۔ جواس نے نظر بچا کر کرٹے کے دامن سے پوچھ ڈالے۔ پنڈت کیسری ناتھ شrama نے بھی اپنی آنکھ کا زاویہ بدلا اور اس دھڑکتی ہوئی خاموشی میں ساری دنیا نے سنا کہ ایک مویساقار آواز کسی اردنی سے پوچھ رہی تھی۔ ”کیا یہاں کسی کے پاس موڑ کا رہے؟“

یوں تو سسرا م کے مقدمہ بازوں۔ وکیلوں، مجسٹریوں، کلرکوں اور چپر اسیوں کو اکثر یہ خیال آیا ہو گا کہ دنیا میں موڑ کا رہبھی ایک نعمت ہے۔ لیکن اس وقت انھیں یہ احساس نہایت شدت سے ستانے لگا کہ موڑ کا رہنہ ہونا ایک ناقابلِ عفو جرم اور ناقابلِ تلافی گناہ ہے۔ اس جنسِ نایاب کے فقدان نے کچھری کے احاطے میں حیرانی اور پشیمانی کا ماحول سا پیدا کر دیا اور ہر شخص اپنی اپنی جگہ ایک زبردست احساس بے مائیگی سے آب آب ہونے لگا۔ ”ہائے، عجیب جنگلی شر ہے یہ۔ ارے بھئی اگر موڑ نہیں تو پنچھر لگانے کا سامان تو ہو گا کسی کے پاس، تاز، رنچ، جیک، ربر سلیوشن وغیرہ وغیرہ“ رانو بات تو اردنی سے کر رہی تھی۔ لیکن ہر شخص محسوس کر رہا تھا کہ وہ خاص اسی سے مخاطب ہے۔ اور ان کے پشیمان چہرے زبان حال سے یہ فریاد کر رہے تھے کہ میری جان! یہ ایک موڑ ہی ہمارے بوس کا روگ نہیں۔ ورنہ تم کبوتو ہم آسمان سے تارے نوج لائیں۔ چاند اتار کر تمہارے پاؤں پر رکھ دیں۔ کالی گھٹاؤں کو تمہارے گیسوؤں سے لڑا دیں۔ شیر شاہ سوری کا مقبرہ تمہاری ٹھوکر میں لا بچھائیں، جانی کا بازار تمہارے آگے پیچھے بسادیں۔ لیکن اے جان! یہ موڑ کا راجوتا ہمارے منہ پر نہ مارو۔ ہم رو سیاہ۔۔۔۔۔

رانو جلدی میں تھی۔ اس لیے وہ اپنے آگے پیچھے، دائیں بائیں بلبلاتے ہوئے، کھماتے ہوئے فریادی چہروں کی آواز نہ سُن سکی اور نہ اس نے حضرت ویاس، شرمندگی اور بے بی کا وہ امترانج دیکھا جو ایشداس سائیکل ڈیلر کے منہ پر گرم گرم کول تار کی طرح تھہ بہ تھہ بچھا جا رہا تھا۔ وہ دون بھر درجنوں مقدمہ بازوں، منتیلوں اور مختاروں کے سائیکلوں کے پنچھر درست کیا کرتا تھا۔ لیکن اے وائے! کہ زندگی عزیز کے اس انمول لمحے اس کا سارا کمال بے کار، بے سود، رائیگاں تھا۔ اگر خالی ربڑ کی بات ہوتی تو خیر وہ تو اپنی کھال تک کھینچ لیتا۔ لیکن اس کے پاس نہ کوئی بڑا رنچ تھا۔ اور نہ ہی جیک۔ چنانچہ اب وہ اپنی ماڈرن سائیکل ورکشاپ کے سامنے ایک بے یار و مددگار اپانچ کی طرح کھڑا تھا جس

کامال و متاع اس کے سامنے لوٹا جا رہا ہو۔ ”اب قسمت سے یہاں آگئی ہو تو اپنا نور پھیلاتی جاؤ۔ تمہارے نور میں تو کوئی کمی نہ ہو گی۔ لیکن یہ زندگیاں غیر فانی ہو جائیں گی۔ یہ گھر آباد ہو جائیں گے۔ آنے والی نسلیں تمہارے گیت بھی اسی شوق، اسی سوز، اسی حرمت سے گائیں گے۔ جس طرح اب جانی کے قصے گائے جاتے ہیں“۔۔۔

”کوئی ہوٹل، کوئی ڈاک بولگہ، کوئی ریسٹ ہاؤس؟ ہائے یہ بھی کیا مجبوری ہے۔ اس ٹکوڑی کار کو بھی اسی جنگل میں پنچھر ہونا تھا۔ پھر ایک بھی نہیں، بیک وقت دو ٹاٹر پنچھر ہو گئے ہیں۔ شاید ایک ٹوب بالکل ہی پھٹ گئی ہو۔ اب اس اجائز بیابان میں نئی ٹوب کماں ملے گی بھلا؟ ہائے دن بھی ڈھلتا جا رہا ہے۔ بنارس یہاں سے کوئی پچاس ساٹھ میل ہی تو ہو گا۔ اگر یہ کمخت کار پنچھر نہ ہوتی تو اب تک وہاں پنچ بھی گئی ہوئی۔ بنارس پنچ کراس کو ابھی کتنے کام کرنے تھے۔

”کیا یہاں پر رات گزارنے کے لیے کوئی اچھا ہوٹل ہے؟“

ارے ہوٹل میری جان، تجھے ہوٹل کی کیا حاجت؟ یہ دل دیکھو، یہ سینہ دیکھو، یہ آنکھیں دیکھو۔ یہ سارے پٹ تمہارے ہی لیے واہیں۔ آؤ یہ کاشانے تمہارے ہی منتظر تھے۔ اب تم کماں جاؤ گی؟ یہ سب تمہارے ہی گھر ہیں۔ وہ آئیں ہمارے گھر میں خدا کی قدرت ہے۔۔۔

”ہائے نہیں، میں کسی کے پاس نہیں ٹھرنا چاہتی۔ کیا یہاں کوئی ڈاک بولگہ بھی نہیں؟ کوئی ریسٹ ہاؤس؟“

سرام کی پکھری کے احاطے میں جتنے دل دھڑک رہے تھے۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ ہوٹل یا ڈاک بولگہ یا ریسٹ ہاؤس کا رتبہ حاصل کرنے کی سرتوڑ کوشش کرنے لگے اور ان کے کواڑ بے قراری سے بار بار کھلتے تھے اور دامن پھیلا پھیلا کر فریاد کرتے تھے کہ آؤ گھڑی دو گھڑی کے لیے ان ویرانوں کو آباد کرتی جاؤ۔ اگر یہ لا جواب ساعت بیت گئی تو کون جانتا ہے کہ پھر دوبارہ واپس آئے نہ آئے۔ اگر تم یوں ہی چلی گئیں، تو یہ تاریکی جو تمہارے بعد پھیلے گی کبھی دور نہ ہو سکے گی۔

”خاک“ رانو جھلا سی گئی۔ ”کیا نام اس شر کا؟“

سرام کا ذرہ ذرہ پکارنے لگا کہ ہمیں سرام کہتے ہیں۔ پسلے ہمارا نام سہ سرام

تھا۔ بادشاہوں کے آرام فرمانے کی جگہ۔ وہ دیکھو، سامنے جو ایک سنگاخ عمارت نظر آ رہی ہے وہ ایک مقبرہ ہے۔ ایک بادشاہ کا مقبرہ۔ ہماری آنکھوں میں آج بھی ایک جلیل القدر بادشاہ محو استراحت ہے لیکن یہ قدر ناشناس لوگ پھر بھی ہمیں سسرام ہی کہے جاتے ہیں۔ جاہل، پاگل، احسان فراموش۔ دیکھو تو سی۔ تمہاری کار کے پنچھر تک نہیں جوڑ سکتے۔ گنوار، نالائق، غمغٹے۔

اُس روز موڑ سائیکل کو بار بار اچانک دھکے لگتے تھے۔ اسرافیل رہ کر اپنا صور پھونکتا تھا جیسے پھاڑ ٹکرا گئے تھے۔ زمین اور آسمان ایک دوسرے سے مل گئے تھے اور اس نفاسی کے عالم میں رانو کے مرمریں بازو میری کائنات پر ایک مرغولہ نور کی طرح آؤ رہا ہو رہے تھے۔ لیکن پھر وہ گہرنے لگی۔ غصیلی ناگنوں کی طرح مل کھاتی ہوئی تیوریاں اس کی پیشانی پر یوں تملانے لگیں جیسے برفانی بادلوں کے آنچل میں بجلیاں ترپ رہی ہوں۔ جیسے مرمر کی سبلوں پر چاندی کے تار سیماں کی طرح جھلمنلا رہے ہوں۔ غصے میں بھی کیا کیف ہوتا ہے۔ کیا نشہ ہوتا ہے۔ کیسی رعنائی! چنانچہ اگر اس روز قدم قدم پر ٹھوکروں اور ہچکلوں نے ہمارا استقبال کیا تو اس میں نہ میرا قصور تھا اور نہ موڑ سائیکل کا نہ سڑک کا۔ بلکہ ساری کائنات اس شبابی غبار کو دیکھنے کے لیے بے قرار تھی جو غصے کی تمازت میں رانو کے گالوں پر قوسِ قزح کی طرح چھایا جاتا تھا۔ اور بخدا! وہ کیا ہی لا جواب، لافانی انمول لمحہ تھا۔ جب اس کے ڈرائیور نے قطعی طور پر کہہ دیا کہ "میں صاحب! پنچھر لگانے کا سامان نہیں مل سکا۔ جب تک یہ سامان نہ ملے، گاڑی بے کار ہے۔"

رانو کی کار سڑک کے کنارے اس خاموش گائے کی طرح کھڑی تھی، جس کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہو۔ اور بیس بیس کوس کسی سلوتری کا ہسپتال ملنا محال ہو ڈرائیور کا فیصلہ سُن کر رانو کے گالوں کا شبابی غبار آتش فشاں کی طرح لاوے سے اُگلنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں جو والا مکھتی کے شعلے سے بھڑکنے لگے اور اس کے نازک پاؤں سسرام کی اس خوش نصیب سرزی میں کو غصے سے یوں پیٹنے لگے جیسے فرید خاں ہندوستان کا تخت پانے کے خواب بُن بُن کر بے چینی سے ادھر سے اُدھر پاؤں مارتا تھا اور جیسے جانی انتظار کی گھریوں میں بے بُس، پریشان، مجبور ایڑیاں رکھتی تھی۔ آج شام تک رانو کا کلکتہ پہنچا۔ اس تدر لازمی تھا۔ اس

کا احساس نہ ڈرائیور کو تھا، نہ موڑ کار کو، جو ایک اپاچ گائے کی طرح سڑک کے کنارے دم توڑے پڑی تھی۔ حالانکہ یہ اشد ضروری تھا کہ وہ شام تک لگلتے پہنچ جائے کیونکہ آج رات جشنِ آزادی کی رات تھی اور رات کے عین بارہ بجے جب آزادی کی دیوی آکاش سے اُتر کر اس دھرتی پر آئے گی۔ اس وقت گرینڈ ہوٹل کا بال روم اپنے پورے جوں کے ساتھ اس کا استقبال کرے گا۔ یوں تو گرینڈ ہوٹل کا بال روم ہر شب شب برات مناتا ہے لیکن آزادی کی رات بھی کوئی روز روز آتی ہے۔ اگر رانو نے یہ زیریں موقع کھو دیا تو نہ جانے اسے یہ جشن دوبارہ منانے کے لیے کتنے سوکتے ہزار برس انتظار کرنا پڑے۔ اور پھر ہربنس نے اسے اس موقع پر خاص طور پر مدعو کیا تھا۔ ہربنس اس کا مگنیٹر تھا۔ بڑا البیلا، خوش باش، خوش دل جوں تھا اور ناچتا بھی کیا خوب تھا۔ خصوصاً آج کی رات جب گرینڈ ہوٹل کا آرکسٹرانسٹ نئی سُرملی ڈھنیں بجائے گا جب بال روم کی فضا میں عطر اور یونڈر، ٹمپن، قوقنه اور خوبصورت نازک اندام، سیمیں اجسام ایک تیز و تندر خمار کی طرح چھا جائیں گے۔ جب رات کے بارہ بجے ہزاروں سال کے انتظار کے بعد آزادی کی دیوی و سکی جن شیری کے گلاسوں کی خوشنما جھنکار کے ساتھ زمین پر اترے گی تو ہربنس کے رمبا میں کیا کیا ترنگ نہ ناچے گی۔ اس کے سبک قدم رقص گاہ کے شفاف اور پچکیلے فرش پر یوں پڑیں گے جسے کسی جھیل کی لہروں میں کنوں کے پھول تیرتے پھر رہے ہوں اور اس کے گر سندہ بے قرار بازو رانو کو ایک شعلہ بے قرار کی طرح اپنی لپیٹ میں لے ناج گھر کے جھگٹے میں یوں رقصاں ہوں گے، جیسے دیا سلامی کو بھڑکتی ہوئی آگ میں چا بکدستی سے تیز تیز گھمایا جائے اور اسے آگ نہ لگنے پائے — لیکن تقدیر کا نوشتہ کس نے مٹایا ہے اور کون مٹائے گا؟ عین اس وقت جب لگلتے میں ہربنس اپنے ڈنر سوٹ کے کالر میں لگانے کے لیے سفید گلب کے ایک بڑے سے پھول میں پر لائیں پیرس کا عطر "پیشن"۔ سویوں سے چھو چھو کر بارہ تھا۔ رانو گرینڈ ٹرینک روڈ پر ایک خیراتی سرائے کی طرح بے بنگلے میں ایک ناقابل بیان، بے کسی بیزاری اور ماہوسی کے عالم میں اپنا سامان اتردا رہی تھی۔ لیکن اس سامان کی آمد پر صدیوں سے سویا ہوا بنگلہ انگڑائی سی لے کر بیدار ہو گیا۔ اس کی اونٹھتی ہوئی بے جان دیواروں میں زندگی کے آثار لہرانے لگے۔ جمی ہوئی کھڑکیاں

اور فرسودہ درستچے نو دمیدہ کلیوں کی طرح کھلنے لگے۔ تاریک چھتوں پر جیسے چاند اور تارے طلوع ہو گئے ہوں اور جب رانو نے اپنے لا جواب ہاتھوں سے ڈرائیگ روم کی کرسیوں اور میزوں پر بکھری ہوئی کتابوں کو الماری میں رکھ کر صوفے کا رُخ قدرے بدلتے رکھا تو اس بھولے بسرے، پریشان حال کمرے میں نشاط اور شالا مار کی گل پوش روشنیں آراستہ ہو گئیں۔ اور پھر آج کی تاریخی رات ٹکلتہ نہ پہنچ سکنے کا غم غلط کرنے کے لیے رانو نے اپنی پنک باکس سے جن، رم اور وسکی نکال کر چند تیز عنابی رنگ کے کاک ٹیل بنایے کے نوش جان فرمائے۔ ان کا خمار گلابی ڈوروں کی صورت میں اس کی غزالی آنکھوں میں چھلک آیا اور اس کے گالوں پر آتش بازی کی متابیاں انار چھوٹنے لگے۔ آدمی رات کے قریب جب ہم شیرشاہ کے مقبرے کی چھت پر جا کے بیٹھ گئے تاکہ سسرا م کے گلی کو چوں میں آزادی کا نفوذ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں تو اس وقت وہ ویران مقبرہ گرینڈ ہوٹل کے بال روم سے زیادہ منور اور بارونق محسوس ہونے لگا۔ اور اس کے ساتھ میں ایک عجیب سماں سا ارکسٹرا بھجنے لگا۔ سسرا م کی سرزین پر ایک نئے شیرشاہ نے جنم لیا، جس پر تاریخ کبھی کوئی یادگار مزار تعمیر نہ کر سکے گی۔ ایک نئی جانی نے ظلمت شب کو اپنے گیسوئے عنبریں سے تابانی عطا فرمائی۔ لیکن اس کے نام پر غالباً کوئی بازار قائم نہیں ہوا۔ گھڑی کی سوئی بارہ بھجنے سے کچھ منٹ ادھر دھیئے دھیئے لرز رہی تھی جیسے کسی حینہ کے دہنے ہوئے ہونٹ انکار اور اقرار کے مابین تھر تھرا رہے ہوں۔ شیرشاہ سوری کے مقبرے کے گرد جو تالاب ہے، اس کی سیڑھیوں پر بہت سے بچے خوشی اور جوش سے کلکاریاں مارتے ہوئے انار متابیاں چھپھوندریں اور پٹانے جمع کر رہے تھے اور انھیں تالاب کے گرد اس خوبی اور کوشش سے سجا رہے تھے جس طرح رانو نے میرے ڈرائیگ ٹیل کے سامنے بیٹھ کر اپنے پیچیدہ کالکوں کو آراستہ کیا تھا۔ ٹکلتہ گرینڈ ہوٹل میں بال روم اپنے جوں پر تھا۔ ہر بنس رانو کی آمد سے ماہیوں ہو کر مس پر میلا کو اپنی بانسیوں کے حلقتے میں لیے آزادی کا رقص ناج رہا تھا۔ ”ڈرائیگ“ مجھے دونوں ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ تھامے رکھو۔ رانی اپنی محمور، مو سیقار آواز میں کہہ رہی تھی۔ ”گاؤ“ میں اس مقدس رات کو آسانی سے برداشت نہیں کر سکتی۔ بائی گاؤ، میں وفور جذبات سے مر جاؤں گی۔ ”آزادی کے انتظار میں رانو بھی ان بچوں کی طرح بے خود اور بے قرار ہو رہی تھی۔ جو نیچے تالاب کی

سیڑھیوں پر آتش بازی کی قطاریں سجا رہے تھے۔ اف ایک پچھہ دھڑام سے پھسل کر سنگلاخ فرش پر گرپدا۔ اس کے ہاتھ کا انار تراخ سے چھٹ گیا۔ اس کا چہرہ گرم گرم دھوئیں کے غبار میں لپٹ گیا۔ اس کی آنکھیں ججلس کر مند گئیں۔ اب وہ اپنی آنکھوں سے اس دیوی کی شان نزول نہ دیکھ سکے گا جس کا استقبال کرنے کے لیے اس نے اپنی تو تلی زبان سے انقلاب زندہ باد کے نعرے لگانا یکھے تھے۔ آسمان پر ایک تار انوٹا اور دور تک ایک خط نور کھینچا ہوا غائب ہو گیا۔ جانی کے بازار میں طبلے پر زور کی تھاپ پڑی۔ گھنگرو ناچے۔ شیر شاہ کے مقبرے کے سنگلاخ پتھر سڑک مرمر بن گئے۔ چھٹ کے اندر میرے میں ایک شمع فروزان بھڑکی۔ آزادی کی دیوی سوانیزے پر اتر آئی تھی اور میرے کانوں میں ایک نازک سی مترنم سی آواز کہہ رہی تھی، ”چاکلیٹ سر؟“

میں نے آنکھ کھول کر دیکھا تو ہلکے نیلے فرماں والی ایسہ ہوش بسکٹوں، چاکلیٹوں، چونے والی مٹھائیوں کی ٹرے لیے میرے سیٹ پر جگلی ہوئی تھی اس کے احمر بالوں کی ایک لٹ ٹرے پر بے پرواٹی سے لمرا رہی تھی اور اس سے یاسکین کے سینٹ کی ہلکی ہلکی سی شیمیوں آ رہی تھی جیسے پھولوں کے نجف سے ٹھنڈی ٹھنڈی نیم کے جھونکے چھن رہے ہوں۔

بی۔ او۔ اے۔ سی کا طیارہ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر اپنے چار انجنوں کی طاقت سے پوری رفتار پر پرواز کر رہا تھا۔ راوی گزر چکی تھی اور اس کے رومن بھی۔ اب ہم دریائے سندھ کے پاس پرواز کر رہے تھے، جس پر فقط سکھر بیراج ہی تعمیر ہو سکتے ہیں۔ اور گنگا اور جمنا، اور سون ہنگلی کے مرغزار بہت چیچے رہ گئے تھے، جہاں کے صنم خانوں میں رانو ازال تک راج کرے گی۔ لیکن آزادی کی دیوی اب کبھی دھرتی پر نہ اُترے گی۔ سہرام کی سڑک پر کسی کار کو پنچرنا ہوں گے۔ شیر شاہ کا مقبرہ اب پتھر آباد نہ ہو گا۔ اس کے سنگلاخ پتھر مرمنہ بن بسکیں گے۔ اس کی چھٹ پر کوئی شمع فروزان نہ بھڑکے گی۔

سرود رفتہ باز آید کہ ناید

آپ بیتی

میرا اپنا کوئی نام نہیں۔ لیکن مجھے ہر روز سینکڑوں نام عطا ہوتے ہیں۔ میرا کوئی گھر نہیں، لیکن مجھے عالی شان محلوں سے لے کر غلیظ سے غلیظ جھونپڑوں میں رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ مجھے میں غیرت اور خودداری ہے لیکن ہمیشہ ہر قسم کے اشاروں پر کٹھ پتلی کی طرح نچایا جاتا ہوں۔ مجھے شرت سے شدید نفرت ہے لیکن کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب مجھے تصادب کی دکان پر لئے ہوئے گوشت کی طرح بر سر عام نگانہ کیا جاتا ہو۔ آخر انسان ہوں۔ اپنے بھائیوں کی طرح مرنے کی تمنا بھی رکھتا ہوں۔ لیکن کوئی آخری بار قطعی طور پر مرنے نہیں دیتا۔ روتا چاہوں تو ہنسا پڑتا ہے۔ ہنوں تو روتا لازم۔ خدا کی ساری خدائی میں مجھ سا مظلوم کوئی دوسرا نہیں ہے۔ ایک انار اور سو بیمار والا مقولہ میرے سامنے بیج ہے۔ میری حالت اس سے بھی خستہ ہے۔ ایک ناک ہے اور ہزاروں نکیلیں جس طرف جھکا لے بے اختیار کھینچا چلا جاتا ہوں۔

نظر آنے کو تو بہت کچھ ہوں، لیکن میری حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ اردو افسانے کا ایک کردار ہوں۔ افسانہ نگار رات دن میری تلاش میں سرگردان رہتے ہیں۔ اور جب ایک دفعہ ان کے ہاتھ آ جاؤں تو خدا کی پناہ! نجات ملنا محال ہے۔ بھروپیوں کی طرح میرا رنگ روغن ناک نقشہ بدل بدل کر مجھے جس طرح استعمال کیا جاتا ہے اگر اس کی تفصیل بیان کرنے بیٹھ جاؤں تو یہ خود ایک افسانہ بن جائے۔

صح و شام گلی کوچوں کی خاک چھانے بھیجا جاتا ہوں۔ اس ہیرا پھیری میں بہت سی جگہ جوتے کھاتا ہوں۔ لیکن اس کا ذکر کسی کتابی میں نہیں ہوتا۔ راہ چلتی عورتوں کو گھورتا ہوں۔ ریشمی بر قلعوں کا تعاقب کرتا ہوں۔ چلوں اور جلوسوں، بُرستانوں، کارخانوں،

شروع، دیہاتوں، دفتروں، مسجدوں اور چوربازاروں کا مستقل طواف کرتا ہوں۔ لیکن جو دیکھتا ہوں وہ زبان پر نہیں لاسکتا۔ کیونکہ زبان میرے اختیار میں نہیں۔ بلکہ افسانہ نگار کے قابو میں ہے۔ البتہ اگر اس گھوما گھومی میں کسی بھی ایک خوبصورت عورت کا دوپٹہ ہاتھ میں آجائے تو گالیاں افسانہ نویس کو نہیں مجھے پڑتی ہیں۔ — کسی کا ناک یا گردن کپڑہ بیٹھوں تو فوجداری کا خطروہ افسانہ نگار کو نہیں مجھے لاحق ہوتا ہے۔ کہیں کسی کی ریش مبارک پر ہاتھ جا پڑے تو کفر کا نتویں بھی میرے ہی سرداہیں طرف بھٹک نکلوں تو رجعت پسند، باہمیں طرف جھکوں تو ترقی پسند۔ دو چار ہفتے جامت نہ بناوں تو کیونٹ۔ دھولی کے دھلے کپڑے پہن لوں سرمایہ دار۔ افسانہ نگار تو فقط افسانہ نگار ہی رہتا ہے۔ اس کھینچاتانی میں میری تکہ بولی ہو جاتی ہے۔

چھپلے دنوں جب ہندوستان اور پاکستان پر آزادی کا نزول ہوا تو میرے ذلی میں بڑے بڑے ارمانوں نے سراہیا کہ شاید یہ انقلاب عظیم مجھے ایک ایسی زندگی جاوید عطا فرمائے گا جس کے سامنے انقلاب فرانس اور انقلابِ روس کے ہیرو بھی ماند پڑ جائیں۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ دراصل ہوا کیا؟ — اردو کے افسانہ نگاروں نے مجھے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکلا اور کپڑہ کپڑہ کبھی ہندوؤں سے زندہ آگ میں جلوایا کبھی سکھوں کی گرپاؤں سے کٹوایا۔ کبھی مسلمانوں کے ہاتھوں ذبح کرایا کبھی پنجاب کی ریلوں میں قتل ہوا۔ کبھی لکھتے کے بازاروں میں مارا گیا اور جب اس خون کی ہولی سے افسانہ نگاروں کا جی پوری طرح بھر گیا تو انہوں نے میرے کپڑے چھاڑ کر بال نوج کر حال سے بے حال کر کے مهاجر کا جامہ پہنا دیا۔ اور آج تک اسی چکر میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ نجات کا کوئی راستہ نہیں آتا۔ کیونکہ افسانہ نگاروں نے مجھے اس طوفان میں دھکیل تو دیا لیکن اب باہر نکالنے سے قادر ہیں۔ میں اپنی اس نئی زندگی کے بے پایاں سمندر میں کبھی ڈوٹا ہوں کبھی ابھرتا ہوں۔ اور میرے آتائے نامدار افسانہ نگار بے دست و پاسا حل پر کھڑے میرا انتظار کر رہے ہیں — جو پوچھتے تو یہ مهاجر زندگی بھی بڑی کراری زندگی ہے جس کو ایک روز اس کی لت پڑ گئی وہ بس ہمیشہ کے لیے اسی زندگی کا حلقة گوش ہو کے رہ گیا۔ استادِ ذوق کے قول کے مطابق:

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر گلی ہوئی

یہ اسی نئے کی کشش ہے کہ جن حضرات کو ہجرت کی سعادت نصیب نہیں ہوئی، وہ بھی جو ق در بوق مهاجرین کے زمرے میں شامل ہونے کے لیے بے قرار ہیں۔ چنانچہ اب خدا کے فضل و کرم سے یہ حالت ہے کہ اصلی مهاجرین کے مقابلے میں ان حضرات کی تعداد کمیں زیادہ ہے جو "محض تبرکا" اس سُنت نبویؐ کو پورا کر رہے ہیں۔ خیر یہ ایک دوسرا قصہ ہے۔ دراصل جو بات میں عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ ایک مهاجر لڑکی کے متعلق ہے۔ آپ ضرور ناک بھوں چڑھائیں گے کہ یہ کیا بیووہ بکواس ہے۔ مهاجر لڑکیوں کے قصے تو ہم روز سنتے ہیں۔ اب یہ مضمون بند ہونا چاہئے بندہ پورا! آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر دراصل مجھ سے چوک ہوئی۔ میرا مطلب یہ تھا کہ جو چیزیں یہاں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ ایک مهاجر لڑکی کے متعلق ہی نہیں بلکہ اس میں دین و ایمان کی بھی بستی لاجواب باشیں ہیں۔ کچھ عجب نہیں کہ آپ نہ ہب کے نام پر بھی چیس بجھیں ہوں۔ اگر ایسی بات ہے تو بے شک آپ کا ٹھکانا جہنم میں ہے اور آپ میری کہانی کو ادھورا چھوڑ کر بڑے شوق سے اپنی منزل مقصود کی راہ لے سکتے ہیں۔۔۔ جن لوگوں کے ایمان سلامت ہیں اور جن کے دلوں سے ابھی تک مهاجر لڑکیوں کی یاد فراموش نہیں ہوئی۔ ان کے لیے اس قصے میں بڑے ثواب اور بڑی حکمت کی نشانیاں ہیں۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ گاندھی گارڈن میں مزے سے گھاس پر لینا ہوا اونگھ رہا تھا۔ ہاتھ میں ایک اخبار تھا جس میں ایک نئی مسجد کی تعمیر کے لیے چندے کی اپیل تھی۔ ساتھ ہی ایک ہوٹل کا اشتہار تھا کہ آج رات کی ساری آمنی اس مسجد کی تعمیر کے لیے وقف کر دی جائے گی۔ یوں بھی آج کل میری گزر ہوٹلوں میں ہوتی ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال رہا تو مروں گا بھی ضرور ہسپتال جا کر۔۔۔ خیر اس کارثوں میں حصہ لینے کے لیے اس شام سیدھا اشتہار والے ہوٹل پہنچا۔ وہاں شراب، ڈنر اور ڈانس کا معقول انتظام تھا اور مینجنر صاحب کے کاؤنٹر پر ایک نورانی چہرے والے باریش بزرگ بھی موجود تھے۔ تاکہ حساب کتاب پر کڑی نگاہ رکھیں۔ شام کی کارروائی قرآن خوانی کی جگہ ٹھپٹیں سے شروع ہوئی۔ میں نے جی بھر کے شراب پی۔ ڈنر کھایا اور ناچ دیکھا جس میں ایک فرانسیسی رقصہ اپنے جسم اور لباس کی آنکھ مچوی کا بڑا کمال دکھا رہی تھی، کوئی آدمی رات کے قریب جب میں ہوٹل سے باہر نکلا تو ہم خدا و ہم ثواب کے احساس سے میرا دل

شاد اور روح منور تھی۔ یہ بھی آزادی کی برکت ہے کہ پہلے شراب نوشی پر کفر کا فتویٰ لگنے کا احتمال تھا۔ لیکن اب اس لال پری کے اشاروں پر مسجد کے مینار بلند ہوتے ہیں اور سینوں میں ایمان کی شمع فروزاں روشن ہوتی ہے۔ قریب تھا کہ میں احساسِ تشكیر سے اللہ میان کی بارگاہ میں سجدہ بجالاؤں کہ یہاں ایک سڑک کے عین درمیان ایک رکشا والے نے مجھے تھام لیا اور میرے قدموں کی شدید لڑکھڑاہٹ دیکھ کر مجھے اپنے رکشا میں بیٹھنے کی دعوت دی۔ رکشا والے کے انداز بتا رہے تھے کہ وہ ہر روز آدمی آدمی رات کے وقت خلقِ خدا کی خدمت کرنے کا عادی ہے اور خاص طور پر اسے ان حضرات کی نگہداشت کا خاص ملکہ ہے جو عموماً اس ہوٹل میں تعمیر مساجد کے سلسلے میں حاضر ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ رکشہ پر بیٹھتے ہی موقعدِ محل کی رعایت سے اس نے روحانیت کا ذکر چھیڑ دیا۔ خدا نخواستہ یہ بات نہیں کہ اس نے کسی وظیفہ یاد رود یا کلمہ کا ورد شروع کیا۔ بلکہ حقیقت میں اس نے مہاجر چھوکریوں کے قصے چھیڑ دیے۔ جو پانچ روپے سے لے کر پچاس روپے تک فوراً دستیاب ہو سکتی تھیں۔ یہ بھی افسانہ نگاروں کی صحبت کافی نہ ہے کہ میں عورت ذات کو روحانیت کا جو ہر سمجھتا ہوں کہ جس کے بغیر بجز موت اور کوئی زندگی ممکن نہیں ہے۔

”سیئہ!“ رکشا والے نے مجھے بشارت دی اگر تم میں روپے صرف کرو تو تمیں

ابھی جنت کی سیر کر لاؤں۔ —

میں نے اس دعوتِ خیر کو بخوبی قبول کر لیا۔ ہوٹل میں تعمیر مسجد کے نام پر ڈزر کھا کے شراب پی کے اور روح کو گرانے والے ناج دیکھ کر میں نے اپنا نام جنت کے خریداروں میں لکھوا ہی دیا تھا۔ اب اگر صرف میں روپے مزید صرف کر کے رہی سنی منزل بھی طے ہو سکتی ہے۔

”تو چشمِ ما روشنِ دلِ ما شاد“

چنانچہ میں نے رکشا والے کو پانچ روپے انعام کا مردہ بھی سنایا تاکہ وہ اس کا رخیر کی تکمیل میں کوئی تاخیر نہ کرے۔ ان پانچ روپوں نے جادو کا اثر دکھایا اور رکشا راہ گیروں سے الجھتی موڑوں سے پچتی بچاتی سرپٹ بھاگنے لگی۔ پہلے سڑک کے دونوں جانب بڑی بڑی عمارتیں تھیں۔ پھر تگ گلیوں میں ثاث اور چٹائیوں کے چھوٹے چھوٹے جھونپڑے۔ ایک مقام پر ایک مسجد بھی نظر آئی مگر مجھے خیال آیا کہ لگے ہاتھوں وضو بھی کرتا چلوں،

لیکن رکشا والے نے مجھے اس نیک ارادے سے باز رکھا۔۔۔

”سینہ!“ رکشا والا تنہی سے نہ کربولا معلوم ہوتا ہے کہ تم بہت پی گئے ہو۔ اگر کسی نے تم کو اس حالت میں مسجد میں پکڑ لیا تو مارے جو تیوں کے کھوپڑی گنجی ہو جائے گی — مجھے اس بات پر بے حد غصہ آنا چاہیے تھا، لیکن نہ آیا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ بچارا رکشہ والا محض نادائق اور نادان ہے۔ اسے کیا خبر کہ بہت جلد اس شہر میں ایک عالی شان مسجد تعمیر ہونے والی ہے جس کی بہت اینٹوں پر میرا نام بھی لکھا ہوا ہو گا۔۔۔ خیر تاریکی، غلاظت اور بدبو کے ایک لامتناہی سلسلے میں چلتے چلتے ہم ایک جگہ جھونپڑوں کی دررویہ قطاروں کے درمیان رک گئے۔ یہاں جنت کے بہت سے اور متلاشیوں کی رکشائیں، گھوڑا گاڑیاں، موڑیں اور یتکیاں بھی کینوں گائے کھڑی تھیں۔ میرا خضر راہ پانچ روپے کے انعام کی گرمی سے بھی بہت پھرتی میں تھا۔ وہ کھٹ سے بہشت کے ایک دروازے میں داخل ہوا اور ایک دوسرے دروازے سے ایک حور کو برآمد کر کے لے آیا۔ مجھے افسوس ہے کہ افسانہ نگاروں کے فیضان صحبت سے میری زبان گبڑ چکی ہے اور میں استعاروں اور تشبیہوں کے بغیر اپنا مفہوم ادا نہیں کر سکتا۔ دراصل میرا مطلب یہ ہے کہ رکشہ والا ایک جھونپڑنے میں گیا اور وہاں سے اپنے ساتھ ایک لڑکی لے آیا۔ اندھیرے کی وجہ سے میں اس کی صورت کا جائزہ تو نہ لے سکا۔ لیکن جب وہ رکشہ میں میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی تو میری چھٹی حس نے بے ساختہ گواہی دی کہ اگر

فردوس بروئے زمین است

ہمیں است و ہمیں است

رکشہ والا بھی اب مزے میں تھا۔ جھونپڑے سے وہ ایک خوبصورا پان کھا کے نکلا تھا۔ منه میں بیڑی تھی اور وہ سیٹیاں بجا تا، گاتا اور اکاؤکا راہ گیروں پر پان کی پیک تھوکتا تیز رفتاری سے چلا جا رہا تھا۔ کلفشن بیچ کے ایک تاریک حصے میں پہنچ کر وہ رک گیا اور رکشہ ہمارے پر در کر کے کچھ دور پرے رست پر منه کے بل لیٹ کر سو گیا۔۔۔ میں نے اپنے ساتھی سے اس کا نام پوچھ کر گفتگو کی ابتداء کی۔۔۔ ”راحت بیگم۔“ اس نے جواب دیا۔ ”گھر کہاں ہے؟“۔۔۔ امانت پور ضلع مراد آباد۔۔۔ ”یہاں کیسے پہنچ گئی ہو؟“ میں نے پوچھا۔۔۔ اس سوال پر وہ ہیران سی ہوئی اور میری طرف یوں دیکھنے لگی جیسے میں نے یہ

سوال پوچھ کر کوئی عجیب و غریب احتمانہ حرکت کی ہو، — لیکن مجھے بھی افسانہ نگاروں کی ٹریننگ حاصل تھی۔ اس لیے میں نے اپنا سوال پھر دہرا�ا۔

”صاحب!“ اس نے کہا۔ ”وہاں کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے بھلا؟ نہ جان کا خیال، نہ مال کا خیال، نہ عزت و آبرو کا بچاؤ۔ توبہ“ اس سے تو موت ہی اچھی۔“

”بہت خوب۔“ میں نے چھیرا۔ ”یہاں پر تو بڑی عزت و آبرو کے دن گزار رہی ہو!“

”یہاں کی دوسری بات ہے صاحب۔“ اس نے سادگی سے جواب دیا۔ ”آخر یہاں پر اپنا دین تو سلامت ہے۔“

اس بات پر میری روح پھر کٹھی اور میں نے دل ہی دل میں خداۓ زوالجلال کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے آج شام مجھے تعمیر مسجد میں ہاتھ ہٹانے کی سعادت عطا فرمائی۔ اسلام کا بول بالا ہو۔ دین سلامت ہے تو سب کچھ ہے۔ دین ہی ایک دولت ہے جسے زوال نہیں۔ ایک طرف سمندر کی لہروں کی آہ و بقا تھی۔— دوسری طرف رست پر رکشہ والا زور زور سے خڑائے لے رہا تھا اور وہ لڑکی کہہ رہی تھی۔ صاحب میری چھوٹی بُن اور ماں ابھی تک امانت پور ضلع مراد آباد میں ہیں۔ جب میرے پاس دو سورپے جمع ہو جائیں گے تو میں انہیں بھی اس دونخ سے نکال لاؤں گی۔ میں نے اب تک ایک سو چالیس روپے بچا رکھے ہیں اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا، اور اس طرح کی چار راتیں اور لگ گھنیں تو صاحب دو سورپے ہونے میں کون سی دیر لگتی ہے؟ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا، کہ آج میں اسے بیس کی جگہ پورے سانچہ روپے دے دوں گا۔ وہ بھی کیا یاد کرے گی کہ کسی مسلمان سے پالا پڑا تھا! آخر انسان کی مدد کرنا بھی تو مسجد کی تعمیر سے کچھ کم درجے کا ثواب نہیں۔ شاید اس کا درجہ تعمیر مسجد سے بھی کچھ بلند ہو۔— میں ابھی اسی حساب کتاب میں الجھا ہوا تھا کہ یک ایک دو شریف آدمی نجع میں نمودار ہوئے اور بڑی مستعدی سے ہمارے آگے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ پہلے انہوں نے رکشہ والے کو زور سے جھنجھوڑا اور پھر ہم دونوں کے خاندانوں کی کئی پشتلوں کے متعلق اپنی وسیع معلومات کا اظمار فرمائے گے۔ اس تمیید کے بعد انہوں نے ہمیں باری باری تھیث کر رکشہ سے باہر نکلا اور بڑی تفصیل کے ساتھ ہماری تلاشی لی۔ میری پتلوں کی جیب میں ایک بنوہ تھا۔ جس

میں وہ ساٹھ روپے بھی تھے، جنہیں میں نے ابھی ابھی ایک نیک کام میں لگانے کا ارادہ کیا تھا۔ لڑکی کی چوپی سے وہ پوتلی برآمد ہوئی جس میں اس نے ایک سوچالیس روپے بچا بچا کر رکھے تھے۔ ایک شریف آدمی نے بٹوے کو اور دوسرے شریف آدمی نے پوتلی کو اپنی اپنی جیب میں ڈال لیا۔ پھر انہوں نے ٹھوکر مار کر رکشہ والے کو جگایا وہ آنکھیں ملتا ہوا، خاموشی سے اپنی سیٹ پر آبیٹھا۔ میرا خیال تھا کہ اب یہ لوگ ہمیں سیدھا تھانے لے جائیں گے۔ میں تھانے یا کچھری یا جیل سے مطلقاً نہیں گھبراتا کیونکہ انگریزی راج میں انسانہ نگار مجھے ان مقامات پر بھیجنے کے بہت شوقین تھے۔ لیکن صد حیف! کہ ان شریف آدمیوں نے میری طرف آنکھ تک اٹھا کرنہ دیکھا۔ کیونکہ اب وہ رکشا والے کی جیب سے پانچ روپے کا نوٹ برآمد کرنے میں مصروف تھے۔ اس عمل کے بعد وہ دونوں راحت بیکم کو گود میں لے کر رکشہ میں بیٹھ گئے۔ اور رکشہ ادھ موئے سانپ کی طرح آہستہ آہستہ ریت پر ریگنے لگی۔ اور پھر کلفشن بیچ کے ایک اور دریان حصے کے اندر میرے نے اسے نگل لیا۔—

اور عائشہ آگئی

کوکھاپار کے ایک مقام پر سرحد عبور کرتے ہوئے ہندوستانی کشم چوکی والوں نے عبدالکریم اور اس کی بیوی کو تو جانے دیا لیکن ان کی تین چیزوں کو مزید تحقیق کے لیے اپنے پاس رکھ لیا۔ یہ تین چیزیں سنگر سونگ مشین، ہر کو لیس کا بائیکل اور عبدالکریم کی جواں سال بیٹی عائشہ پر مشتمل تھی۔ دو دن اور ایک رات کی منت و سماجت کے بعد بہ ہزار وقت جب یہ چیزیں واپس ملیں تو سلامیٰ کی مشین کے کئی کل پرزے غائب تھے۔ بائیکل کی گدی، نائز اور بیویں ندارد تھیں اور عائشہ ۔۔۔ خیر، یہ بھی نہیت تھا، کہ اگر اللہ نے چاہا تو سلامیٰ کی مشین کے کل پرزے بھی نئے ڈلوا لیے جائیں گے۔ بائیکل کی گدی، نائز اور بیویں بھی اور آجائیں گی اور عائشہ ۔۔۔؟ عائشہ کا بھی اللہ مالک ہے۔ عبدالکریم کو جو ایمان غیب کی پر اسرار طاقتتوں پر تھا۔ اس میں آج معمول سے بہت زیادہ کشف کی کیفیت بھلاک رہی تھی۔

جب وہ رلوے اشیشن پر پہنچے، تو مقامی والشیروں نے انہیں گوشت کے سالن کا ایک پیالہ اور چار تازہ نان کھانے کو دیے۔ سفید سفید، نرم نرم، سوندھے سوندھے نان دیکھ کر عبدالکریم نے اپنی بیوی کی ران پر چوری سے چٹکی بھری اور سرگوشی میں کھا۔ ”میں نے کہا عائشہ کی ماں دیکھتی ہو، کیا خالص اور کارے نان ہیں۔ اس سالی بہبی میں کیا پڑا تھا؟ چار برس سے سترے آئے کی صورت کو ترس گئے تھے۔ واہ، کیا مکھن کے پڑے پیدا کیے ہیں میرے مولانے۔“

جب وہ گاڑی کے ڈبے میں سوار ہوئے تو کچھ مسافر اپنے جان پہچان لوگوں کے ساتھ علیک سلیک میں مشغول تھے۔ ”اسلام علیکم“ و علیکم سلام۔ ”اسلام علیکم رحمۃ اللہ

و برکاتہ ”۔ عبد الکریم نے پھر اپنی بیوی کو جھنجورا۔ ”عائشہ کی ماں، سنتی ہو؟ کیا دھوم دھڑکے کے ساتھ دعا سلام ہو رہی ہے۔ واہ، اسلام کی تو شان ہی اور ہے۔ سالی بمبی میں تو پہنڈے ماتزم بندے ماتزم سنتے کان پک گئے تھے۔ خدا کی قسم آج تو میرا سینہ بھی جاری ہو رہا ہے۔ واہ، کیا بات ہے میرے مولا کی۔“ اور عبد الکریم نے اپنے انگل بغل بیٹھے ہوئے مسافروں کے ساتھ بڑے جوش و خروش سے ہاتھ ملانا اور گونج گونج کر اسلام علیکم کہنا شروع کر دیا۔ اگر اس کی بیوی اسے پکڑ کر واپس نہ بٹھا لیتی تو نہ جانے وہ کب تک اس کا روائی میں لگا رہتا۔

جب گاڑی چلی تو عبد الکریم نے بڑے انہاک کے ساتھ اس کے پیوں کی گڑگڑاہٹ کو نہ۔ باہر تار کے ٹکھیوں سے حساب لگا کر ٹرین کی رفتار کا جائزہ لیا۔ ”واہ اس نے اپنی بیوی کو پھر جھنجورا۔ ”طفوان میل کیا چیز ہے اس کے سامنے مزہ آگیا گاڑی میں بیٹھ کر۔ عائشہ کی ماں، تم بھی اپنی تسبیح نکال لو اور کھلم کھلا اطمینان سے بیٹھ کر اللہ کا نام لو۔ کیا مجال ہے کہ کوئی چیچے سے آکر تمہاری گردن کاٹ لے۔“

ایک اسٹیشن کے بعد دوسرا اسٹیشن آئا گیا۔ گاڑی رکتی اور چلتی رہی، مسافت اترتے اور سوار ہوتے گئے۔ عبد الکریم کھڑکی سے منہ باہر لٹکائے اپنے ماحول کو اپنے دل، سینے اور آنکھوں میں جذب کر رہا تھا۔ صاف ستری وردی والا گارڈ جس کے سر پر جناح کیپ، ہاتھ میں سبز اور سرخ جھنڈیاں اور منہ میں سیٹی تھی۔ پلیٹ فارموں پر چیلوں کی طرح جھپٹتے ہوئے قلی۔ بھجنھناتی ہوئی ٹکھیوں سے لدے ہوئے مٹھائیوں اور کھانوں کے خواص۔ باہر حد نگاہ تک پھیلے ہوئے میدان، راکاؤنکا گاؤں کے کچے کچے مکانوں سے لکھتا ہوا دھواں۔ جو ہڑوں پر پانی بھرتی ہوئی، کپڑے دھوتی ہوئی عورتیں۔ گرد و غبار میں ائے ہوئے ننگ دھڑنگ بچے آسمان کی طرف منہ اٹھا اٹھا کر روتے ہوئے کتے، بلیاں، گدھ، کہیں کہیں کسی گائے یا بیتل یا بھینس کی سڑی ہوئی متعفن لاش۔—

جب حیدر آباد کا اسٹیشن آیا، توب سے پہلے عبد الکریم کی نگاہ ایک رنگین بورڈ پر پڑی، جس پر ایک دل ہلا دینے والی مارکٹائی سے بھرپور فلم کا اشتھار تھا۔ یہ دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اسی پلیٹ فارم پر کچھ سپاہی دس بارہ ملزموں کو گھیرے میں لیے کھڑے تھے اور ایک مجھریٹ صاحب کری پر ڈٹے بر سر عام عدالت لگائے بیٹھے تھے اور بغیر

ملک سفر کرنے والوں کو دھڑا دھڑ جرانے کی سزا سنارہے تھے۔ سرکار کا یہ رعب و اب دیکھ کر عبدالکریم بڑا متاثر ہوا اور اس نے حسب معمول اپنی بیوی کی توجہ اس طرف منعطف کرنے کے لیے اس کی ران پر چلتی لی۔ ”عاشرہ کی ماں انتظام ہو تو ایسا ہو۔ سارے بھیتی میں کسی ملک بابو کی مجال ہے کہ بغیر ملک والوں کو روک نوک کرے۔ وہ حکومت کا سلیقہ بھی مسلمانوں کے خون میں ہی ہے۔ میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ یہ لاہہ لوگوں کے بس کا نہیں ہے۔“

عاشرہ کی ماں بڑی دمجمی سے سیٹ پر اکڑوں بیٹھی تھی۔ اس نے اپنی گھرڑی پر ایک ہزار ایک منکوں والی تسبیح نکال لی تھی اور اب بڑے انہاک سے اس پر اللہ تعالیٰ کے ننانوے ناموں کا اور د کرنے میں مشغول تھی۔

”عاشرہ بیٹی۔“ عبدالکریم نے اپنی بیٹی کو پکارا۔ ”دیکھتی ہو اپنی اماں کے ٹھانٹھ کیا بات ہے اپنے وطن کی۔ بیٹی، اس کا لے صندوق سے میری ٹوپی بھی تو نکال دو ذرا۔ اب یہاں کس سالے کا ڈر ہے۔“

عاشرہ نے میکانگی طور پر صندوق کھولا، اور ٹوپی نکال کر اپنے باپ کے حوالے کی۔ یہ ایک پرانی سرمئی رنگ کی جناح کیپ تھی، جسے پہن کر عبدالکریم کسی وقت بھنڈی بازار کے پروجش جلوں میں شامل ہوا کرتا تھا۔ لیکن اب چار سال سے یہ ٹوپی صندوق میں بند تھی۔ اور اس پر لگا ہوا نکل کا چاند تارا زنگ آلود ہو کر ٹوپی کی رنگت کے ساتھ مل جل گیا تھا۔

ٹوپی اور ڈر کر عبدالکریم سینہ تن کر بینٹھ گیا۔ اور کھڑکی سے باہر اڑتی ہوئی گرد کو دیکھنے لگا۔ عاشرہ بھی باہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک آکتاہی ہوئی بیزار نگاہ، جس کے سامنے کسی منزل کا نشان نہ ہو۔ وہ بار بار کوشش کرتی تھی کہ دل ہی دل میں دعاۓ گنج العرش کا اور د کرے۔ اس دعا نے اس کی بست سی مشکلیں حل کر دی تھیں۔ لیکن آج اس دعا کے الفاظ اس کے ہونٹوں پر لرز کر رہے جاتے تھے اور زبان تک نہ پہنچتے تھے۔ اس کا دل بھی اندر رپکار رہا تھا کہ اب یہ عظیم الائٹ دعا بھی اس کی مشکل آسان نہ کر سکے گی۔ اب وہ ایک ایسی منزل پر ہنچ چکی تھی۔ جہاں خدا کی خدائی بھی چارہ ساز نہیں ہوتی۔ توبہ، یہ تو بڑا کفر ہے۔ خدا کی ذات تو قادر مطلق ہے۔ اگر وہ چاہے تو گردشِ ایام کا رُخ

پیچھے کی طرف موڑ دے اور زمانہ کو از سر نو اس لمحے شروع کرے۔ جب عائشہ ابھی کھوکھراپار کے قریب ہندوستانی کشم چوکی پر نہ پہنچی تھی۔

کراچی پہنچ کر سب سے پہلا مسئلہ سرچ چھانے کی گلگھہ تلاش کرنے کا تھا۔ کچھ دوسرے لوگوں کی دیکھا دیکھی عبدالکریم نے اپنا سامان اسٹینشن کے باہر ایک فٹ پاٹھ پر جمادیا اور عائشہ اور اس کی ماں کو وہاں بھاکر مکان کی تلاش میں نکل گیا۔ کچھ رات گئے جب وہ لوٹا، تو دن بھر کی دوڑ دھوپ سے بہت تھکا ہوا تھا۔ لیکن اس کے چہرے پر بثاشت اور اطمینان کے آثار جملکتے تھے۔

”عائشہ کی ماں“ عبدالکریم نے فٹ پاٹھ پر پاؤں پار کے کہا۔ ”ہماری کراچی کے سامنے سالی بمبی کی کچھ حقیقت ہی نہیں۔ تمہارے سر کی قسم! ایسے ایسے عالی شان محل کھڑے ہیں کہ نہ کبھی دیکھنے نہ سنے۔ ایک سے ایک بڑھ کے سینٹھ بھی موجود پڑا ہے۔ تمہاری قسم ایک ایک سینٹھ، بمبی کے چار چار مارواڑیوں کو اپنی جیب میں ڈال سکتا ہے اور پھر موڑیں؟ کاہے کو سالی بمبی نے ایسی لپھے دار موڑیں دیکھی ہوں گی۔ پاس سے گزر جائیں، تو سمجھو جیسے کسی نے ریشم کا تھان کھول کر سڑک پر بچھا دیا ہے۔ اب ذرا ٹھکانے سے بیٹھ جائیں، تو تمہیں بھی گھما پھرالا دیں گا۔ طبیعت خوش ہو جائے گی کراچی کی بمار دیکھ کر۔“

”مکان کا کچھ ہوا؟“ عائشہ کی ماں حقیقت کی طرف آئی۔

”ایجی ابھی کیا جلدی پڑی ہے۔ اللہ نے چاہا تو سب انتظام ہو جائے گا۔ آج میں نے گھوم پھر کر گزری کے ریٹ دریافت کر لیے ہیں۔ خدا کی قسم، عائشہ کی ماں، سالی بمبی کراچی کے سامنے کوئی چیز ہی نہیں۔ گزری کے جو گذے دار ریٹ یہاں اٹھتے ہیں، بے چارے بمبی والوں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے ہوں گے۔“

عبدالکریم کا اب یہ معمول ہو گیا تھا کہ وہ علی الصبح منہ اندھیرے چل کھڑا ہوتا۔ کبھی بس میں بیٹھتا، کبھی ٹرام میں، کبھی رکشہ پر۔ کبھی پیدل۔ کبھاڑی۔ کلفٹن۔ بندروڑ۔ صدر۔ فریز پارک۔ اسمبلی ہال۔ چیف کورٹ۔ جیل۔ پیر الٹی بخش کالونی۔ خداداد کالونی۔ ناظم آباد۔ منگھوپیر۔ قائد اعظم کا مزار۔ کوئی مقام ایسا نہ تھا جس کا اس نے بنظر غائر جائزہ نہ لیا ہو۔ اور کوئی جائزہ ایسا نہ تھا جس نے اس کے خون کی گردش کو

تیز اور اس کے دل کو شاد نہ کیا ہو۔ اور عبدالکریم کو کراچی کے فقیر بھی بڑے نجیب الطرفین نظر آتے تھے جو ماجس کی ڈبیاں اور اخبار پنج کر بڑی خوش اسلوبی سے بھیک مانگتے تھے۔ بمبئی کی طرح نہیں، کہ ایک سے ایک بڑا مشنڈا اللہ لیے پھرتا ہے اور بھیک یوں مانگتا ہے جیسے دھمکی دے کر قرض و حصول کر رہا ہو۔

ایک روز وہ جمعہ کی نماز پڑھنے جامع مسجد گیا۔ نمازوں کا بہت ہجوم تھا۔ مصر، شام، عراق، ججاز اور ایران سے بڑے بڑے لوگ ایک کانفرنس کے سلسلے میں کراچی آئے ہوئے تھے۔ نماز کے بعد انہوں نے پاکستان کے متعلق بڑی شاندار تقریبیں کیں۔ اللہ اکبر کے نعرے بلند ہوئے۔ لوگ اٹھ اٹھ کر ان کے ہاتھ چونے لگے۔ گلے ملنے لگے اور چاروں طرف جوش و خوش کا ایک عجیب عالم چھا گیا۔ یہ سال دیکھ کر عبدالکریم کی آنکھوں سے بے اختیار خوشی کے آنسو بننے لگے اور جب سب لوگ چلے گئے تو اس نے اللہ تعالیٰ کے حضور میں شکرانہ کے درکعت نفل ادا کیے۔

بمبئی میں عبدالکریم کے پاس بھنڈی بازار کے عقب میں ایک چھوٹی سی کھوپی تھی۔ ایک تاریک سا، گھناؤنا سا کمرہ، نہ کوئی برآمدہ، نہ صحن، نہ تازہ ہوا، نہ دھوپ اور پھر ہر میئنے پورے ساڑھے دس روپے کرایہ کے ٹھیک کیم کو ادا نہ ہوں تو سینہ کے گماشتنے کی گھر کیاں اور دھمکیاں الگ۔ لیکن اس کے مقابلے میں اب کراچی میں زندگی بڑے مزے سے بسر ہوتی تھی۔ جس فٹ پاٹھ پر اس نے پہلے روز اڑا جمایا تھا اب وہاں کوئی بارہ فٹ لمبی اور ۱۰۰۰۰ افٹ چوڑی جگہ گھیر کر اس نے دوسرے لوگوں کی دیکھاویکھی لکڑی کے تختے جوڑ کر اور پرانی بوریوں کے پردے تان کر ایک چھوٹی سی کٹیا بنا لی تھی۔ محلی ہوا تھی۔ دھوپ اور روشنی بے روک ٹوک آتی جاتی تھی۔ پاس ہی بجلی کا کھمبتا تھا۔ جس کے بلب کی روشنی عین اس کے کمرے پر پڑتی تھی۔ پانی کا نل دور نہ تھا اور پھر نہ کرائے کا جھگڑا، نہ ہر میئنے سینہ کے گماشتنے کی پنج، اتفاق سے آس پاس کے ہمائے بھی شریف لوگ تھے اور سب کی آپس میں بڑے اطمینان سے بسر ہوتی تھی۔

بمبئی میں عبدالکریم نے بہت سے کاروبار بدلتے تھے۔ اخیر میں جب کانگریسی حکومت نے امتیاع شراب کا حکم لگایا، تو عبدالکریم کے لیے ایک مستقل ذریعہ معاش کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ ایک سائز کے عملے، دیسی شراب کشید کرنے والوں اور بغیر پرست

کے شراب پینے والوں سے اس کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ اور وہ ان تینوں کی مناسب خدمات کے عوض اپنے لیے دو ڈھائی سو روپے ماہوار پیدا کر لیتا تھا۔ کراچی پونچنے کے بعد اس نے چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ مملکت خداداد کے دار الخلافہ میں فی الحال حرمت شراب کا حکم نازل نہیں ہوا۔

یہ دیکھ کر اس کے دل میں بہت سی بدگمانیوں نے سراٹھایا۔ اگرچہ وہ چور بازار میں شراب کا کاروبار کیا کرتا تھا لیکن وہ اسے ایک حرام چیز ضرور سمجھتا تھا۔ اور اس نے خود کبھی اس کو منہ نہیں لگایا تھا۔ جب کانگرس والوں نے شراب پر بندش کا قانون لگایا تو وہ اپنے دوستوں کے سامنے بڑی بڑی ڈیگیں مارا کرتا تھا کہ ہندوؤں نے یہ کام کی بات مسلمانوں کے نہ ہب سے سیکھی ہے لیکن اب کراچی میں یہ دگرگوں حالت دیکھ کر اسے بڑا ذہنی صدمہ پہنچا۔ اس نے بہت سے لوگوں سے اس کے بارے میں کپید کریڈ کر پوچھا، لیکن کوئی اس کی خاطر خواہ تشغیل نہ کر سکا۔ آخر ایک روز جب وہ حکیم نجیب اللہ خاں کے مطب میں بیٹھا گیا ہاں کر رہا تھا تو باتوں میں شراب کا مسئلہ بھی چھڑ گیا۔ حکیم صاحب اپنے محلے میں بڑے جید عالمِ تصور کیے جاتے تھے اور وہ دواداروں کے علاوہ مسئلہ سائل سے بھی خلقِ خدا کی خدمت کیا کرتے تھے۔ عورتوں میں ہمسڑیا کے مرض کو دوا کے بغیر محض روحانی وسائل سے رفع کروانا ان کا خیال کمال تھا۔ عبدالکریم کے شکوہ سن کر حکیم صاحب مسکرانے، اور عقلی، بہانی اور قرآنی زاویوں سے شراب پر بڑی فصاحت و بلاغت سے روشنی ڈالنے لگے۔ ہر امر میں نیکی اور بدی دونوں کے راستے واہوتے ہیں۔ انسان کا کمال یہ ہے، کہ وہ بدی سے منہ موڑے اور نیکی کو اختیار کرے۔ اسی طرح شراب کے فائدے اور گناہ بھی اس کے سامنے ہیں۔ یہاں بھی انسانی قوت اختیار کا امتحان ہے۔ شراب پر قانونی بندش لگا کر انسان کو اس امتحان سے محروم کرنا سراسر مشیت ایزدی کے خلاف ہے۔

عبدالکریم پر ان تغیرات کا بہت اثر ہوا اور اسلام، ایمان اور قرآن کے نئے نئے اسرار اس پر منکشف ہونے لگے۔ ”عائشہ کی ماں۔“ اس نے کہا۔ ”غلامی کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے بھلا؟ پچاس برس ہو گئے سالی بھی میں رہتے۔ نمازیں پڑھیں۔ قرآن شریف بھی سیکھا۔ لیکن کیا مجال جو کبھی سینے میں ایمان کی روشنی پیدا ہوئی۔ اب یہاں آگر

نئے نئے راز کھلنے لگے ہیں۔ سچ کہتے ہیں کہ ایمان کا مزہ بھی آزادی کے ساتھ ہے۔
”اسی لیے تو حدیث شریف میں آیا ہے کہ غلامِ ملک میں جمعہ کی نماز تک جائز
نہیں۔“

شراب کی طرف سے مطمئن ہو کر عبدالکریم نے کئی دوسرے کاروباروں کی طرف
رجوع کیا۔ لیکن اسے اپنے چور بازار کے تجربات کام میں لانے کی کہی صورت نظر
نہ آئی۔ شراب ہے تو حکم کھلا بک رہی ہے۔ آٹا ہے تو بر سرِ عام چار آنے سیر کے حساب
ڈھیروں ڈھیر مل رہا ہے۔ کپڑے کی بھی قلت نہیں۔ چینی عام ہے۔ اب چور بازاری میں
چلے تو کس چیز کے سارے چلے؟ پہلے اس نے پان بیڑی بیچنے کی کوشش کی۔ پھر آس کرم
اوڑ پھلوں کے ٹھیلوں پر قسمت کو آزمایا۔ اس کے بعد کپڑے کی ایک چھوٹی سی دکان
کھولی۔ گزارے کے لیے پیے تو ہر جگہ سے نکل آتے تھے۔ لیکن زندگی عنزیز کی چاشنی ختم
ہو گئی تھی۔ اور سیدھی طرح دکان پر بیٹھے بیٹھے عبدالکریم کا جی بیزار ہو جاتا تھا۔ وہ کسی پر
خطر، زیر زمین قسم کے بیوپار کا متلاشی تھا۔ جس کا تجربہ اس نے زندگی کے بہترین سال
صرف کر کے حاصل کیا تھا۔ لیکن فی الحال اس کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ اس لیے
اس کے دل اور دماغ پر ہمیشہ ایک مستقل آکتا ہے چھائی رہتی۔

بہمی میں اگر کسی وجہ سے اس پر بیزاری یا آکتا ہے کا حملہ ہوتا تھا تو وہ جی بھلانے
کے لیے۔ کسی چوبارے پر گانا سننے چلا جایا کرتا تھا۔ کراچی میں آئے ہوئے اسے کئی
میمنے ہو گئے تھے اور اس نے یہاں کا چپٹے چپٹے دیکھ دالا تھا۔ لیکن اب تک اسے کہیں ایسے
بازار کا نشان نظر نہ آیا تھا، جہاں وہ گھری دو گھری کو کلفت مٹانے کے لیے ہو آیا کرے۔
اس نے چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ چکلوں پر قانونی بندش لگی ہوتی ہے۔ اور جس طرح
بہمی میں شراب بند ہے۔ اسی طرح کراچی میں رنڈیوں کا پیشہ منع ہے۔ عبدالکریم نے یہ
خبر بڑی صفائی قلب کے ساتھ عائشہ کی ماں کو سنائی اور وہ دونوں دیر تک فٹ پاٹھ پر اپنی
جو نپردی کے سامنے چارپائی پر بیٹھے قرآن اور ایمان کی روح پرور باتیں کرتے رہے۔

چکلوں کے سلسلے میں جو تحقیقات عبدالکریم نے کی تھی اس کے دوران اس پر یہ
حقیقت کھل گئی تھی کہ اس میدان میں بلیک مارکیٹ کے وسیع امکانات ہیں۔ اس کی کچھ
ایسے لوگوں سے شناسائی بھی ہو گئی تھی جو اس بیوپار میں بڑی دسترس رکھتے تھے اور

عبدالکریم کے پرانے تجربات کی بنا پر اسے معقول کمیشن پر اپنا شریک کا رہانے کے لئے آمادہ تھے۔ ایک کانے دلال نے شاید عائشہ کو بھی کہیں دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ اس نے رائے دی کہ اگر عبدالکریم اس کی رفاقت کرے تو وہ بہت جلد ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کے مالک بن جائیں گے۔ جب عبدالکریم کو اس کی نیت کا علم ہوا تو اس نے اپنا جوتا کھول کر اس کانے کی بر سر عام خوب مرمت کی اور مسجد میں جا کر ساری رات سجدے میں پڑا روٹا رہا، کہ اس کے دل میں ایسے ذیل کام کا خیال بھی آیا۔ یا غفور الرحمن یا ایسی سیاہ کارانہ خیال کی سزا ہے کہ اب لوگ اس کی عائشہ کی طرف بھی نظریں اٹھانے لگے ہیں۔

یا اللہ توبہ۔ یا اللہ توبہ۔ —

رات بھر خشوع و خضوع کے ساتھ استغفار کر کے عبدالکریم کا دل پھول کی طرح ہلکا ہو گیا۔ علی الصبح منه اندر ہیرے جب وہ گھرو اپس لوٹا، تو اس کی بیوی انتظار کرتے چٹائی پر سو گئی تھی۔ عائشہ مجرم کی نماز سے فارغ ہو کر تلاوت قرآن میں مصروف تھی۔ اس کی آواز میں بڑا سوز حزیں تھا۔ اور جب وہ آہستہ آہستہ قرأت کے ساتھ خدا کا کلام پڑھتی تھی تو فضا میں ایک عجیب عرفان چھا جاتا تھا۔ عبدالکریم خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھا سنتا رہا اور سوچتا رہا کہ کیا یہی وہ معصومیت کا فرشتہ ہے جس کے متعلق ایک بدمعاش دلال نے سیاہ کاری کی ہوں کی تھی۔

عبدالکریم کی توبہ اور عائشہ کی دعاؤں نے بڑا اثر دکھایا۔ کپڑے کی دکان خوب چا نکلی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے عبدالکریم نے پیر الہی بخش کالونی میں ساڑھے چار ہزار روپے میں دو کمرے کا پختہ مکان خرید لیا۔ زندگی میں پہلی بار عائشہ کی ماں کو اپنی نسبت کا مکان نصیب ہوا تھا۔ وہ اسے شیشے کی طرح صاف رکھنے لگی۔ دن میں کوئی باریست کا فرش دھویا جاتا۔ دیواریں جھاڑی جاتیں اور صبح شام اندر باہر فینائل کا چھڑکاو ہوتا۔ تاکہ کھیاں اندر نہ آنے پائیں۔ علی الصبح منه اندر ہیرے عبدالکریم کی بیوی تو مکان کی صفائی میں مصروف ہوتی۔ اور عائشہ دالان میں بیٹھ کر قرآن پڑھتی۔ عبدالکریم دیر تک بستر پر اپنے ماہول کے عرفان میں سرشار پڑا جرتا۔ انڈوں پر انھوں اور چائے کا ناشتہ کر کے جب وہ دکان کھولتا تو اس کا ظاہر اور باطن بڑے مطمئن اور آسودہ ہوتے تھے۔

رفتہ رفتہ عائشہ کے لئے پیام بھی آنے لگے۔ جس روز اس کی منگنی ہوئی۔ وہ بے

اختیار ساری رات مسلسل پر پڑی روتی رہی۔ رخصتی کے روز وہ کئی بار روتے روتے بے ہوش ہوئی۔ عبد الکریم اور عائشہ کی ماں کا بھی برا حال تھا۔ عائشہ کا خاوند بجزور کا مہاجر تھا اور شندو آدم خال میں آڑھتی کی دکان کرتا تھا۔ جس روز وہ سرال سدھاری تو گویا عبد الکریم کا گھر سنان ہو گیا۔ دوسرے روز حسب معمول اس کی آنکھ منہ اندھیرے کھلی۔ لیکن دلان میں عائشہ کی آواز نہ پا کر وہ کروٹ بدلت کر پھر سو گیا۔ جب وہ دن چڑھے اٹھا، تو اس کے بدن میں بڑی آنکھ تھی۔ جیسے انیونی کو انیون یا شرابی کو شراب سے ناغہ ہو گیا ہو۔ اس نے طبعاً "وکھا" منہ ہاتھ دھویا۔ ناشتہ کیا اور کپڑے بدلت کر دکان پر چلا گیا۔ دکان میں بھی اس کی طبیعت کچھ اچاث سی رہی۔ اس لیے دکان کو معمول سے پہلے بند کر کے وہ جی بھلانے کے لیے گھونٹ نکل گیا۔ رات کو دیر سے لوٹا اور بغیر کھانا کھائے سو گیا۔

اب اس کا معمول ہو گیا تھا، کہ صبح دیر سے اٹھتا۔ بہت دیر سے ناشتہ کرتا۔ کوئی دن ڈھلنے دکان پر جاتا اور آدمی آدمی رات گئے گھر لوٹتا۔ رفتہ رفتہ اس نے دکان کے لیے ایک ملازم رکھ لیا اور سارا سارا دن سونے اور رات رات بھر باہر رہنے لگا۔ سر شام اس کے برآمدے میں کئی قسم کے دلالوں کا جھمکٹا لگ جاتا تھا۔ ان میں وہ کانا دلال بھی ہوتا تھا جسے عبد الکریم نے ایک روز برصغیر جو تول سے پیٹا تھا۔

ایک دوبار عبد الکریم کی بیوی نے ان لوگوں کے متعلق پوچھ چکھ کی، تو اس نے بڑی صفائی سے ٹال دیا۔

"عائشہ کی ماں! اب میں نے ایک دو اور بیوپار بھی کھول لیے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو بڑی کامیابی ہو گی۔ تم ذرا جلدی سے ان بھلے آدمیوں کے لیے چائے پانی بھجوادو۔"

عبد الکریم کے نئے بیوپار بھی چمک اٹھے۔ چھ سات مہینوں میں اس نے پیر الہی بخش کالونی والا مکان چھوڑ کر بندر روڈ پر ایک دو منزلہ کو بھی خرید لی۔ صدر دروازے پر "سینئھ عبد الکریم بھائی والا۔" کا بورڈ لگ گیا۔ سواری کے لیے موڑ آگئی اور گھر میں کام کاج کے لیے نوکر چاکر مقرر ہو گئے۔ اب عائشہ کی ماں کو بھی فرصت نصیب ہوئی۔ اور وہ آدمی آدمی رات اٹھ کر تجھد گزارتی تھی۔ اور اپنی ایک ہزار ایک دانوں والی تسبیح پر اللہ کے ایک سوننانوے ناموں کا ورد کر کے اپنے شوہر کی کمائی میں برکت اور کشائش

کی دعائیں کیا کرتی تھی۔

ایک رات جب عبدالکریم گھر آیا، تو عائشہ کی ماں نے اس کے پاؤں دباتے ہوئے کہا۔ ”اے جی۔۔۔ میں نے کہا،“ کچھ سنتے ہو؟“

”کیا بات ہے، عائشہ کی ماں؟“ عبدالکریم نے بے توجی سے پوچھا۔ دن بھر کی ریاست سے وہ بہت تھکا ہوا اور کسل مند تھا۔

”خیر سے شدھو آدم خاں سے آدمی آیا تھا۔ اللہ رکھے، تمہاری بیٹی پر خدا نے اپنی رحمت کی ہے۔ اگلے مینے تم بھی نانا ابا کملانے لگو گے!“

”اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ عائشہ کی ماں اُنگلی جمادات کو یتیم خانہ کے بچوں کو بلا کر کھانا کھلا دینا۔ مجھے کام میں یاد رہے نہ رہے، تم ضرور یاد رکھنا اور ہاں۔۔۔ عائشہ کی ماں، کچھ زیورات اور کپڑے بھی بنوار کھو۔ جب تم گھی کچھڑی لے کر جاؤ گی، تو خالی ہاتھ تو نہ جاؤ گی۔ اللہ رکھے اب دوپیے آئے ہیں تو اپنی بیٹی پر بھی ارمان نکال لو۔“

”اے ہے۔“ عائشہ کی ماں نے تنک کر کہا۔ ”یہ تم کیسی باتیں کرتے ہو۔ میں بھلا گھی کچھڑی لے کر کہاں جاؤ گی۔ میری بچی، اللہ رکھے بڑی التز اور انجان ہے۔۔۔ میں نے اسے دن پورے کرنے یہاں بلا لیا ہے۔ اللہ نے چاہا تو پرسوں دوپر کی گاڑی سے آجائے گی۔ تم بھی موڑ لے کر چلنا۔ ہم عائشہ کو اشیش پر لینے جائیں گے۔“

یہ خبر سن کر عبدالکریم اپنے بستر پر اٹھ کر بینہ گیا۔ اس کی آنکھوں پر مکڑی کے جالے سے تن گئے اور اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے گھر کے درود یو اراس کامنہ چڑا چڑا کر پکار رہے ہوں، کہ اب عائشہ آرہی ہے۔ عائشہ آرہی ہے، عائشہ آرہی ہے۔۔۔

وہ ساری رات بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ صبح معمول سے پہلے اٹھ بیٹھا۔ نہاد ہو کر کپڑے بدلتے، ناشت کیا اور سیدھا اپنے کپڑے کی دکان پر جا بیٹھا۔ اس کا ملازم جو پچھلے آٹھ ماہ سے تن تھا اس دکان کو اپنے من مانے طریقے پر چلا رہا تھا، مالک کو آتے دیکھ کر گھبرا گیا۔ لیکن عبدالکریم نے حساب کتاب کے متعلق کوئی باز پرس نہ کی۔ وہ سارا دن دکان پر کھویا کھویا سا بیٹھا رہا۔ اس کے بہت سے یار دوست اس کی تلاش میں وہاں بھی آپنچے۔ لیکن وہ کام کا بہانہ کر کے سب کو رکھائی سے ثالتا رہا۔ تیرے پر وہ کانا دلال بھی حسب معمول اس کی تلاش میں وہاں آیا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی عبدالکریم آپ سے

باہر ہو گیا۔ اور لوہے کا گز اٹھا کر دیوانہ وار اس کی طرف پکا۔

”خبردار! اگر تم میری دکان پر چڑھے تو تمہاری نائکنیں توڑالوں گا۔ سالے حرای
نے ساری کراچی میں گندگی پھیلا رکھی ہے — جاؤ بھاگو یہاں سے، ورنہ ابھی پولیس کو
خبر کرتا ہوں، سالا دلّا۔“

سر شام دکان بند کر کے عبدالکریم سید حامی مسجد میں چلا گیا، اور دیر تک سجدے میں
پڑا بلک کروتا رہا۔ دعا کے کلمات رہ کر اس کی زبان پر آتے تھے۔ لیکن ہونٹوں پر
لرز کے رہ جاتے تھے۔ جیسے کوئی کبوتر اپنے آشیانے پر بار بار آئے اور اسے دیر ان پا کر
پھر پھرata ہوا اپس چلا جائے۔

شاید عبدالکریم سجدے میں پڑے پڑے ہی سو گیا۔ کیونکہ جب کسی نے اس کو ہلا
کر جگایا تو فجر کا وقت تھا۔ مکونڈن صبح کی اذان دے رہا تھا۔ نیند کے خمار میں عبدالکریم کو
یوں محسوس ہو رہا تھا کہ یہ اذان کی آواز نہیں، بلکہ دور کہیں بہت دور کوئی چیخ چیخ کر پکار
رہا ہے، کہ اب عائشہ آ رہی ہے۔ عائشہ آ رہی ہے، عائشہ آ رہی ہے۔“

غم جانان

شاعر: کیا لکھ رہے ہو؟
افسانہ نگار: خاک

شاعر: بڑا دلچسپ موضوع ہے۔ میں بھی کوشش کر رہا ہوں کہ اس زمین میں
کچھ فکر خن کروں۔

تصور: اپنا بھی یہی ارادہ ہے جب تک خاک کا تصور نہ کیا جائے۔ طبیعت کسی
رنگ پر متمنے ہی نہیں پاتی۔

شاعر: آؤمل کر خاک کی باتیں کریں
یا خس و خاشاک کی باتیں کریں

افسانہ نگار: تسلیمات! صاحبو، آپ دونوں گدھے ہیں۔

شاعر: واللہ! خوب یاد دلایا۔ ابھی کل میں نے ”نوائے خر“ کے ہام سے ایک
شاندار نظم کی ہے۔ بند عرض کیا ہے۔

مجھ سے پہلی سی مشقت میرے مزدور نہ مانگ
اور بھی کام ہیں دنیا میں مشقت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں بوجھ کی راحت کے سوا
تو جو مل جائے اکیلا تو دولتی جھاڑوں
خاک میں تجھ کو لانا کے تیرے کپڑے پھاڑوں
مجھ سے پہلی سی مشقت مرے مزدور نہ مانگ

تصور: میرا اگلا شاہکار بھی اسی حسین و جمیل چوپائے پر ہو گا۔ کیوب ازم کے

نظریات کے مطابق جو فنِ صلاحیتیں گدھے میں پائی جاتی ہیں وہ کسی دوسرے
جاندار میں نہیں ہیں۔

افسانہ نگار : میرا خیال ہے کہ گدھے کے بعد آپ حضرات بندروں پر طبع آزمائی
فرمائیں گے۔

تصور : بے شک۔ سر ریزم میں آرٹ کا کمال یہ ہے، کہ ہر سکھ کو اس کی
مرکزی حقیقت کے قریب ترین لایا جائے۔ حضرت انسان کی مرکزی اصلیت
کے نزدیک پہنچ کر بست واضح ہو جاتی ہے۔

شاعر : سرسوں کے ہرے کھیت میں اٹھائے بندریا
بیلوں کو بخت دیکھ کے اترائے بندریا
مکائے بندریا
شرمائے بندریا
بل کھائے بندریا ——

تصور : میں تو یہی رائے دوں گا کہ آپ اپنے فن کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو
اپنے افسانوں میں بندروں کو اس کام مناسب منصب ضرور دیجئے۔

افسانہ نگار : نہ صاحب مجھے بخشنے۔ میں ابھی اللہ کی نعمتوں سے اس درجے
محروم نہیں ہوا کہ بندروں کی طرف رجوع کروں۔

تصور : خیر، آپ کی مرضی۔ صحیح رائے دینا میرا فرض تھا۔ اگر آپ کو بندروں
سے دلچسپی نہیں، تو مینڈک اور مرغ بھی بڑے شاداب موضوع ہیں۔

شاعر : مرغ پر اس خاکسار نے ایک مسدس کھا تھا۔ ٹیپ کا بند ملاحظہ فرمائے۔

صحیح دم خواب سے دنیا کو جگائیں تو ہم
نیند کے ماتوں کو سمجھیر سنائیں تو ہم
تیرے گھر بار کی رونق کو بڑھائیں تو ہم
تیرے والان کو بیٹوں سے سجائیں تو ہم
پھر بھی اٹھتے ہی چھری ہم پر چلائی تو نے
حیف یہِ رسم وفا خوب بھائی تو نے

افسانہ نگار : صاحبو، یہ بندر، گدھے، مینڈک اور مرغ آپ کو مبارک ہوں۔
مجھے ان حسین و جمیل موضوعات سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

شاعر: غالباً آپ نے داستان طرازی کا مشغله ترک کر دیا ہے؟

افسانہ نگار : جی نہیں۔ میں خدا کے فضل سے اب تک افسانے لکھتا ہوں اور خوب لکھتا ہوں۔

مصور: اگر آپ کو زندگی کے ان ٹھوس حقائق سے دلچسپی نہیں، تو شاید آپ الف لیلی کے شہزادوں، جنوں کے بادشاہ اور کوہ قاف کی پریوں کی کہانیاں لکھنے کے شوقین ہوں گے۔

افسانہ نگار : جی نہیں، خدا میری جیلہ کو سلامت رکھے۔ اس کے ہوتے ہوئے مجھے جنوں کے بادشاہ یا کوہ قاف کی پریوں کا سارا لینے کی مطلقاً حاجت نہیں۔

شاعر: ہائے کیا نام لے لیا خالمنے!

مصور: زندگی کے خوابیدہ تار جنجنحوڑا لے اس نام نے۔

شاعر: ہائے، کیا بات ہے جیلہ۔ ایک زمانہ تھا کہ اس کی رنگ برنگ چوڑیوں کی کھنک سے شعریت کے طوفان ابلجتے تھے۔

مصور: اس کے جسم کے اقلیدی خطوط اور ان کی گھنیمی بھوؤں کی سیاہ جھالریں میرے شاہکاروں کی معراج تھیں۔

شاعر: اس کی لانبی لانبی کرتک مل کھاتی ہوئی زلف کا تصور میری شاعری کی جان تھا۔

مصور: میں نے ان کی آنکھوں میں کاجل کی تحریر ابھارنے کی خاطرا پہنچنے فن کو کمال تک پہنچا دیا۔

شاعر: لیکن ہائے! جب سے جیلہ نے اپنی زلف دو ماکٹوا کر بودہ ہیڑ رکھ لے ہیں۔ میری شاعری مر گئی ہے۔

مصور: اب وہ اپنی جھالر دار بھویں استرے سے موئڈ کر ان کی جگہ سرے کی تی ہوئی کیسیں کھینچتی ہے۔ میرے شاعر میرا فن بر باد ہو گیا۔

شاعر: میرے پیارے افسانہ نویس، تم اس لذہ منڈ جیلہ پر جتنی کہانیاں چاہو لکھتے

رہو۔ اب اس میں میرے لیے کوئی کشش باقی نہیں رہی۔

افسانہ نگار : تم دونوں بڑے کور ذوق عاشق ہو۔ جس نکتے پر آکر تمہارا فن مر گیا ہے۔ وہاں سے میرے آرٹ کی ابتدا ہوتی ہے۔ اگر تم کو جیلہ کی رعنائیوں کو ایک نظر دیکھنا ہے، تو آؤ میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں ظلم ہو شریا کے نظارے دکھاؤں گا۔

شاعر : کہاں چلو گے؟

افسانہ نگار : بوث کلب۔

مصور : نہیں! مجھے وہاں جا کر ابکائیاں آتی ہیں۔ میں نے کئی مینے وہاں کی خاک چھانی ہے۔ اور جب کبھی وہاں جاتا ہوں، تو میرا جی چاہتا ہے کہ قصاب کی دکان پر لٹکتی ہوئی گوشت کی ننگی رانوں کی تصویر کشی کروں۔

افسانہ نگار : اگر تمہیں کچھے گوشت سے اس قدر نفرت ہے تو کوئی بات نہیں۔ میں تمہیں میزروپول کی رقص گاہ میں لے چلوں گا۔ وہاں جیلہ کے پچھلے بدن کو رنگیں غباروں کی طرح رقصان دیکھ کر تمہارا دل شاد اور روح منور ہو جائے گی۔

شاعر : میرے دوست! خدا کے لیے مجھے وہاں کی یاد نہ دلاو۔ وجدان کی تلاش میں وہاں کئی کئی راتیں جا گا ہوں۔ لیکن ہر بار وہاں جا کر میری شاعری کا جو ہر خاک ہو جاتا ہے۔ جب میں جیلہ کو نہیں خوشی ہر دوست اور ہر دشمن کے ساتھ باری باری دوش بدش، بازو بے بازو، سینہ بے سینہ رقص کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو میری شاعری میں رقیب رو سیاہ کا لطیف تخیل فنا ہو جاتا ہے۔

مصور : اب وہ میرے اسٹوڈیو میں ماذل بننے بھی نہیں آتی بلکہ فونو گرافروں کے پیچھے پیچھے بھاگتی ہے، تاکہ اس کی تصویریں اخباروں کے پچھلے صفحات پر شائع ہوں۔

شاعر : اس کے فلیٹ میں بھلی کی سمجھنی گئی ہوئی ہے۔ اور مجھے بھی دربان کی جھڑکیاں سننے اور اس کی منت سماجت کرنے کا موقع نصیب نہیں ہوتا۔

مصور : میرے نزدیک جیلہ کا وجود نیست و نابود ہو چکا ہے۔ اب میں اس کی یاد

میں اپنے آرٹ کو نئی نئی شاہراہوں پر چلا رہا ہوں۔ جب مجھے جیلہ کی خوبصورت اور سڑوں ٹانگوں کا خیال آتا ہے تو رنگوں کی آمیزش سے چونے اور سینٹ کے مضبوط ستون بناتا ہوں۔ جب مجھے اس کے حسین چرے کی یاد ستاتی ہے تو میں ایکسرے کے فونو کی طرح ہڈیوں کے ڈھانچے کی تخلیق کرتا ہوں۔

افسانہ نگارہ : صاحبو! مجھے تم دونوں کی حالت پر رحم آتا ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں جیلہ کی ایک بالکل نئی اور اچھوتی جھلک دکھاؤں گا۔

شاعر : میں خوب جانتا ہوں کہ اب تم ہمیں کسی ریفیوجی کا لونی چلنے کی دعوت دو گے۔

تصویر : میں وہاں ہرگز نہ جاؤں گا۔ میرے ذہر؟ کے سارے رنگ ختم ہو گئے ہیں۔ لیکن ہندوستان سے آنے والے ریفیوجیوں کی تعداد میں کسی نہیں ہونے پاتی۔ میرا آرٹ اس رفتار کا ساتھ دینے سے بالکل قادر ہے۔ میں اپنی بیکت تسلیم کرتا ہوں۔

شاعر : میں نے بھی اس کوچ کی ہیرا پھیری کی ہے اور کئی بار اسی تانک جھانک میں پنا بھی ہوں۔ ناصاحب، اب وہاں جانے سے میری توبہ ہی بھلی۔

افسانہ نگار : تم بڑے بزدل انسان ہو۔ میری طرف دیکھو۔ کتنی بار میں نے خود جوتے کھائے ہیں، لیکن میں ابھی تک ریفیوجیوں پر افسانے لکھنے سے باز نہیں آیا۔

شاعر : تمہارا کیا ہے۔ تم تو بے حیا ہو۔ ہر روز جوتے کھاتے اور پھر کپڑے جھاڑ کر افسانہ لکھنے بیٹھ جاتے ہو۔ لیکن شاعر کا دل بڑا نازک ہوتا ہے میرے یار۔ ذرا سی سخیں لکھنے سے یہ آگینہ نٹ جاتا ہے۔ تم شوق سے جا کر جوتے کھاؤ اور افسانے لکھو۔ میں یہاں بیٹھ کر ”اوٹ گاڑی“ پر اپنی نظم کمل کروں گا اور میرا دوست مصور لنگور کی لمراتی ہوئی باکنی زلف دوتا۔۔۔ توبہ معاف کیجئے گا، لنگور کی لمراتی ہوئی باکنی دم کی نقاشی کرے گا۔ آہا، سبحان اللہ کیا غصب کے شعر ہیں۔ عرض کیا ہے:

اونٹ پھر آیا دل راز! نہیں اونٹ نہیں
 یہ تو گاڑی ہے کمیں اور چلی جائے گی!
 ڈھل چکی رات بکھرنے لگا پاؤڈر کا غبار
 پھر پھڑانے لگے شانوں پر تراشیدہ بال

ریلوے جنکشن

”کتنی چھٹی پر آئے ہو؟ نثار نے چھوٹتے ہی بغیر کسی علیک سلیک کے پوچھا۔
”پندرہ دن کی۔“ میں نے جواب دیا۔

”بہت خوب۔ چلو اس بار تمہیں لاہور کی زمین دوز مال گاڑیاں دکھائیں گے۔“
ثار نے فیصلہ صادر کیا۔

”میں سیر کروں گا۔“ وہ کچھ دیر سوچ کر مشفقاتہ انداز سے کھاتا ہے۔ ”تم کہانیاں
لکھنا۔“

یہ لائجہ عمل ہم دونوں کے حسب فشا ہے۔ چنانچہ شام ہوتے ہی نثار مجھے مال روڈ
پر ایک ہوٹل میں لے گیا۔ ہوٹل کے لان پر ہم کمال بے حیائی سے ایک ایسی جگہ پر جا
ڈئے، جہاں پلے سے ایک دو ایڈیٹر، چند نامہ نگار، کچھ ریڈیو آرٹسٹ۔ کچھ ادیب اور چند
گرگ باراں دیدہ صورت کے سیاسی حضرات بر اجانب تھے۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ ایک
صاحب کو لڈٹی نوش جان فرم� رہے ہیں۔ یہ کو لڈٹی اس گرم چائے سے مختلف ہے جو
گریبوں میں ٹھنڈک پہنچاتی ہے اور جسے معمولی ذہانت کے انسان پیا کرتے ہیں۔ یہ
مشروب خاص لاہور کی ایجاد ہے اور دستور کے مطابق ایجاد کی ماں بھی ضرورت ہے۔ وہ
ضرورت پروپیشن کی وجہ سے اکثر حضرات کو پوشیدہ امراض کی طرح لاحق ہو گئی ہے۔

دانشوروں کی اس محفل پر پوٹ مارٹم کے کمرے کی فضا بڑی شدت سے چھائی
ہوئی ہے۔ قوم کی لاش سامنے نیبل پر دھری ہے اور ہر شخص اس کا کوئی نہ کوئی عضو ہاتھ
میں لیے بڑی چاک دتی کے ساتھ پوٹ مارٹم کرنے میں منہک ہے۔ روحانی، جسمانی،
ایمانی اور سیاسی امراض سے لے کر خود کشی کے نفیاٹی اسباب تک بڑی تندی سے

تشخيص ہو رہی ہے۔ علاج تجویز ہوتے ہیں۔ نخنوں پر گرام بحث ہو رہی ہے۔ میز پر کے پڑتے ہیں۔ کریاں الٹتے الٹتے پھتی ہیں۔ لیکن اس وقت کی ساری بیماریوں کا واحد علاج صرف اس چائے دانی میں ہے۔ جس میں کولڈٹی بڑی احتیاط سے محفوظ ہے۔ کولڈٹی والے صاحب پیالی سے منہ لگائے مزے مزے کی چسکیاں لے رہے ہیں اور اپنے ارد گرد کف درود، من مسیحاوں کے طوفان بد تمیزی کے باوجود بڑی لاتعلقی سے داغ کی ایک عشقیہ غزل گنگنا رہے ہیں۔

”آج سینما کا پروگرام ہے؟“ کولڈٹی صاحب نثار سے پوچھتے ہیں۔

”جی نہیں آج دوسرے پروگرام ہیں۔“ نثار میری طرف اشارہ کر کے دوسرے کے لفظ پر خاصاً زور دتا ہے۔

”ہوں!“ کولڈٹی صاحب عینک اتار کر مجھے سر سے پاؤں تک بڑے غور سے گھورتے ہیں۔ ”نثار تم نے ابھی ان کی کیا تعریف کی تھی؟ کس جگہ کے میونپل کمشنز ہیں یہ؟“

نثار تقدیر لگا کر ان کی صحیح کرتا ہے۔ ”میونپل کمشنز نہیں، بھائی یہ برخوردار ڈپی کمشنز ہے، ڈپی کمشنز۔“

کولڈٹی صاحب قطعی مرعوب نہیں ہوتے۔ ”ٹھیک ہے۔“ وہ بڑے منیانہ انداز سے فرماتے ہیں۔ ”اس نازک زمانے میں ایک آدھ ڈپی کمشنز کو ساتھ میں رکھنا کوئی معیوب بات نہیں ہے۔“

پھر وہ کمال شفقت کے ساتھ میری ڈھارس بندھاتے ہیں۔ ”برخوردار تم بے فکر رہو، میں لاہور میں تمہاری موجودگی سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کروں گا۔ انشاء اللہ۔“

”یہ بچہ لاہور کی زمین دوز مال گاڑیاں بھی دیکھنا چاہتا ہے۔“ نثار متوجہ بانہ گزارش کرتا ہے۔ ”یہ ان پر کہانیاں لکھے گا۔“

”تم کہانیاں بھی لکھتے ہو؟“ کولڈٹی صاحب اس انداز سے پوچھتے ہیں، جیسے کہانیاں لکھنا کوئی بست بڑا اخلاقی جرم ہو۔ ”کہاں لکھتے ہو؟“

میں نجالت سے منمنا کر ”نقوش“ ”سورا“ ”ساقی“ ”ہمایوں“ ”ابی دنیا“ وغیرہ کے

نام لیتا ہوں۔

”یہ رسالے کہاں چھپتے ہیں؟ میں نے تو نہیں دیکھے۔“ کولڈنی صاحب کی نظر میں میری ادبی پوزیشن گر جاتی ہے۔ وہ اپنی عینک دوبارہ آنکھوں پر لگا لیتے ہیں اور مشفقات انداز میں مجھے یہ رائے دیتے ہیں کہ اگر مجھے کہانیاں لکھنے کا اتنا ہی شوق ہے تو شمع، ڈارکنر اور چنگاری میں لکھا کروں۔ کولڈنی کا آخری پیالہ حلق میں انڈیل کروہ ان رسالوں پر اپنی گران قدر رائے کا اظہار بھی فرماتے ہیں۔

اس مختصری علمی و ادبی بحث کے بعد جب ہم ہوشی سے نکل کر ایک تانگے میں سوار ہوتے ہیں تو نثار اور کولڈنی صاحب کا تانگے والے سے تبادلہ خیالات شروع ہو جاتا ہے۔ تانگے والا بڑی مشتاقی سے اپنے فنون لطیفہ کا پرچار کرتا ہے۔

زمیندار اخبار کے عقب میں رہنے والی جو انگریزی بولتی ہے ۔۔۔ چوبھی والی، جس کا رنگ گورا اور بال سنری ہیں ۔۔۔ میو گارڈن والی، جو اسی سال میزک میں فیل ہوئی ہے ۔۔۔ گھوڑا ہپتال کے پاس والی جو تامنگیشکر کی طرح گاتی ہے ۔۔۔ ماڈل ٹاؤن والی جو ایک ہپتال میں نرس ہے ۔۔۔ لیکن نثار اور کولڈنی صاحب تانگے والے کے پر اپیگندے سے بالکل متاثر نہیں ہوئے۔

”تم سالے باسی کڑی کا ابال ہو۔“ کولڈنی صاحب خفا ہوتے ہیں۔ ”تم سے تو مزنگ کے اڈے کے تانگے والے ہزار درجہ اچھے ہیں۔“

تانگے والا مزنگ کے اڈے والوں کو فصیح و بلیغ گالیاں دے کر ڈرامائی انداز سے اپنا تازہ ترین شاہکار برآمد کرتا ہے۔ ”لڑکی کیا ہے صاحب، زرا آلو بخارا ہے۔ ابھی کالج میں پڑھتی تھی۔ نقط دو مینے سے اس لائن میں آئی ہے۔ اب تک صرف چار مرتبہ باہر گئی ہے۔ کالے خال پٹھان نے پورے سات سورپے دیے تھے۔ تمہاری خاطر سے دو سو میں منالوں گا۔ چلوں؟“

آلوبخارا کے نام سے نثار اور کولڈنی صاحب کی رال بھی بیکنے لگتی ہے۔ لیکن دو سورپے کا ذکر سن کر ان کے جبڑے لٹک جانتے ہیں۔ وہ دونوں امید افزا نظرؤں سے مجھے گھورتے ہیں۔ خاص طور پر کولڈنی صاحب کے انداز بڑی شدت سے لکار رہے ہیں۔ برخوردار دیکھو میں تمہیں اپنی । । । امت کا سنری موقع دے رہا ہوں۔ اگر تم اس وقت کام

نہ آسکے تو ڈپی کمشنر نہیں گھیارے ہو۔ لیکن میرے انداز ہیں کہ انہیں ترکی بہ ترکی جواب دیتے اور وہ مایوس ہو کر پھر اپنا جبرا لٹکا کر بیٹھ جاتے ہیں۔

اس خاموش کولڈ وار کے بعد موضوع خن بدل جاتا ہے۔ تانگے والا گھوڑے کو مخاطب کر کے ہمیں بڑی سمجھیں اور پچ دار گالیاں سناتا ہے۔ شمار اپنے جگری دوستوں کی تعریف کرتا ہے جو ضرورت کے وقت اس پر کئی ہزار روپیہ تک خرچ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ اور کولڈنی صاحب پاکستان کے جلد افسروں کی کینگنگی، نالائی اور بد دیانتی پر جی کھول کر تبصرہ فرماتے ہیں۔ یوں بھی رفتہ رفتہ کولڈنی اپنا رنگ دکھاری ہے اور جب تانگے والا گھوڑے کی وساطت سے ہمیں چند الوداعی گالیاں سنا کر ہیرا منڈی میں نو گزے کی قبر کے پاس اتار دتا ہے۔ تو کولڈنی صاحب کے پاؤں بڑی شدت سے لٹکھرا رہے ہوتے ہیں اور وہ "س" کو "ش" میں بدل کر بڑی خوش سگالی سے چوک میں کھڑے ہوئے پولیس کا نیشنل کو مخاطب کرتے ہیں۔ "شوپاٹی جی شلام جیتے رہو۔"

سپاہی نختنے پھیلا کر کولڈنی کے منہ کو قریب سے زور لگا کر سونگھتا ہے۔ "اچھا آج بھی خوب چڑھا رکھی ہے صاحب۔ پرمث کہاں ہیں؟"

کولڈنی صاحب فتح مند مرغ کی طرح چھاتی نکال کر اپنا ہاتھ میری گردن کی طرف بڑھاتے ہیں۔ غالبا وہ مجھے پرمث کے طور پر سپاہی کی خدمت میں پیش کرنے والے ہیں۔ لیکن میں نظر بچا کر کھک جاتا ہوں اور نو گزے کی قبر کی اوٹ میں جا چھپتا ہوں۔

مجھے غیر موجود پا کر کولڈنی صاحب کی چھاتی کا تناوڈھیلا پڑ جاتا ہے اور وہ اپنی شرت کی جیبیں ٹھوٹ کر پائچ روپے کا نوٹ کا نیشنل کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ کا نیشنل اس پرمث سے مطمئن ہو کر چلا جاتا ہے۔ شمار اور کولڈنی صاحب کی گرمی گفتار سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اس وقت ان کے درمیان میری ذات کا مسئلہ زیر غور ہے۔ وہ کچھ دیر میرا انتظار کرتے ہیں اور پھر غصے سے ایک طرف چل پڑتے ہیں۔

نو گزے کی قبر کے پاس زیادہ دیر ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں ہے کیونکہ وہی پرمث والا سپاہی اب مشتبہ نگاہوں سے بار بار میرا جائزہ لے رہا ہے۔ میں واپس لوٹنے کے لئے کوئی ایسا راستہ اختیار کرنا چاہتا ہوں جماں شمار کولڈنی صاحب اور پرمث والے کا نیشنل سے میرا سامنا نہ ہو۔ اس تلاش میں میں ہیرا منڈی کی بے شمار پچ در پچ گلیوں کے تانے

بانے میں الجھ جاتا ہوں۔ اس حمام میں سب نگے ہیں۔ گلیوں اور سڑکوں پر مژگشت کرتے ہوئے شاکین قدم قدم پر چیل کی طرح جھستے ہوئے دلال۔ دروازوں اور درپیوں میں گڑیوں کی طرح بھی ہوئی عورتیں۔ اپنے رنگ برنگ ملبوسات کے باوجود ساری مختلف الف نگی ہے اور ان کے جسم اور ازہان ایک ہی بے آواز سر پر بڑی ہم آہنگی کے ساتھ رقص کر رہے ہیں۔ فضا میں کچے گوشت کی بساند رچی ہوئی ہے۔ اور بڑی بڑی پادر کے تقمیموں کا اجتماعی نور گلیوں اور سڑکوں پر برص کے داغوں کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ مجھے رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ یہ عورتیں جو دروازوں اور کھڑکیوں میں گرد نہیں لٹکائے بیٹھی ہیں۔ یا ایک پھر سے اڑ جائیں گی۔ اور ابایلوں کی طرح اپنی چونچوں میں کنکریاں اخھا کر ساری دنیا کو اپنے زندگی میں لے لیں گی۔ لیکن عملی طور پر کنکریوں کی جگہ میری گردن پر چھپاک سے بلغم کا ایک بڑا ساغفلہ آگرتا ہے۔ جو ایک ادھ موئی سی عورت درتپے میں بیٹھی بڑے اطمینان سے کھنکار کھنکار کر نیچے تحک رہی ہے۔ میں اپنی گردن کو اس غلاظت سے پاک کرنے کی فکر کرتا ہوں۔ تو خدا کی خاص رحمت میری دست گیری فرماتی ہے اور ایک گلی میں مجھے مسجد نظر پڑتی ہے جس کے ایک دروازے پر کالی سیاہی سے "یا اللہ" اور دوسرے دروازے پر "یا محمد" لکھا ہوا ہے۔ یہ چھوٹی سی مسجد دو بلند و بالا عمارتوں کے درمیان بڑی بے کسی سے جکڑی کھڑی ہے۔ اندر پیشاب اور پاخانے کا تعفن ہے۔ ایک طرف نالی میں بیڑ کی چند خالی اور شکستہ بوتلیں اونڈھی پڑی ہیں۔ وضو کے لیے ایک پرانا حمام ہے جس کا پلنی لعاب دہن کی طرح کثیف ہے۔ باسی اور بڑے زوروں سے ہمک مارتا ہے۔ نہ جانے اس مسجد کو دیکھ کر میرے دل میں ریل کے انجن کا خیال کیوں آتا ہے، جو تیز رفتار سے چلتا چلتا اچانک پتھری سے اتر گیا ہو۔

ہیرامندی سے بھلکتا بھلکتا آخر میں شاہی مسجد میں آپنچتا ہوں۔ اور خدا کی کھلی فضا میں اطمینان سے زور زور سے سانس لینے لگتا ہوں۔ رات کے بارہ بجے بھی مسجد کے آس پاس کئی شاندار کاریں کھڑی ہیں اور ان کے ڈرائیور ادھر ادھر بے دلی سے بیٹھے اوگھ رہے ہیں۔ یہ شرفاء کی موڑیں ہیں جو اپنی بیگمات سے اجازت لے کر شاہی مسجد میں آہ نیم شبی یا اقبال کے مزار پر ہدیہ عقیدت پیش کرنے یہاں آیا کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مسجد کی چکنی سیڑھیوں پر اکثر ان کا پاؤں پھسل جاتا ہے۔ اور اڑھکتے اڑھکتے بے اختیار ہیرا

منڈی کے نہاں خانوں میں جاگرتے ہیں۔ اگر اقبال زندہ ہوتا تو مسئلہ جبوقدر کی ایک نئی تغیر منظوم کر سکتا تھا۔

شاہی مسجد کے عین مقابل پرانے قلعے کی وہ اوپھتی ہوئی عمارت ہے جس کے صدر دروازے پر پاکستان کا جھنڈا اسلامی سے لرا رہا ہے۔ اقبال کے مزار میں ایک چھوٹا سا بلب روشن ہے۔ بڑا بلب کچھ عرصہ ہوا چوری ہو گیا تھا۔ لاہور میں بھلی کے نئے بلب آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے۔ کیونکہ ان کی مانگ ہیرا منڈی میں بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ اقبال کے مزار کو ایک چھوٹے سے بلب پر ہی قناعت شعار ہونا چاہئے۔ مزار کے دروازے پر ایک آہنی قفل لگا ہوا ہے تاکہ عقیدت مند اندر گھس کر سوچ بورڈ نہ چڑا سکیں۔۔۔ باہر لان میں ہیرا منڈی کے اکاؤنٹا دلال بھوکے بھنکے راہیوں کے لیے خضر راہ کا کام دینے کے منتظر بیٹھے ہیں۔ ایک تانگے والا دو آنے میں داتا کے دربار پہنچانے کا اعلان کرتا ہے اور میں چاک کر اس میں سوار ہو جاتا ہوں۔ تانگے میں ضلع جملم کے دو مقدمہ باز بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ دن بھر مقدموں اور پکھریوں کی زحمت کے بعد وہ گھڑی دو گھڑی دل بسلانے کے لیے ہیرا منڈی آگئے تھے اور اب حضرت دامتکنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے آستانہ پر سلام کرنے جا رہے ہیں۔

”کرتا تو سب کچھ اللہ ہی ہے۔“ ایک مقدمہ بازاپنے ساتھی سے کہہ رہا ہے۔

”لیکن بزرگوں کا سارا بھی بڑی چیز ہوتی ہے۔“

دوسرा مقدمہ باز بھی اس نظریے کی تائید کرتا ہے۔ اور اس روحاںی گفتگو کے بعد وہ دونوں سرگوشیوں میں ہیرا منڈی کے ذاتی تجربات پر تبادلہ خیالات کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

جمرات کی وجہ سے داتا صاحب کے دربار میں عورتوں، مردوں اور بچوں کا بے پناہ ہجوم ہے۔ کھوئے سے کھوا چھلتا ہے اور دربار کے صدر دروازے میں ثار اور کولڈنی صاحب ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چست کھڑے ہیں۔ ہجوم کے ہر ریلے کے ساتھ وہ خس و خاشاک کی طرح بستے ہوئے چلے جاتے ہیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے واپس آ کر صدر دروازے کے پیوند اپنی جگہ سنjal لیتے ہیں۔ میں ہر چند کوشش کرتا ہوں کہ ان کی نظر بچا کر ادھر ادھر ہو جاؤں، لیکن ثار مجھے دیکھ لیتا ہے اور زبردستی کھینچ کر اپنے پاس کھڑا کر

لیتا ہے۔ کوئی صاحب بھی میری پچھلی لغزشوں کو فراموش کر کے بڑے اخلاق سے پیش آتے ہیں اور داتا دربار کے ساتھ مسلمان عورتوں کی عقیدت مندی کے جملہ فوائد پر عارفانہ روشنی ڈالتے ہیں۔ اپنے پروگرام کے مطابق یہ لوگ اب یہاں سے مزونگ کے اڈے پر جائیں گے اور وہاں سے زمین دوز گاڑیوں کی دوسری منزل شروع ہو گی۔ لاہور نارتھ ویسٹرن ریلوے کا بہت بڑا جنگلش ہے۔ یہاں کی زمین دوز مال گاڑیاں، ہر سڑک، ہر گلی، ہر کوچے میں چلتی ہیں۔ جگہ جگہ سرخ بیوں کے نشان ٹھہراتے ہیں۔ لیکن ان بیوں کے باوجود کئی گاڑیاں کاٹا بدلتے بدلتے چوک جاتی ہیں۔ اور اکثر تصادم کے حادثات و قوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی تیز رفتار انجن چلتے چلتے پسزی سے اتر جائے تو اسے پھینک نہیں دیا جاتا بلکہ اس کی پیشانی پر اللہ اور رسول "کا نام لکھ کر اسے مسجد کے کام پر لگالیا جاتا ہے۔

سردار جسونت سنگھ

سردار جسونت سنگھ کے لیے حسن ابدال کی سرداری آئند کور کی بڑی لڑکی کے متعلق نامہ و پیام شروع ہونے والا تھا۔ لیکن جسونت سنگھ نے ہاں کرتا تھا نہ تھا۔ اس کی وجہ سے بڑی نازک اور پیچیدہ صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ گھر کے علاوہ ساری اہلوالیہ برادری میں اس پر کافی اضطراب تھا۔

سردار جسونت سنگھ اپر اپنے کمرے میں بیٹھا انگریزی موسيقی کے چند نئے ریکارڈ بجا رہا تھا۔ نیچے والان میں سردار گور دیال سنگھ روز نامہ گور و گھنٹاں کے مطالعہ میں مشغول تھے۔ سردار جسونت سنگھ کی ماں اپنے بڑے بچے کی اس بے راہ روی پر بڑا خشگیں تبصرہ کر رہی تھیں اور کوشلیا نامیت ہمت سے کام لے کر بھائی کی وکالت کر رہی تھی۔

”بھابو جی!“ کوشلیا نے اپنی ماں سے شکایت کی۔ ”آپ تو یونہی غصے میں آ جاتی ہیں۔ بھرا تماجی نے آخر کون سا ایسا جرم گردیا ہے۔ کہ آپ اتنے دنوں سے ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑی ہوئی ہیں۔“

”ہاں، ہاں جی۔ میں تو اس کی دشمن ہوں نا۔“ بھابی جی نے ڈانٹ پلانی۔ ”ایک تم ہی رہ گئی ہو اس کی ہمدرد۔ وہ جوتے لگاؤں گی کہ مزاج درست ہو جائے گا کالے منہ والے کا۔“

”ہائے بھابو جی۔ کچھ تو خیال کجھے۔ پڑھا لکھا جوان بیٹا ہے۔“

”آگ لگے، ایسی پڑھائی لکھائی کو۔ خبر نہیں ولایت میں کیا کیا کالا علم سیکھ کر آیا ہے۔ میں نے تو پسلے کہا تھا کہ اتنے پاؤں نہ پھیلاؤ۔ لیکن تمہارے بھائیا جی پر تو ولایت کا بھوت چڑھا ہوا ہے۔ اب روتے رہو، آنکھوں پر ہاتھ رکھ کے، ہاں۔“

”بھابوجی، آخر کون سی ایسی آفت آگئی ہے۔ شادی بیاہ کی بات ہے۔ بھرا تاجی کی بات سننے میں آخر ہرج ہی کیا ہے؟“

”میں نہیں جانتی کہ کیا حرج ہے اور کیا نہیں۔ اب کل کو تمہاری بات چیت ہو گی تو تم بھی بات کرنے بیٹھنا۔ بے شرم کیس کے۔“

”اوہ ہو۔ بس بھی کرو۔“ سردار گور دیال سنگھ زچ ہو کر بولے۔ ”مجھے ذرا اخبار تو پڑھنے دو۔“

”بس تم اخبار ہی پڑھتے رہنا۔ جیسے بڑی سرداری بیٹھ کر تمہارا انتظار ہی تو کرتی رہے گی۔“

”نہیں انتظار کرتی“ کرے۔ میں کب ہاتھ جوڑ کر اس کے پاس گیا تھا۔

”اے ہے، واگھرو مہاراج سے ڈرو۔ لڑکیوں والوں کے متعلق ایسی بات نہیں کیا کرتے۔ ذرا اپنی طرف بھی دیکھ۔ لاٹھ کی لاٹھ جوان بیٹھ بیٹھی ہے۔ واگھرو مہاراج سے ڈر کر رہو۔“

”تم تو یونہی مغز کھاتی رہتی ہو۔“

”میں مغز نہ کھاؤں تو کیا کروں۔ آخر کیا کھوٹ ہے، بڑی سرداری کی بیٹی میں؟ میموں جیسی رنگت ہے۔ ناک ہے۔ نقشہ ہے۔ روپ ہے۔ جب ملتی ہے پاؤں چھو کر ملتی ہے۔ پڑھی لکھی ہے اور پھر حسن ابدال میں آموں کے دو باغ اور تین چاہی مربع بھی اس کے نام لگے ہوئے ہیں۔“

”لیکن شاید وہ بھرا تاجی کو پسند نہ ہو۔ کوئی زبردستی تھوڑی ہے۔“ کوشلیا نے احتجاج کیا۔

”پسند کیوں نہ ہو؟ یہ لاث صاحب کا بچہ اور کیا انگتا ہے؟ کوئی میم بھی نہ لے آیا ولایت سے، ہاں۔“ بھابوجی بڑے غصے میں تھیں۔

بھابوجی واگھرو کا شکر کرو، کہ کوئی میم دیم نہیں آگئی۔ اگر آ جاتی تو ساری عمر کا رونا پیٹنا پڑا رہتا گھر میں۔“ کوشلیا نے کہا۔

”اب کون سی نہی خوشی ہے یہاں۔ میرے تو بھاگ ہی ایسے ہیں۔ بڑی سرداری سے ناطہ نٹے گا تو میرا، برادری میں تھو تھو تھی تھی ہو گی تو میری۔ یہ تمہارے بھائیا جی تو

جیسے نہ لینے میں ہیں نہ دینے میں۔ ”بھابو جی نے اب سردار گوردویال سنگھ کی طرف توجہ مبذول کر لی۔ وہ بدستور روزنامہ ”گورو گھنٹاں“ کے مطالعہ میں منہک تھے۔ آج کے پرچے میں شروع منی اکالی ذل گوردوارے پر بندھک کمیش اور — کی سیاسی کارروائیوں پر بڑی گرامکرم بحث تھی۔

سردار جسونت سنگھ کی ماں نے جب دیکھا کہ اس کے الفاظ کی سختی یا نرمی سے سردار گوردویال سنگھ کے کان پر جوں تک بھی نہیں رینگی۔ تو اس نے حسب معمول اپنا آخری حریہ استعمال کرنا شروع کر دیا جو جو خاص ایسے نازک موقعوں کے لیے محفوظ رہتا تھا۔ اپنی قسمت کی خرابی، اولاد کی ناخلفی اور خاوند کی ظالمانہ بے توجی پر پنجابی زبان کے مخصوص محادروں، بندشوں اور ترکیبوں کے ساتھ اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو بھی گرنے لگے۔

سردار گوردویال سنگھ بدستور اخبار ”گورو گھنٹاں“ کے مطالعہ میں مصروف رہے۔ اور جب ان کی بیوی کی گریہ و زاری نے ایک مستقل ہنگی کا رنگ اختیار کر لیا تو اپنے معمول کے مطابق انہوں نے اخبار کو تمہ کر کے تکنیک کے نیچے رکھا۔ عینک اتار کر چڑے کے کیس میں حفاظت سے بند کی۔ اور چارپائی پر اکڑوں بیٹھ کر اپنی زوجہ محترمہ کی طرف متوجہ ہوئے۔

”میں نے کہا بھاگوان یہ کیا ملتا ہے؟“

”ہاں جی، میری تو ہربات ملتا ہوتی ہے۔“ بھابو جی نے تک کر کہا ”تم اخبار پڑھتے رہو۔ تمہیں کیا واسطہ گھر بار سے۔“

سردار گوردویال سنگھ مسکرائے۔ ”بھاگوان، گھر بار تو سب تمara ہے، مجھے اس کی فکر کیوں ہو۔ ہاں، اب بتاؤ بات کیا ہے۔“

”ہائے ہائے۔ ابھی تک کوئی بات ہی نہیں ہوئی؟ جیسے کچھ سنا ہی نہیں تم نے۔“

”سن تو لیا۔ لیکن اگر لڑکا راضی نہ ہو تو بھاگوان تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کر سکتا ہوں؟“

”ہائے جی، تم کچھ نہیں کر سکتے؟ پاؤں سے کھول کر دس جو تے لگا دو تو وہ کالے منہ والا اپنے آپ سیدھا ہو جائے گا۔“

کوشلیا اب تک خاموش بیٹھی تھی۔ جسونت سنگھ کے بارے میں یہ تجویز سن کروہ

گھبرا گئی اور سردار گور دیال سنگھ سے کہنے لگی۔ ”دیکھو نا بھائیا جی! یہ بھابو جی کیا کیا باتیں کرتی ہے۔ بھلا بھرا تایجی کو مارتے آپ اچھے لگتے ہیں؟“

سردار گور دیال سنگھ کو یہ منظور نہ تھا کسی وقت ان کی اولاد کو خیال بھی آئے کہ وہ اپنے والد بزرگوار کے جو توں کی زد سے باہر ہیں۔ اس لیے انہوں نے کوشلیا کو ذرا سختی سے جھڑک دیا۔ ”کوشلیا بیٹی۔ ڈنڈا استاد ہے بگڑیاں تکڑیاں دا! دیکھنا کہیں تمہارا بھرا تایجی اس خیال میں نہ رہے، کہ اس کے منہ پر دو بال اُگ آئے ہیں، تو میرے جو توں کے تلے بھی بے کار ہو گئے ہیں۔“

”ہاں جی، ذرا دیکھو،“ بھابو جی نے لقمہ دیا۔ ”اب یہ بھی بیچ میں بولنے لگی ہے، بڑی آئی ہے بھائی کی دکیل بن کر۔ میں کہتی ہوں اس کا نام بھی کانج سے کٹوا لو۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں سرپکڑ کر رونا پڑے،“ ہاں۔“

”اجی چھوڑو اس بک کو۔“ سردار گور دیال سنگھ تعلیم کے سلسلے میں بڑے روشن خیال باپ تھے۔ ”تم بھی کیا گنواروں ایسی باتیں کرنے لگتی ہو۔ آخر کچھ بتاؤ تو سی، کہ جسونت کتنا کیا ہے؟“

”میں کیا بتاؤں؟ میں تو گنوار ہوئی نا۔“ بھابو جی نے نخڑہ کیا۔

”تمہارے سامنے بیٹھی ہے پڑھی لکھی لاڈلی۔ اسی سے کیوں نہ پوچھ لو۔“

”کوشلیا بیٹی تمہاری بھابو کا تو سرپھر گیا ہے۔ تمہیں کچھ معلوم ہے کہ آخر جسونت سنگھ کا خیال کیا ہے؟“

”بھائیا جی۔“ کوشلیا نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کے، ڈرتے ڈرتے چکچاتے چکچاتے کہا۔ ”بھرا تایجی کہتے ہیں کہ نہ میں لڑکی کو اچھی طرح جانتا ہوں نہ لڑکی مجھ سے پوری طرح واقف ہے۔ میں اس شادی کی حامی کیسے بھروں۔“

اس ناؤھو خاں کے سالے کو ایسی لڑکی کہاں سے ملے گی جسے وہ اندر باہر سے خوب جانتا ہو؟ سنتی ہو کوشلیا کی بھابو۔ یہ تمہارا لال کیسی منطق بگھارنے لگا۔ ”سردار گور دیال کو اپنے بیٹی کی اس بات پر بڑا غصہ آیا۔

”میں تو کب سے اپنا سرپیٹ رہی ہوں۔ لیکن تم ہو کہ کوئی بات مزاج میں ہی نہیں لاتے۔ میں کہتی ہوں کہ وس جوتے لگا دو تو سارے مل نکل جائیں گے۔“

”بھائیا جی“ کو شلیا نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ ”اس میں غصہ کھانے کی کیا بات ہے بھلا؟ بھرا تاجی کہتے ہیں کہ ولایت میں کورٹ شپ کا جو رواج۔“
 یک ایک فنا میں ایک پٹاخہ سا چھٹا۔ اور سودا اگر گوردیال سنگھ سانپ کی طرح پھنکار کر کھڑے ہو گئے۔ یہ انداز اس بات کی تمیید تھے کہ اب سردار گوردیال سنگھ اپنے ایام تحصیلداری کے تجربات کا نچوڑ کام میں لانے والے ہیں۔ پہلے انہوں نے کھڑے ہو کر ولایت اور ولایت والوں کے متعلق بڑے شدید خیالات کا اظہار کیا۔ پھر جسونت سنگھ کی ماں کی سات پیتوں کو بڑے وسیع پیانہ پر گالیاں دیں اور اس کے بعد جوتا ہاتھ میں لے کر وہ جسونت سنگھ کے کمرے کی طرف لپکے۔ عین اس وقت باہر گلی میں موڑ سائیکل کے اشارٹ ہونے کی پھٹ پھٹاہٹ سنائی دی اور جسونت سنگھ جو اوپر اپنے کمرے میں بیٹھا ساری کارروائی کا جائزہ لے رہا تھا، موقع کی نزاکت بھانپ کر فرار ہو گیا۔ اب بھائیا جی اور بھابو جی کی مجموعی توجہ غریب کو شلیا کی طرف رجوع ہو گئی۔ ان دونوں نے مل کر کو شلیا کو بڑے آڑے ہاتھوں لیا۔ اور ان کے غھے کی تان آخر اس فیصلے پر آ کے نوٹی کہ کو شلیا کا نام کالج سے کٹوا دیا جائے۔ تاکہ کل کلاں جب اس کے رشتے کی بات چیت شروع ہو تو کہیں وہ بھی اپنے بھائی کے نقش قدم پر چل کر کورٹ شپ کا سوال نہ اٹھائے۔

”خریزوں کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے بھاگوان۔“ سردار گوردیال سنگھ نے اپنی الہیہ محترمہ سے اتفاق کیا۔ ”اس سے تو تم جیسی گنوار عورت ہی اچھی۔“
 ”ہاں جی، ہاں! میں تو گنوار ہوں نا، بس بیٹھے رہو ڈھکے ہوئے۔ اپنی اوقات سے بڑھنا اچھا نہیں ہوتا۔ اب دیکھ لو اپنی اولاد کے لمحن۔ ساری الہو والیہ برادری میں ناک نہ کٹ گئی۔ تو دیکھنا، ہاں۔“

”بس اب یہ ٹرٹنڈ بھی کرو۔ میں نہیں ڈرتا سالی برادری سے۔ رہی جسونت سنگھ کی بات۔ میں جوتے مار مار کر اسے تکلے کی طرح سیدھا کر لوں گا۔ ایک گلاں ٹھنڈی لئی کا پلاو۔ برف منگو؛ لیتا بازار سے۔“

سردار گوردیال سنگھ نے لئی پی کر اپنا غصہ ٹھنڈا کیا۔ بھابو جی نے تازہ مکھن کا پھاہا تالو پر رکھا۔ کو شلیا اپنے کمرے میں بستر پر پڑی ساری رات روئی رہی۔ جسونت سنگھ گورڈن کالج کے ہوٹل میں تلوچن سنگھ کے کمرے میں بیٹھا اپنی کورٹ شپ کا لائچے

عمل مرتب کرتا رہا۔

سردار جسونت سنگھ کو حسن ابدال کی سردارانی کی بڑی لڑکی کوئی خاص ناپسند نہ تھی۔ ولایت جانے سے پہلے اگر یہ پیام آتا تو غالباً وہ خوشی سے پاگل ہو جاتا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر گوردوارے کے صحن میں سرکے میل کھڑا ہو کر بکرے بلاتا۔ لیکن اب اصولی طور پر وہ اس رشتے کو ایک بے زبان جانور کی طرح چپ چاپ قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ ولایت میں کورٹ شپ کی رسم نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔ اسی اثر کے تحت اسی نے اپنی بہن کو شلیا اور تلوچن سنگھ کے عشق میں بڑا مہذبانہ دخل دینا شروع کر دیا تھا۔ اور اپنے لیے بھی وہ اس بات کا متنقی تھا کہ شادی سے پہلے وہ اپنی منتخب لڑکی کے ساتھ کچھ عرصہ کورٹ شپ کرے۔ آج گھر میں اپنے بھائیاں جی اور بھابو جی کے ذہنی اور جسمانی انداز دیکھ کر اسے یقین ہو گیا تھا، کہ چاہے وہ سیدھی طرح مانے یا الٹی طرح، اگر اس کی شادی ہو گی تو حسن ابدال کی بڑی سردارانی کے گھر ہو کر رہے گی۔ بھائیا جی کو اگر کورٹ شپ والی شرط معلوم نہ ہوتی، شادی وہ اس شادی پر زیادہ زور نہ دیتے۔ لیکن بھابو جی کے سرپر جو آموں کے دو باغات اور تین چاہی مربعوں کا بھوت سوار تھا۔ اس کے اترنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔

اپنی مجبوریوں کے اس ماحول میں سردار جسونت سنگھ کو روشنی کی صرف ایک کرن نظر آتی تھی۔ وہ یہ تھی کہ حسن ابدال کی بڑی سردارانی کے ہاں چار لڑکیاں ہونے کی وجہ سے اس کا دائرہ انتخاب کافی وسیع ہونے کے امکانات تھے۔ اگرچہ ابھی بات چیت صرف بڑی لڑکی کے متعلق چلی تھی۔ لیکن اسے یقین تھا کہ اگر اس کی نظر انتخاب پھسلنے پر آمادہ ہوئی تو پہلی سے دوسری، دوسری سے تیسری اور تیسری سے چوتھی لڑکی پر کہیں نہ کہیں ضرور ایک جائے گی۔ اسے انگریزی کا ایک مقولہ یاد آیا جو اس نے لندن میں سو ہو کے ایک ریستوران میں کسی سے سنایا۔ ”اگر تمہارے سامنے ایک لڑکی ہے تو تم اپنا دل کھو بیٹھو گے۔ اگر تمہارے سامنے دو لڑکیاں ہیں تو تمہارے دل اور دماغ دونوں کھو جائیں گے۔ اگر تین لڑکیاں ہیں تو جان کی بھی خیر نہیں۔“

”میرے یار،“ سردار جسونت سنگھ نے تلوچن سنگھ کے کندھے پر ہاتھ مار کے کہا۔ ”یہاں پر تو ایک ساتھ چار چار ہیں۔ بس یہ سمجھو کہ اب میرے دل و دماغ، لیکھی،“

بیکھڑے اور گروں کی بھی خیر نہیں۔“

ان سب Calculation کے بعد سردار جسونت سنگھ نے حسن ابدال کی بڑی سرداری کی بڑی لڑکی کے نام انگریزی میں ایک Formal خط لکھا:

محترم خاتون!

”آپ کے اور میرے خاندانوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ نظام عالم کو برقرار رکھنے کے لیے یہ لازمی ہے کہ ان کا رابطہ ایک شادی سے مسحکم کیا جائے۔ اس خدمت کے لیے انہوں نے آپ کو اور مجھے منتخب کیا ہے۔ اصولی طور پر میں Arranged شادیوں کے حق میں نہیں۔ اگر اعلیٰ تعلیم نے آپ پر کچھ اثر کیا ہے تو غالباً آپ کا بھی یہی خیال ہو گا۔

کورٹ شپ کے ایک لفظ نے ہمارے گھرانے میں کرام مجا دیا ہے۔ میں آپ کو یہ لفظ دہرانے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ مبادا کہ آپ کی والدہ محترمہ پر بھی وہی ذہنی اور اعصابی رد عمل ہو جو میرے بزرگ والدین پر گزر چکا ہے۔ اگر آپ اسے نامناسب نہ سمجھیں تو ہم کچھ عرصہ آپس میں خط و کتابت کر کے کورٹ شپ کا فرم البدل پاسکتے ہیں۔ اگر میں آپ کی دائی رفاقت کا اعزاز حاصل نہ کر سکوں تو براہ میریانی مجھے اپنی چھوٹی بہنوں کے ساتھ قسمت آزمائی کا موقع عطا فرمائیے۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں۔ نظام عالم کی سلامتی کے لیے یہ نہایت ضروری نظر آتا ہے کہ ہمارے معزز خاندان آپس میں شادی کی زنجیر کے ذریعے مسحکم ہو جائیں۔ اس زنجیر کی ایک کڑی یہ خاکسار ہے۔ دوسری کڑی فراہم کرنے کے لیے آپ چاروں میں سے ایک کو اپنی قربانی دئنا ہو گی۔“

خدا حافظ

آپ کا وفادار

جسونت سنگھ

نمبر پلیز

بہت سے لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ جب ٹیلی فون کے تاروں میں ایک نغمہ سالہ راتا ہے۔ جب ریسیور میں ایک پائلی ناچتی ہے تو وہ زوبی کی آواز ہوتی ہے۔ جس وقت وہ سوچ بورڈ کا بیٹن دبا کر ”نمبر پلیز؟“ پوچھتی ہے تو بہت سے صاحب دل نمبر بتانے کی جگہ درد دل، درد جگر اور غمِ جانش کی داستان سنانے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ زوبی کی آواز میں ایک عجیب پیار، ایک عجیب سوز، ایک حسین بے تکلفی ہے۔ جو سننے والوں کے درد ہائے نہایت کو بے ساختہ چھیڑ دیتی ہے اور انہیں دعوت دیتی ہے کہ مجھے اپنا غم بتاؤ، مجھے اپنے زخم دکھاؤ۔ شاید کہ میں تمہارے کام آسکوں۔ ٹیلیفون کے تاروں میں زوبی کی آواز یوں چھن کر آتی ہے۔ جیسے رستے ہوئے زخموں اور جلتے ہوئے ناسروں پر الڑاوا تک شاعریں پڑ رہی ہوں۔ لیکن ستم طرفی تو یہ ہے کہ ادھر زوبی نے پوچھا ”نمبر پلیز؟“ اور ادھر نمبر کی جگہ نام بتایا گیا۔ اور نام کے بعد فرمائش ہوئی کہ ”ڈارلنگ“ تمہارا پیارا نام کیا ہے؟ ”سوئیٹ“ تمہاری ڈیلوٹی کے بجے سے کے بجے تک ہوتی ہے؟ ”آج شام کچھ؟“ ایسے موقعوں پر زوبی سوچ بورڈ سے اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ اور پھر کئی کئی گھنٹوں تک ٹیلیفون کے تار اس کی آواز کی موسیقی کے بغیر ویران رہتے ہیں اور بنی نوع انسان ان بخشی شاعروں کی میجانی سے محروم ہو جاتی ہے۔

جس ایکچھیں میں زوبی کام کرتی ہے، وہاں ٹیلیفون کے کوئی سات سوا سات سو نمبر ہیں۔ ٹیلیفون آپریٹروں کی تعداد چھ ہے۔ دو مرد اور چار لڑکیاں۔ زوبی کے علاوہ مس پروین اور مس ڈی سوزا جوان اور خوبصورت لڑکیاں ہیں۔ چوتھی کا نام مس پری جمال ہے۔ مس جمال کے نام میں جو لطافت ٹلاش ہے، وہ صریحاً ”جھوٹ ہے۔ دھوکہ ہے“

فریب ہے۔ نہ تو وہ مس ہے۔ کیونکہ اس کی شادی ہوئے بارہ برس ہو چکے ہیں۔ اور وہ دو لڑکوں اور تین لڑکوں کی ماں ہے۔ نہ ہی اسے کسی زاویہ خیال سے پری کہا جا سکتا ہے اور جمال اگر اس کے شوہرن ادار کا لقب ہو تو خیر، ورنہ وہ جمال سے بھی اتنی ہی دور ہے، جتنی کوہ قاف سے۔ تاہم اسے اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔ اور ابھی تک کسی نے محکمہ ٹیلیفون کے پاس اس امر کے خلاف احتجاج نہیں کیا۔ ان چاروں کے علاوہ ایک چینج میں دو مرد ہیں۔ ان کی حیثیت اخباری ٹیلیفون کی ہی ہے۔ چنانچہ جب تک کوئی خاص حادثہ درپیش نہ آئے۔ ان کا وجود بے کار اور بے سود سارہتا ہے۔ دن بھر وہ اپنے اپنے سوچ بورڈ کے سامنے بیٹھے کرپان چباتے ہیں۔ بیڑی پیتے ہیں۔ لڑکوں کو گھورتے ہیں۔ اور کبھی کبھی مس پری جمال کے ہونے والے چھٹے بچے کا نام منتخب کرنے میں بھی مدد دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک تیرتھ رام فیروز پوری کے ترجمہ کیے ہوئے جاسوسی ناول پڑھنے کا شوقین ہے اور دوسرا اپنے فرصت کے لمحات میں تعزیرات ہند کی ایک کہنہ سال، بوسیدہ جلد کا مطالعہ کیا کرتا ہے۔ یہ بات نہیں کہ خدا نخواستہ اسے کسی کچھری و چھری سے واسطہ پڑتا ہے یا پڑنے کا احتمال ہے۔ بلکہ وہ ٹیلیفون کے نمبروں کا تعزیرات ہند کی مختلف دفعات سے مقابلہ کرنے کا بے حد شوقین ہے اور اس عمل سے اسے ٹیلیفون والوں کے ماضی، حال اور مستقبل کے متعلق حیرت انگیز انکشافات کرنے میں یہ طویل حاصل ہے۔

علمِ ہند سے کی یہ نئی صنعت ایک چینج والوں کا محبوب مشغله ہے اور اس کی مدد سے انہوں نے بہت سے معززین شر کے جسمانی، دماغی، جنسی اور روحانی رنجات کی نسبت عجیب و غریب نظریات قائم کر رکھے ہیں۔ چنانچہ ٹیلیفون نمبر ۱۲۳۷۸۴۱۲ والے قاضی ابوالحسن برکات جو مسجدوں میں شریعت لاء کے متعلق لیکھر فرماتے ہیں۔ ان کے متعلق یہ پیشین گوئی ہے کہ وہ کسی روز خطبہ بغاوت ارشاد فرمانے کے بعد کالے پانی کی راہ لیں گے۔ چودہ ری عبد العزیز ڈسٹرکٹ سول افسر کو بے تکلفی سے رشوت لینے کا حق پہنچتا ہے۔ کیونکہ ان کے ٹیلیفون کا نمبر ۱۲۳۷۸۴۱۲ ہے اور نمبر والے سردار حشمت اللہ خاں سوز اپنی خوبصورت سُرخ سنگر کار میں جو ہر روز ایک نئی حسینہ اڑائے پھرتے ہیں۔ وہ یقیناً دوسرے لوگوں کی بیویاں ہوتی ہوں گی!

اسی طرح ٹیلیفون نمبر ۱۲۳۷۸۴۱۲، ۳۲۰۴۷۳۷۸ والے بزرگوں کی نسبت بھی رسیرج کے

وسع امکانات موجود ہیں۔ لیکن جس وقت نمبر ۳۰۲ کی باری آتی ہے تو ایک چیخنے کی جیوری میں شدید اختلاف رائے پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ ٹیلیفون نمبر ڈاکٹر نیمہ اختر کے نرگس ہوم میں نصب ہے اور تعزیرات ہند کی رو سے اس پر قتل کا جرم عاید ہونا چاہیے۔ مس پری جمال کا خیال ہے کہ یہ ٹیلیفون نمبر غلط جگہ لگا ہوا ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر مس نیمہ اختر تو بڑی شریف النفس، سلیقہ شعار، نیک دل خاتون ہے۔ مس پری جمال اپنی زوجی کے سینز اسی کے نرگس ہوم میں گزارا کرتی ہے اور اس نے وہاں کبھی کسی قسم کا گول مال نہیں دیکھا۔ البتہ اگر اسے شکایت ہے تو بھاری فیس کی ہے جو ہر بار اس بے چاری کی پیشہ توڑ کر رکھ دیتی ہے۔ اگر مس پری جمال کے کمر ہوتی تو یقیناً اس جگہ کمر ٹوٹنے کا محاورہ زیادہ فضیح ہوتا۔ لیکن حقائق کو زبان کی صحت پر قربان نہیں کیا جا سکتا! اس لیے اس کے بر عکس دوسرے مرد آپریٹر کی رائے ہے کہ ڈاکٹر مس نیمہ اختر کے ٹیلیفون پر ۳۰۲ کا نمبر یوں فٹ آتا ہے جیسے اس کے بدن پر ۳۸۱۷۶ چھاتی والا بلاوز یا اس کے پاؤں میں باتا کا ۵ نمبر والا سینڈل۔ یہ تفصیلات اس نے ڈاکٹر نیمہ کی پورن آیا سے بڑی کاوش سے فراہم کی ہیں۔ کیونکہ وہ اسی کے محلے میں رہتی ہے اور کبھی کبھی پانیزی کے لیے پیسے وصول کرنے، چوری چھپے اس کے ہاں بھی آ جایا کرتی ہے۔ اس آپریٹر کا نظریہ یہ ہے کہ ڈاکٹر مس نیمہ کو قاتل نہ سمجھنا بھی حد درجہ کی بے ذوقی اور کورڈاٹی ہو گی۔ کیونکہ، تیری آنکھیں نہیں یہ تو تیر ہیں! اور یہ مضرعہ گاتے گاتے اس کے منہ سے پانوں کی پیک میں خلپیدہ رال پک کر منشی تیرتھ رام فیروز پوری کے نادلوں کو رنگیں سے رنگیں تر کرنے لگتی ہے۔ البتہ ڈاکٹر نیمہ کے نرگس ہوم اور اس کے سینئن ٹیلیفون نمبر کی رمز اگر کوئی سمجھتی ہے تو مس ڈی سوزا ہی پوری طرح سمجھتی ہے۔ کیونکہ ایک بار اس نے بھی چند ہفتے اس کی نرگس ہوم میں گزارے تھے اور اس نے یہ راز بڑی مشکل سے محض مس پر وین کو بتایا تھا۔ چنانچہ وہ دونوں اپنے اپنے سوچ بورڈوں پر جھک کر ایک دوسرے کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتی ہیں اور چکے چکے مسکراتی ہیں، جیسے موقع واردات پر ملزم کو پکڑ کر پولیس کا تھانیہ ار اپنی لانی لانی سخنی موچھوں کے درمیان کامیابی سے مسکراتے۔

زوبی ان قانونی موشگانیوں میں حصہ نہیں لیتی اور نہ ہی اسے دوسرے لوگوں کے

جسمانی اور روحانی غلافوں کے نیچے جھانکنے کا شوق ہے البتہ اسے اس امر پر ایک گونہ اطمینان ہے کہ ایک چیخنے کے نجومی آئے نمبر ٹیلیفون پر اپنی قانونی دور بینیں لگانے سے قاصر ہیں۔ ایک روز اس نے چوری چوری تعزیرات ہند میں دفعہ نمبر آئے تلاش کرنے کی کوشش کی، جیسے کوئی شریمنی کنوواری چھپ چھپ کر دیوان سے اپنے مگنیٹر کے نام پر فال نکالے لیکن زوبی نے دیکھا کہ یہ نمبر تو قانون کی دسترس سے بھی باہر ہے۔ ہر جرم سے پاکیزہ ہے۔ ہر الزام سے بری ہے۔ ہر گناہ سے بند ہے اور اس خیال سے اس کے گالوں پر کچھ فخر، کچھ حیا، کچھ سرور کی سرفی غازے کی طرح پھیل گئی۔ کچھ ایسی ہی سرفی، مس ڈی سوزا کے چہرے پر بھی نمودار ہوا کرتی ہے۔ لیکن اسی روز جب اس کے باپ سے بھی ہوئی رم کی بولت اس کے ہتھے چڑھ جائے یا اس کو کینے ہلال میں ڈانس اور تمبولا کے لیے جانا ہو۔ جس روز مس پر دین کے منہ پر گلابی ڈورے جھلک رہے ہوں تو وہ پکار پکار کر کہا کرتے ہیں کہ آج تار گھر کی سیڑھیوں پر ٹیلیفون سپرد ائر نے اسے زبردستی چوم لیا ہے مس پری جمال کے چہرے پر خون کی نمایاں گردش عام طور پر ایک نئے برخوردار کا پیش خیمه ہابت ہوتی ہے۔ لیکن جب زوبی کے گالوں پر شفق کھلتے، جب اس کے ہونٹوں پر گلاب کی پتیاں بکھر جائیں، جب اس کی آنکھوں میں کنول کے چھوٹے تیرنے لگیں تو آسمان کے فرشتوں اور جنت کی حوروں کے سوا اور کوئی نہیں پہچان سکتا کہ اس وقت ٹیلیفون نمبر آئے کے تار میں ایک نغمہ سالما رہا ہے۔ ایک پائل سی ناج رہی ہے اور زوبی اپنے سوچ بورڈ پر جھلکی ہوئی پوچھ رہی ہے: ”نمبر پلیز؟“

نمبر پتا تا ہے۔

زوبی نمبر دہراتی ہے۔

”شکریہ!“ وہ کہتا ہے۔

اور ان چار فقوں کے سحر سے ایک نئے آدم ایک نئی حوا اور ایک نئی جنت کی تحقیق کامل ہجو جاتی ہے۔ زوبی کو یقین سا ہو چلا ہے کہ یہ ٹیلیفون اسی جگہ ہے جہاں اسے ہونا ہی چاہئے جس طرح تعزیرات ہند والے آپ یہڑ کو یقین ہے کہ اگر اس میں ۸۶۷ نمبر والا ٹیلیفون بھی ہوتا تو وہ ضرور جامع مسجد میں نصب کیا جاتا۔

زوبی کا پورا نام زیدہ ہے۔ زیدہ رحیم بخش۔ زوبی محفوظ ہے تکلفی اور پیار کا نام

ہے۔ چونکہ پیشتر حضرات اس سے بے تکلف ہونے اور پار کرنے کے شدت سے قائل ہیں۔ اس لیے عموماً اسے زیدہ کی جگہ زوبی ہی کہا جاتا ہے۔ مخفی فاضل اور ادیب فاضل کے امتحان پاس کرنے کے بعد اس نے پرائیوریٹ میزک کیا۔ اور آج کل وہ ایف۔ اے کی تیاری کر رہی ہے۔ اسے کسی چیز سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ اور اس نے کبھی ٹیلیفون پر چوری چوری دوسرے لوگوں کی گفتگو سننے کی کوشش نہیں کی۔ چنانچہ اگر مس ڈی سوزا کھلم کھلا اپنے تجربات پر تبصرہ کیا کرتیں، تو غالباً زوبی کو ساری عمریہ معلوم نہ ہو سکتا کہ جس وقت خال صدر علی ٹیلیفون پر سیٹھ ہمت شاہ کی بیگم صاحبہ سے کچھ کہہ رہا تھا کہ ”آج آپ دونوں غریب خانہ پر کھانا تادول فرمائیں۔“ تو اصل میں اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ آج شام خالی ہے۔ سیٹھ صاحب دوسرے پر جا رہے ہیں۔ ”رات کے آٹھ بجے جم خانہ کے باہر انتظار کروں گا۔“ اسی طرح ٹیلیفون کی اصطلاح میں زکام کا مطلب درودل ہوتا ہے۔ مسجد میں سے سینما کا کام لیا جاتا ہے۔ گھر سے کلب مقصود ہے۔ لام جوس سے وسکی کا پہلو نکلتا ہے اور موسم کی گرمی سردی میں حسن یار کی باتیں ہوا کرتی ہیں۔ یہ باتیں اپنے دزدیدہ رومانوں کی توں قزح سے ایکچھی کی فضا کو رنگین کر جاتی ہیں۔ انھیں سُن کر مس پروین کی پلکیں اس کی آنکھوں پر بو جھل ریشمی پر دوں کی طرح گر جاتی ہیں۔ مس ڈی سوزا کے ہونٹ آتشدان کے سامنے پڑے ہوئے گدستے کی طرح تمازت کھا کر خشک ہو جاتے ہیں اور کسی وقت مس پری جمال بھی دم بھر کے لیے ایام زچھی کی عبرت انگیزیاں بھلا کر اپنے ماحول کی ترینگ میں بھہ نکلتی ہے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک ٹیلیفون نے دوسرے ٹیلیفون کو گلے لگانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے۔ ایک ریسیور نے دوسرے ریسیور کے ہونٹ چومنے کی کوشش کی تو اس وقت ایک قیامت سی آ جاتی ہے۔ ٹیلیفون کے تاروں میں بجلیاں سی کڑکنے لگتی ہیں۔ سوچ بورڈوں کی چاپیاں اُنجھنے لگتی ہیں اور مس ڈی سوزا اور مس پروین بے تاب ہو کر ایک دوسرے کے بلاوڑ تک تاز تار کر ڈالتی ہیں۔ کسی وقت مس پری جمال پر بھی رعشہ سا طاری ہونے لگتا ہے۔ لیکن زوبی پر ان طوفانوں کا کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔ یہ زبردست آندھیاں اس کے آنچل کو ذرا بھی نہیں ہلاتیں۔ وہ اپنے سوچ بورڈ کے سامنے بیٹھی رہتی ہے۔ اگرچہ یہ بھی ایک قانونِ خدا ہے کہ عورتوں پر نبوت کا نزول نہیں ہوتا۔ پھر بھی جب نمبراں پر لگا ہوا

چھوٹا سا برقی قلمہ ٹھہرنا لگتا ہے تو طور پر بھلی چمکتی ہے۔ زوبی موسیٰ کی طرح غش کھا کر
گر نہیں جاتی بلکہ مویقار آواز میں پوچھتی ہے۔ نمبر پلیز؟
وہ نمبر بتاتا ہے۔

زوبی نمبر دہراتی ہے۔
”شکریہ“ وہ کہتا ہے۔

اور زوبی دل میں سرشار ہو جاتی ہے۔

مس پروین کو اس نمبر سے چڑھتے ہیں، اور مس ڈی سوزا کو بھی۔ ان کا خیال ہے کہ
اس ٹیلیفون سے ہندی سے رنگی ہوئی داڑھی اور دانت صاف کرنے سے خلال کی بو آیا
کرتی ہے۔ اس ٹیلیفون کا مالک دن بھر گاؤں تکیہ کا سارا لیے پان چباتا ہو گا۔ اس کے پہلو
میں ایک یا دو یا شاید شرعی لحاظ سے چار بیگمات اپنا اپنا اگلان سامنے رکھے بیٹھی ہوں گی
— والان میں درجن بھر بچوں کی فوج کریما بہ بخشائے برحال ماکا ترانہ گاتی ہو گی اور وہ
ہر کوڑ پر شکریہ بسم اللہ ماشاء اللہ کی مہارت کرتا ہو گا — لیکن زوبی کے پردہ خیال پر
یہ نقوش کوئی نشان نہیں چھوڑتے۔ رات کے وقت جب وہ تار گھر کے عقب میں اپنے
چھوٹے سے کوارٹر میں ایف۔ اے کے امتحان کی تیاری کرتی ہے تو کبھی کبھی اس کا دماغ
ٹیلیفون کے تاروں کا سارا پکڑ کر نمبر لاے کی طرف رینگنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ طسمی
ہند سے اس پر طرح طرح کا سحر کرتے ہیں۔ کبھی وہ دُبِّت اکبر کی طرح جگگاتے ہیں۔ کبھی
ان پر کھکشاں کا نور برستا ہے۔ کبھی وہ تاریک دیر انوں میں کھو جاتے ہیں۔ اور زوبی بھٹکتی
جاتی ہے۔ گرتی جاتی ہے۔ ایک اندر ہے کنوئیں میں، ایک عمیق غار میں۔ اور کوئی معزز
فرشتہ اس کے دہانے پر وحی لے کر نازل نہیں ہوتا۔ کیونکہ عورتوں پر وحی کا نزول
لقاضائے خداوندی کے خلاف ہے۔

کچھ دنوں کی بات ہے کہ زوبی کے دل اور دماغ پر کچھ جیرانی، کچھ پریشانی کے میسم
سے سائے لرزنے لگے۔ نمبر لاے کئی روز سے خاموش تھا۔ اس ٹیلیفون کے پردہ ساز سے
جو روح پرور نغمے پیدا ہوتے ہیں، ان پر سکوت طاری تھا۔ اور اس کی خاموش کائنات کی
ساری رنگینیاں صابن کے بلبلوں کی طرح مت رہی تھیں۔ رات کے وقت جب زوبی
ایف۔ اے کے امتحان کی تیاری کرنے بیٹھتی تو اے کے سحر کار ہند سے بھوتوں کا روپ بھر بھر

کراس کی آنکھوں کے سامنے ناپنے لگتے ہیں۔ صبح سے شام تک وہ منتظر رہتی تھی کہ نہ جانے کس وقت سوچ بورڈ پر نمبر لائے پر لگا ہوا نخا ساتقہ روشن ہو کر ساری دنیا کو اپنے نور سے لبریز کر دے گا۔ لیکن وہ تجھی چمکی پر نہ چمکی۔ زوبی سوچتی تھی کہ شاید وہ چلا گیا ہو۔ شاید وہ بیکار۔ شاید۔۔۔ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان کی خیریت پوچھئے؟ ایک چھوٹی سی ہمدردی کوئی گناہ بھی تو نہیں۔ اگر مس پروین اور مس ڈی سوزا نے دیکھ لیا تو بے شک وہ بڑی بڑی باتیں بنائیں گی۔ اور مس پری جمال توحد سے جل بجھ ہی جائیں گی۔ تعزیزات ہند والا آپریٹر بھی زیرِ لب مسکراۓ گا۔ لیکن بلاسے۔ یہ بھی کوئی جرم ہے بھلا؟ اور آخر سوچ سوچ کر چکچاٹے چکچاٹے، کانپ کانپ کر زوبی نے سب کی نظریں بچا کر نمبر لائے کو ٹیلیفون کر رہی ڈالا۔ پلگ لگا کراس نے ریسیور اٹھایا اور دھڑکتے ہوئے دل سے گویا اپنی قسم کا فصلہ سننے لگی جو شاید ازل ہی سے لوح مقدس میں لکھا جا چکا تھا! اے نمبر ٹیلیفون کی گھنٹی بجئے گئی۔ جیسے نجد کے صحراء میں جریں ناقہ لیلا۔۔۔۔۔ یا جیسے کسی نے غفور الرحیم کی زنجیرِ عدل کو ہلا دیا اور ساتویں آسمان پر گھنیشاں نج رہی ہوں۔۔۔۔۔

”ہیلو“ ٹیلی فون نے کہا۔

”جی، معاف کیجئے، میں ٹیلیفون آپریٹر بول رہی ہوں۔“ زوبی نے اقبالِ جرم کیا۔

”کون آپریٹر؟“ ٹیلیفون کچھ حیران سا ہوا۔

”جی، زوبی۔ میرا مطلب ہے، زیدہ رحیم بخش۔“ اس کی زبان لڑکھ رائی۔

”ہاہاہا۔“ ٹیلیفون میں ایک بلند قلقہ صورِ اصرافیل کی طرح گونجا۔ ”گرینڈ گرینڈ۔

فرمائیے، فرمائیے۔“

زوبی کچھ حیران ہوئی، کچھ پریشان ہوئی۔ لیکن دل پر قابو پا کے اس نے کہنا شروع کیا۔ ”جی معاف فرمائیے۔ مجھے فکر ہوا۔۔۔ جی میرا مطلب ہے کہ آپ کا ٹیلیفون کئی روز سے خاموش تھا۔ میں نے سوچا کہ نصیبِ دشمناں کیسیں آپ کی طبیعت خراب نہ ہو۔ جی، محض انسانی ہمدردی کے۔۔۔۔۔“

”ہاہاہا۔“ صورِ اصرافیل اور بھی زور سے گونجا۔ ”میں سمجھا۔ تم شاید نصیر صاحب کے متعلق پوچھ رہی ہو۔ دیکھو مائی ڈیزئر، وہ تو یہاں سے تبدیل ہو چکا ہے لیکن خدا کی قسم!

میں اپنے دوست کی ساری ذمہ داریاں بعنوان شائستہ سنچال سکتا ہوں۔ ہا ہا۔ زوبی ڈارنگ، میں ٹھیک چھ بجے ایکچھنج کے باہر انتظار کروں گا۔ مائی گذ نیس گرے شش۔ وہاٹ اے لائف۔ وہٹ اے ڈیم گلوریس لائف۔۔۔۔۔

شام کے عین چھ بجے ایکچھنج کے دروازے پر ایک نیلے رنگ کی خوبصورت واشر بیوک آکے رکی اور رحمت ایزدی نے زوبی پر اپنا نور کامل کر دیا۔

سرخ فیٹہ

سیکرٹری : میرے خیال میں کارروائی شروع ہونی چاہئے۔ دیل، سپرنندنٹ صاحب آپ کیس کو وضاحت سے بیان فرمائیے۔

سپرنندنٹ : لیں سر، لیں سر! جناب کو غالباً یاد ہو گا کہ جب تائپٹ کلر مس سلیمہ کی تقری زیر غور تھی، تو خاک سار نے بعد ادب و احترام عرض کیا تھا کہ شاید یہ تجربہ منگا پڑے۔ ذاتی طور پر یہ تابعدار آزادی نواں کا مخالف نہیں بلکہ میں نے ہفتہ وار ”جلتزنگ“ اور ماہنامہ ”پروانہ“ میں حقوق نواں پر بڑے معركہ کے مفہماں لکھے ہیں۔ اگر جناب والا ارشاد فرمائیں تو ان کے تراشے پیش کروں۔ اتفاق سے میری جیب میں چلے آئے ہیں۔

جانش سیکرٹری : یہ بات موضوع سے دور ہے۔ آپ محض کیس بیان کیجئے۔

سپرنندنٹ : لیں سر۔ جی ہاں۔ میں گزارش کر رہا تھا۔ کہ ذاتی طور پر خاکسار آزادی نواں کا مخالف نہیں۔ لیکن اصولی طور پر دولت خداداد پاکستان میں

سیکرٹری : آپ اصولی بحثوں سے برکنار رہنے کی کوشش کیجئے۔ ہم صرف کیس سننا چاہتے ہیں۔

اسٹنٹ سیکرٹری : اور جناب اس کے علاوہ سرکاری ملازمتوں میں عورتوں کا تناسب بحوالہ سرکلر نمبر ۳۳۵۲ الف مورخہ ۱۹۳۴ء مقرر ہو چکا ہے۔ اب اس موضوع پر کسی قسم کی اصولی بحث کرنا غیر مناسب ہے۔ اگر جناب ضروری خیال فرمائیں تو سرکلر مذکورہ پیش کیا جائے۔

اندر سیکرٹری : میرے خیال میں سرکلر پیش کرنے کی چند اس ضرورت نہیں۔ ایسا اہم سرکلر تو سب کو ازبر ہونا چاہئے۔ افسوس تو یہ ہے کہ حکومت کے احکام پر مناسب عمل نہیں کیا جاتا۔ ورنہ اب تک دفتروں میں حسین چھروں — میرا مطلب ہے، صرف نازک کو اپنا جائز حصہ مل چکا ہوتا۔ جناب! میں سمجھتا ہوں کہ پیش نظر کیس کی ساعت کے وقت مس سلیمہ کو بھی اس میٹنگ میں موجود ہونا چاہئے۔ اگر کوئی اعتراض نہ ہو تو اسے بلا بھیجا جائے؟

ڈپٹی سیکرٹری : اندر سیکرٹری کی رائے نہایت معقول ہے۔ قانونی لحاظ سے اس کیس سے متعلقہ سب لوگوں کو یہاں موجود ہونے کا حق پہنچتا ہے۔

جانش سیکرٹری یہ دلیل بعد ازاں موضوع ہے ہم ایک محکمانہ معاملے پر غور کر رہے ہیں اور محکمانہ کارروائیاں عدالتی اصولوں کی پابندی نہیں ہیں۔

سیکرٹری : میرا رجحان بھی جانش سیکرٹری کی رائے سے متفق ہونے کی طرف آمادہ ہے۔ ویل سپرنہنڈنٹ صاحب بیان جاری رکھئے۔

سپرنہنڈنٹ : جناب غلام گزارش کر رہا ہے کہ خاکسار کی مودبانہ گزارشات کے باوجود جب مس سلیمہ کی تقری مظہوری ہو گئی، تو میں نے عرض کی تھی کہ کم از کم اسے میرے سیکشن میں تعینات نہ کیا جائے۔ حضور جانتے ہیں کہ میرے سیکشن میں پہلے ہی سے عجب عجب تخلوط عناصر بھرے ہوئے ہیں۔ جو کام کی نسبت باتیں اور جھگڑے زیادہ کرتے ہیں۔ مثلاً ناصر علی میر، جو ہونے کو تو میں لکر کرے لیکن اندر اندر شاعر بھی ہے۔ اور فائدلوں پر اپنی نظموں کی مشق کرنے کا عادی ہے۔ کبھی ہتھوڑے پر لکھم، کبھی درانتی پر غزل، کبھی سڑک کوئٹے والے انجمن کی شان میں قصیدہ اللہ اللہ! یہ بھی کیا زمانہ آیا، حضور! وہ مرزا اسد اللہ خاں غالب نے فرمایا ہے ع

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں۔

جانش سیکرٹری : براہ مریانی آپ شاعری سے ہٹ کر کیس پر رہئے۔

سیکرٹری : مجھے اس بات سے قطعی اتفاق ہے، ویل؟

سپرنہنڈنٹ : اور جناب میرے سیکشن میں ناصر علی میر کے علاوہ وہ خبطی سودائی

نھرت اللہ خیال بھی ہے جو اپنے آپ کو دور حاضر کا بہترین شرکار سمجھتا ہے۔ اور —

انڈر سیکرٹری : میرے خیال میں آپ اپنے سیکشن کا تجزیہ کرنے کی بجائے مس سلیمہ کے متعلق باتیں کرتے جائیں تو بہتر ہو گا۔

ڈپٹی سیکرٹری : انڈر سیکرٹری کا مطلب ہے کہ آپ اپنی گفتگو کو کیس کے موضوع سے بہت دور نہ جانے دیجئے۔ مجھے اس خیال سے پورا اتفاق ہے۔ پرنسپل نہیں : جی ہاں۔ بے شک۔ میں عرض کر رہا تھا کہ میرے سیکشن میں پہلے ہی سے مخلوط العناصر مخلوق کی کچھڑی کچھڑی ہوئی تھی۔ اس پر طریقہ کہ مس سلیمہ بھی پوسٹ ہوئی تو اس سیکشن میں۔ میرے ناجیز خیال میں تنظیمی لحاظ سے یہ ایک غلطی تھی۔

اسٹنٹ سیکرٹری حکومت کے منظور شدہ احکامات پر نکتہ چینی کرنے سے پرنسپل نہیں کو باز رہنا چاہئے۔

پرنسپل نہیں : جی ہاں، بہت خوب۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ چنانچہ جتاب عالیٰ مس سلیمہ کے آنے پر میرے سیکشن میں گڑبڑ اور بھی زیادہ بڑھ گئی اور باوجود یہکہ —

اسٹنٹ سیکرٹری کیا مطلب؟ کیا آپ کے سیکشن میں ہیشہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ موجود تھی؟ تنظیمی لحاظ سے یہ اختال قابل غور ہے۔

انڈر سیکرٹری : میرے خیال میں پرنسپل نہیں صاحب کو ایڈ فریشن کا خاطر خواہ تجربہ نہیں۔ کسی سیکشن میں گڑبڑ کا اختال تک قابل گرفت ہونا چاہیے۔ چ جائیکہ گڑبڑ ہو اور پھر ہیشہ سے ہو۔

ڈپٹی سیکرٹری : پرنسپل نہیں صاحب، یہ فرمائیے کہ آپ اس پوسٹ پر کب سے مقرر ہیں؟ اور آپ کی سروس اور پچھلے تجربات کیا ہیں؟

پرنسپل نہیں : جی حضور، میں معافی کا خواستگار ہوں۔ دراصل میری گزارش کا مطلب یہ تھا کہ —

ڈپٹی سیکرٹری : آپ اپنا مطلب چھوڑیے اور فی الحال میرے سوالوں کا جواب

دیجئے۔

سپرنڈنڈنٹ : جناب عالیٰ، خاکسار نے ۱۹۲۵ء میں اگرہ یونیورسٹی سے میزک کا امتحان پاس کیا تھا۔ حسن اتفاق سے اسی سال مسٹر جان ایمشن صاحب بہادر سپرنڈنڈنٹ ہوم ڈیپارٹمنٹ حکومت ہند اپنی میم صاحب کے ہمراہ تاج محل کی زیارت کرنے اگرہ تشریف لائے۔ خدائے ذوالجلال دونوں کو غریق رحمت کرے۔ بڑی خوبیوں کے لوگ تھے۔ حسن سیرت سے مالامال، رحم دل، غریب پرور، تاج محل کے باہر ان کے تانگے کا گھوڑا بد کئے گا۔ میں کلوپنوواڑی کی دکان کے سامنے بیٹھا پیری سلگا رہا تھا۔ ان دونوں کلوپنوواڑی کی دکان تاج محل کے عین سامنے والے۔

جائش سیکرٹری مجھے شک ہے کہ انتظامی ناظمیت کے علاوہ اس سپرنڈنڈنٹ کو ضرورت سے زیادہ باتیں کرنے کا بھی مرض ہے۔ یہ دونوں نمایت عجین نقصان ہیں۔ اگر ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی بنیادوں کو اس قسم کی ناظمیت اور باتوں سے پرستوار کیا جاسکتا ہے تو یقیناً ہم جنت الحمقائیں رہتے ہیں۔ میرے خیال میں اس سپرنڈنڈنٹ کی ناظمیت کا جائزہ لینے کے لیے مکمل انکوادری کی ضرورت ہے۔

سیکرٹری : مجھے اس رائے سے حرف بحروف اتفاق ہے۔ ناظمیت کو دیدہ و دانستہ برداشت کرنا قومی غداری کے متراffد ہے۔ ولی، سپرنڈنڈنٹ صاحب۔ آپ جاسکتے ہیں، یہ فاکل یمیں چھوڑ جائیے۔

(سپرنڈنڈنٹ جاتا ہے)

سیکرٹری : میرے خیال میں اس سپرنڈنڈنٹ کے کام، تجربے اور دیگر کوالي فی کیشنر کا جائزہ لینے کے بعد میرے پاس ایک مفصل نوٹ پیش ہونا چاہئے۔
جائش سیکرٹری (ڈپٹی سیکرٹری سے) آپ اس کام پر اپنی خاص توجہ صرف کیجئے۔

ڈپٹی سیکرٹری : (انڈر سیکرٹری سے) آپ اس انکوادری کو اپنی ذاتی گھرانی میں نمایت احتیاط کے ساتھ منعقد کریں۔

انڈر سیکرٹری: (اسٹنٹ سیکرٹری سے) اگر اس معاملے میں آپ کو میری مدد کی ضرورت پڑے تو بلا تکلف مجھے بتا دیجئے گا۔

اسٹنٹ سیکرٹری: بہت خوب۔ کیا اب مس سلیمہ کا کیس آگے بیان کیا جائے؟

انڈر سیکرٹری: شاید یہ بہتر ہو گا کہ سپرنٹنڈنٹ کی غیر موجودگی میں کیس پر روشنی ڈالنے کے لیے مس سلیمہ کو یہاں بلا لیا جائے؟

جانٹ سیکرٹری: جیسا کہ فیصلہ ہو چکا ہے۔ مس سلیمہ کو اس مینگ میں بلا نے کے لیے کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ اسٹنٹ سیکرٹری فائل سے کیس پر روشنی ڈال سکتا ہے۔

سیکرٹری: میں جانٹ سیکرٹری کی رائے کے ساتھ اپنے اتفاق کو دھرا تا ہوں۔ دیل، دیل۔ کیس بیان ہو۔

اسٹنٹ سیکرٹری: جناب، شکایت کا لب لباب یہ ہے کہ مل کلر ناصر علی میر، جو اندر ہی اندر شاعر بھی ہے، دفتر میں بیٹھ کر اپنی نظمیں گنگنا نے کا عادی ہے۔ اس کی ایک نظم پر سپرنٹنڈنٹ صاحب کو شدید اعتراض ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس نظم کے پہلے حصے میں سلیمہ کی طرف رومانی اشارات ہیں اور یہ ایک اخلاقی جرم ہے، دوسرے حصے میں حکومت پر حملہ ہے، جو ایک قانونی جرم ہے۔ اور اس کے علاوہ ایک ادبی جرم یہ ہے کہ نظم سر سے پاؤں تک بے قافیہ اور بے رویف ہے۔

ڈپٹی سیکرٹری: جہاں تک سپرنٹنڈنٹ صاحب کے ادبی اعتراضات کا تعلق ہے۔ انہیں موضوع بحث سے الگ رکھنا چاہئے۔

انڈر سیکرٹری: میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ مس سلیمہ کے متعلق رومانی اشارات منظوم کرنا بھی کوئی جرم نہیں۔ البتہ اگر مس سلیمہ کو خود کوئی وجہ شکایت ہو تو دوسری بات ہے۔ اس لیے شروع ہی سے میرا یہ خیال رہا ہے کہ مس سلیمہ کی رائے معلوم کرنے کے لیے اس مینگ میں بلا ناحد درجہ مناسب ہو گا۔

جانٹ سیکرٹری: مجھے افسوس ہے کہ ہم پیش از مرگ واپسیا کر رہے ہیں۔ نظم

سنے سے پہلے اس کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا ایک ممکنی بات ہے۔
 سیکرٹری : بالکل تھیک۔ میری رائے کا پله بھی اسی طرف جھکنے کی طرف مائل
 ہے۔ دلیل اسٹرنٹ سیکرٹری صاحب، آپ لظم بیان فرمائیے۔
 اسٹرنٹ سیکرٹری : جناب لظم کا عنوان ہے ”سرخ فیتہ۔“

عرض کیا ہے :

تو نے جب کھایا پان!

تیرے ہونٹوں پہ لگافیٹہ سُرخ!

جان جمال

جان جمال

تیری آنکھوں میں گلابی ڈورے

تیرے گالوں پہ وہ عازے کی بہار

تیرے حلقوم کی شہ رگ میں مچلتا سا، چھلتا سا، لمکتا سا ہوا گرم لہو

تیری شلوار پہ ریشم کارن

تیرے پر چچ غرارے پہ گلابی سی عنابی سی کشیدہ کاری ہیمات!

تجھ پہ موقوف ہے کیا؟

جان جمال ————— جان جمال

سرخ فیتے میں بندھی رہتی ہے سرکار میری!

اس میں حاکم بھی ملکوم بھی ہیں۔

اس کے ہر چچ میں پوشیدہ ہے اک دار در سن

اس کے پھندے میں لٹکتی ہے، ملکتی ہے، جھنکتی ہے ادا چھانسی کی جس میں سر
ڈال کے، آہ

مر گئی فائل میری!

انڈر سیکرٹری : واہ وا، واہ وا، بجحان اللہ۔ کیا خوب کہا ہے کلام نے واہ وا،

ڈپٹی سیکرٹری : بہت خوب، بہت خوب، جیسے ن۔ م راشد کا کلام۔

انڈر سیکرٹری : میرے خیال میں فیض کا رنگ بھی غالب ہے۔ تیری آنکھوں

میں گلابی ڈورے، تیری گالوں پر وہ غازے کی بمار۔ واہ وا، واہ وا۔

ڈپٹی سیکرٹری: کچھ میرا جی کا اثر بھی نمایاں ہے۔

ترے حلقوم کی شہ رگ میں مچلتا سا، چھلتا سا، لکھتا سا، ہوا گرم لو! آہا اللہ

کرے زور قلم اور زیادہ!

جانش سیکرٹری: کیا آپ صاحبان داد دے چکے؟

انڈر سیکرٹری: اجی صاحب، ہم کیا اور ہماری داد کیا۔ میں نے کہا آپ نے غور فرمایا کہ ہمارے دفاتر کی گدڑیوں میں کیسے کیسے لال پوشیدہ ہیں؟ مجھے یقین ہے کہ جب تک حکومت خود ان سُخن ہائے گرانامیاں کو تلاش کر کے۔۔۔۔۔

جانش سیکرٹری: مجھے ڈر ہے کہ یہ محکمانہ کارروائی مجلسِ مشاعرہ کی صورت اختیار کرتی جا رہی ہے۔

سیکرٹری: میں خود یہی محسوس کرنے کی کوشش کر رہا ہوں صاحبان، ہمیں سنجیدگی کا دامن پکڑنا چاہئے۔ اس کے بغیر امور سلطنت بعوان شائستہ طے نہیں کیے جاسکتے۔

انڈر سیکرٹری: ڈپٹی سیکرٹری! بہت خوب، جناب۔

سیکرٹری: ولی۔ اسٹنش سیکرٹری صاحب

اسٹنش سیکرٹری جناب! پرنسپل نٹھ صاحب کو شکایت ہے کہ اس نظم کے پہلے آٹھ مصراعوں میں مس سلیمہ پر اشارات ہیں۔ اور باقی حصے میں سرکار والا مدار کے نظام کا رکرداری کی شان میں گستاخی ہے۔

انڈر سیکرٹری: کیا اس نظم میں کسی جگہ مس سلیمہ کا نام آیا ہے؟

اسٹنش سیکرٹری: جی نہیں تو۔

انڈر سیکرٹری: اس صورت میں یہ شکایات بے بنیاد ہیں۔

ڈپٹی سیکرٹری: اور اگر مس سلیمہ کو یہ خوش فہمی ہے کہ نظموں میں اس کے سوا اور کسی خوبصورت لڑکی کا ذکر نہیں ہو سکتا تو اس وہم کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں۔

انڈر سیکرٹری: اس کے علاوہ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ اشارہ مس سلیمہ

کی طرف ہے تو پہلے ہمیں ان امور پر تحقیقات کرنا ہو گی کہ کیا وہ پان کھاتی ہے؟ کیا پان کھانے کے بعد اس کے ہونٹوں پر سرخ فیتنے سے لبرانے لگتے ہیں؟ کیا اس کی آنکھوں میں گلابی ڈورے ہیں؟ کیا اس کے گالوں پر غازے کی بمار ہوتی ہے؟ کیا وہ ایسی شلوار پہنتی ہے جس کے پانچھوں پر سرخ رن لگا ہو؟ کیا اس کے غزارے پر سرخ ریشم کے پھول ہوتے ہیں؟ جناب عالیٰ میں برصغیر ادب و احترام گزارش کروں گا، کہ جب تک ہم مس سلمہ کو سامنے بٹھا کے ان امور کا مفصل جائزہ نہ لیں۔ ہماری انکوادری پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتی۔ کم از کم انصاف کا تقاضہ تو یہی ہے۔

ذپیٰ سیکرٹری: بالکل درست۔ لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ ہمارے دفاتر میں مس سلمہ کے علاوہ اور بھی ایسی لڑکیاں ہوں جو پان کھاتی ہوں۔ جن کے گالوں پر غازے کی بمار ہو۔ جن کی آنکھوں میں گلابی ڈورے ہوں۔

جانٹ سیکرٹری: مجھے اس نکتے سے معقولیت کی بُو آتی ہے۔

سیکرٹری: میرا خیال ہے کہ میں بھی یہی سونگھ رہا ہوں۔

انڈر سیکرٹری: جناب! اس صورت میں میں یہ تجویز پیش کرنے کی جرأت کروں گا کہ مزید انکوادری کے لیے ایک بین الوزارتی مینگ منعقد کی جائے اور اس میں سب محکموں میں کام کرنے والی لڑکیوں کو بھی طلب کیا جائے۔

جانٹ سیکرٹری: میں سمجھتا ہوں کہ اس کی ابھی چند اس ضرورت نہیں، لیکن جناب، جو خیال مجھے دق کر رہا ہے، وہ یہ ہے کہ اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ یہ نظم مس سلمہ یا کسی اور دفتری لڑکی کے متعلق ہے تو کیا ہم کسی قسم کا ایکشن لینے کے مجاز ہوں گے؟

استٹ سیکرٹری: جناب! کیس کے اس پہلو پر فی الحال غور نہیں کیا گیا۔ میرا خیال ہے کہ انکوادری مکمل ہونے کے بعد ایکشن تجویز کرنا کوئی کام نہ ہو گا۔

سیکرٹری: بت خوب! آپ گاڑی کو گھوڑے کے آگے باندھنے کے شوقین نظر آتے ہیں۔ کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ اس کیس پر ابتدائی کارروائی کا ذمہ

دار کون ہے؟

اسٹنٹ سیکرٹری: جناب، ابتدائی کارروائی اس خاکسار نے مکمل کی تھی۔

سیکرٹری: مجھے نہایت افسوس سے یہ اعلان کرنا پڑتا ہے کہ آپ نے اس قسم کا
مبہم اور ناچحت کیس ایجنسڈا پر رکھ کر ہم سب کا وقت ضائع کیا ہے۔ اگر آپ
سمجھتے ہیں کہ حکومت کے قیمتی وقت کو یوں ضائع کر کے آپ ملک اور قوم کی
خدمت سرانجام فرمائے ہیں تو بے شک آپ کسی شدید مجرمانہ غلط فہمی میں
بیٹلا ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ ہمیں آپ کی صلاحیتوں کا از سر نو جائزہ لیتا ہو گا۔
اسٹنٹ سیکرٹری صاحب، آپ تشریف لے جاسکتے ہیں۔ یہ فائل یہیں چھوڑ
جائیے۔

(اسٹنٹ سیکرٹری جاتا ہے)

سیکرٹری: (جانش سیکرٹری سے) آپ اسٹنٹ سیکرٹری کی صلاحیتوں کا بغور
جاائزہ لے کر مجھے ایک تفصیلی نوٹ عطا فرمائیں تو مشکور رہوں گا۔

جانش سیکرٹری: (ڈپٹی سیکرٹری سے) آپ اس کام پر اپنی خاص توجہ صرف کیجئے۔

ڈپٹی سیکرٹری: (انڈر سیکرٹری سے) اگر آپ کو کسی پوائنٹ پر میری مدد کی
ضرورت محسوس ہو تو بلا تکلف فرمادیجئے گا؟

انڈر سیکرٹری: بہت خوب، جناب! کیا اب مس سیلمہ کا کیس مزید بیان کیا جائے؟

جانش سیکرٹری: میں سمجھتا ہوں کہ یہ ناچحت کیس محض تضعیف اوقات ہے۔

میری رائے میں اسے داخل دفتر کر دینا چاہئے۔

سیکرٹری: میں محسوس کرتا ہوں کہ میری رائے کا پلہ بھی اس تجویز کے حق میں
جھکاؤ کی طرف مائل ہونے پر آمادہ ہے۔۔۔۔۔

ایک ڈسپیچ

جب رابرٹ لانگ بمبئی کے کشم ہاؤس سے باہر نکلا، تو میکسی ڈرائیوروں کا ایک غول بیابانی اس پر جھپٹنا۔ لیکن وہ اچک کر سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی ایک خالی و کثوریہ میں سوار ہو گیا۔ وکتوریہ کی چھت اتری ہوئی تھی۔ اور گھوڑا اور کوچبان دونوں مزے مزے کے خرائے لے رہے تھے۔ گھوڑے کے سر پر ایک کوآ بیخا اس کے دونوں کانوں میں باری باری سے ٹھونکیں مار رہا تھا۔ مکھیوں کا ایک ہجتہ کوچبان کے منہ پر منڈلا رہا تھا۔ کچھ مکھیاں اس کے نہضوں اور نیم واہانے میں بے تکلفی سے مصروف سیاحت تھیں۔ رابرٹ لانگ کے سوار ہونے پر گاڑی کو دھکا لگا اور گھوڑے کا مالک دونوں اپنے خوابوں کے جزیروں سے اس دنیائے فانی میں لوٹ آئے۔ کوچبان نے اپنی بھینگی آنکھیں گھما کر مسافر کا جائزہ لیا۔ اپنی مخفی جسم کو موڑ کر ایک پیچیدہ سی انگڑائی لی۔ اور زور سے کھنکار کر دو تین ادھ موئی مکھیوں کو باہر تھوک دیا۔ جو سیرو سیاحت کے شوق میں اس کے گلے کے اندر ورنی نہماں خانوں میں بھکلی تھیں۔ پھر اس نے چاک بہا میں گھما کر دو چار گھوڑے کی پیٹھ پر رسید کیے۔ گھوڑے نے احتجاجاً اپنی بچھلی ٹانکیں اٹھا کر کچھ دولتیاں جھاڑیں اور پھر خاموشی سے راہ راست پر چل پڑا۔

چوں چوں —— ٹھک ٹھک —— چوں چوں ٹھک ٹھک —— وکتوریہ چرچاتی ہوئی کھلکھلاتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ اس کے آگے پیچھے، دائیں بائیں موڑوں، ڑاموں، تانگوں، رکشاوں، سائیکلوں، کتوں، بکریوں، بیلوں اور انسانوں کا تاتا سا بندھا ہوا تھا۔ اگر کوئی چیز اچانک وکتوریہ کے راستے میں حائل ہوتی تھی۔ تو کوچبان بڑی فصاحت و بلاغت سے اس کے شجرہ نسب پر طویل تبصرہ کرتا تھا۔ اس کے منہ میں پان کی پیک بھری

ہوئی تھی اور وہ بڑی بے تکلفی سے اسے راہ چلتے ہوئے انسانوں اور جانوروں پر تھوکتا جاتا تھا۔ رابرٹ لانگ و کٹوریہ کی سیٹ پر نیم دراز پڑا سوچ رہا تھا کہ کوچبان نے ابھی تک اس سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ وہ کہاں جانا چاہتا ہے۔ نہ معلوم وہ اسے خراماں خراماں کس منزل کی طرف لیے جا رہا ہے؟ شاید اس یوگیوں اور جادوگروں کی سرزین پر جہاں لوگ نہ گئے پاؤں دیکھتے ہوئے انگاروں پر چلتے ہیں۔ شیشے چباتے ہیں۔ رسول پر درختوں کی طرح چڑھ جاتے ہیں۔ سویوں اور میخوں پر سوتے ہیں شاید کہ اس سرزین کے کوچبان اپنے سافروں کی پیشانی پر ہی ان کی منزل کا نام پڑھ لیتے ہوں؟ شاید یہ کوچبان کوئی پر اسرار یوگی ہو جو مستقبل کے آئینے میں نامعلوم قسمتوں کے راز پڑھتا ہو۔ شاید اس نے دیکھا ہو کہ نیویارک پوسٹ کا نامہ نگار خصوصی رابرٹ لانگ کوین ایلزٹھ میں امریکہ سے لندن پہنچا۔ لندن میں اس نے اپنے اخبار کے لیے کہانیاں لکھیں، شراب پی اور ہائیڈ پارک میں منڈلانے والے بے شمار چھوکروں سے معاشرتے کیے۔ ایس، ایس سیرٹھ مور میں اس نے پہلے مزر جیکسن اور پھر ہڈا سے جی بھلایا۔ اور آج صبح جب جمازنے اپنے سافروں کو بہبیتی کی زمین پر اگل دیا تو یہ پر اسرار کوچبان اپنے جانے پہچانے دوست کو لینے کے لیے پہلے ہی سے سڑک پر موجود تھا! شاید اب وہ اسے اپنے پوشیدہ تھے خانے کی طرف لیے جا رہا ہے۔ جس میں عود اور غبر کی بتمیاں سلگ رہی ہوں گی۔ دیواروں پر کھوپڑیوں اور ہڈیوں کے ڈھانچے لٹک رہے ہوں گے۔ ایک کونے میں ایک مدھم سی موم بی جل رہی ہو گی۔ دوسرے میں کوچبان ہو گا، اپنے ہاتھ میں اللہ دین کا چراغ لیے۔ یا کیا رابرٹ لانگ کا سانا پتنا ایک جھنکے کے ساتھ ٹوٹ گیا۔ کیونکہ و کٹوریہ کا ایک پیہہ سامنے کی طرف آتی ہوئی تیل گاڑی کے پیٹے سے نکلا کر بری طرح الجھ گیا تھا۔ تیل کی گردان کھنچ کر و کٹوریہ کے اندر آگئی تھی اور سرخ سرخ جلتی ہوئی آنکھوں والا تیل و کٹوریہ کے اندر رابرٹ لانگ کے عین سامنے بڑے خطرناک انداز میں پھنکا رہا تھا۔ اس کے نوکیلے سینگ رابرٹ لانگ کی چھاتی سے چند انجوں دور میساںہ غلور پر آؤزیاں تھے اور منہ سے کف ابل ابل کر اس کی پتلوں پر نکپ رہی تھی۔ کوچبان اور گاڑی بان اپنی اپنی جگہ بیٹھنے زور زور سے چلا رہے تھے، اور ایک دوسرے کے خاندان کی مستورات کے چال چلن کے متعلق بڑے گمرے رازوں کے انکشافتات کر رہے تھے۔ اور تماش بینوں کا ایج گروہ نیم بیجنگوی

شکل میں کھڑا اپنی دلچسپی کا اظہار کر رہا تھا۔ کبھی کبھی گاڑی بان کے ہاتھ کو اپنی طرف اشارہ کرتے دیکھ کر رابرٹ لائگ کو خیال ہوتا تھا اُر شاید اس کا اپنا شجرہ نسب بھی زیر بحث ہے۔ جتنے منہ اتی باتیں۔ ہر کوئی اپنی بساط کے مطابق صورت حالات پر تبصرہ کر رہا تھا۔ ایک دھوٹی پوش بزرگ نے جو سر پر گاندھی نوپی اوڑھے تھے یہ حل پیش کیا کہ کوچبان اپنے سفید قام مسافر کو دکھنے سے بچے اتر دے۔ سلیمان نے سختی سے یہ تجویز مانے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اس عمل سے دکھنے کے پہنچ کا نتیل گاڑی کے پہنچ سے الگ ہونے کا کوئی عملی پلو نہیں نکلتا تھا۔ اس انکار پر گاندھی نوپی والے بزرگ نے سلیمان کی سرخ ترکی نوپی کے متعلق ایک گھناؤنی سی رائے کا اظہار کیا۔ سلیمان نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اور گاندھی نوپی کے متعلق عورت کے جسم کے بعض حصوں کی سافت کی تیشیں پیش کی۔ سامعین میں کچھ لوگوں نے داد دی۔ بعض لوگ مکرائے اور بعض بری طرح گھڑے۔ رابرٹ لائگ کو اس بحث میں بڑا مزا آ رہا تھا۔ اس کے دل میں ایک بہم سی امید نے کوٹ لی کہ شاید اس ملک کی روایات کے مطابق نوبیوں کی یہ تکرار بڑھتے بڑھتے ہندو مسلم فساد کی شکل اختیار کرے۔ اور دکھنے میں ایک بھرے ہوئے نتیل کے سینگوں کے سامنے بیٹھے بیٹھے اس کا صحافتی داعی نیوارک پوسٹ کے لیے ایک تاریخی ڈسٹیچ تیار کرنے لگا ”بسمی میں ہندو مسلم فساد۔ تین افراد ہلاک، بے شمار زخمی۔ امریکی اخبار نویس کی گھوڑا گاڑی پر بحث“ نیوارک پوسٹ کے نمائندہ خصوصی رابرٹ لائگ پر جملہ۔ ”

بدقتی سے رابرٹ لائگ کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ جب گاڑی بان اور کوچبان کے پاس ایک دوسرے کے خاندانی اسرار اور موز ختم ہو گئے تو انہوں نے خاموشی سے اتر کر اپنی اپنی گاڑیوں کے الجھے ہوئے پہیوں کو ایک دوسرے سے الگ کیا اور چند الوداعی گالیوں کے بعد اپنی اپنی راہ پر چل کھڑے ہوئے۔

و دکھنے میں نتیل کے سینگوں کے سامنے اکٹوں بیٹھے بیٹھے رابرٹ لائگ کی کمراور پیٹھ تھک گئی اور اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ جلد از جلد تاج محل ہوٹل پہنچ کر گرم گرم غسل کرے اور پھر لاڈنچ میں بیٹھے کر ان غزالی آنکھوں، سانپ کی طرح لرا نے والی کالی چوٹیوں اور سرسراتی ہوئی دلفریب سائزیوں کا نظارہ کرے۔ جن کے تخیل نے مت سے اس

کے دل کو آباد کیا ہوا تھا۔ یہ تصویریں الف لیلہ کے قصوں کی طرح اس کے دماغ پر نقش تھیں۔ اور بے شمار عجیب و غریب روحانی تصورات نے اس پر ایک ٹسمی جال سا بن رکھا تھا۔ رابرٹ لائگ نے سوچا کہ بیتل کے ساتھ اس کا پہلا تجربہ کچھ زیادہ خوشنگوار نہ تھا اور اس کے پتلون پر کف کے گردے ہوئے چھینٹے بڑے غلیظ نظر آ رہے تھے۔ اگر وکنوریہ کا پراساریوگی سلیمان اسے یونہی اپنی ٹسماتی دنیا میں لیے پھر تارہاتونہ معلوم ابھی کتنے اور بیلوں، گھوڑوں اور ہاتھیوں کے ساتھ اسے اختلاط کا شرف نصیب ہو گا۔ یوں تو وہ ایک سچ نامہ نگار کی طرح ہر قسم کے تجربات کے لیے تیار تھا۔ لیکن بمبی کی پہلی شام! اگر یہ شام غزالی آنکھوں اور بل کھاتی ہوئی ناگنوں کے بغیر گزر گئی تو زندگی میں ایک ایسا خلا رہ جائے گا جسے ہزاروں خوشنگوار اور پر کیف شامیں بھی پر نہ کر سکیں گی۔ زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ یہ چند اولین تاثرات ہی تو ہوتے ہیں جن میں کچھ اجنبيت، کچھ مفارزت، کچھ قرب، کچھ بعد کا حسین امتزاج ہوتا ہے۔ جملہ عروی کی پہلی شام! ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرنیں بمبی پر اداسی کی طرح چھائی ہوئی تھیں۔ کہیں کہیں دکانوں کے اندر ورنی حصوں میں بجلیاں بھی جلنے لگی تھیں۔ یہی تو وہ اچھو تا وقت ہے، جب روشنی اور تاریکی مگلے ملتے ہیں۔ آئینوں کے سامنے مرمریں اجسام پر کالی زلفوں کے بادل بکھر جاتے ہیں۔ کائنات کوٹ لیتی ہے۔ گناہ اور ثواب پہلو بدلتے ہیں تاج محل ہوٹل کے بال روم میں قعموں کی روپ مala روشن ہوتی ہے اور غزالی آنکھیں کالی کالی، لمرا تی ہوئی ناگن زلفیں۔ ”تاج محل ہوٹل“ رابرٹ لائگ نے ذرا چلا کر سلیمان کو مخاطب کیا۔ وہ اپنے مستقبل کی عنان اس مشتعل یوگی کے ہاتھ میں دے کر بمبی میں اپنے پسلے دن کے تجربات کو ملائیں کرنا نہیں چاہتا تھا۔

”بہت اچھا صاحب۔“ سلیمان نے اس کی طرف دیکھے بغیر میکاگی طور پر جواب دیا۔

کچھ دور آگے پان اور بیڑی کی دکان تھی۔ وکنوریہ اس کے حامنے رک گئی۔ نیچے اتر کر سلیمان نے کچھ پان اور بیڑیاں خرید کیں۔ داموں پر اس کی دکاندار کے ساتھ کچھ بکھر ار بھی ہوئی۔ وہ دونوں ابھی بازار کے بھاؤ پر تباولہ خیالات کر رہے تھے کہ ایک بندروالا وکنوریہ کے قریب آیا اور ہاتھ بڑھا کر اس نے رابرٹ لائگ کے کانوں کے

نر دیک زور سے ڈگنڈی بجائی۔ رابرٹ لانگ گھبرا کر چونک اٹھا۔ بندروالے نے بہت سے رنگوں کا ڈھیلا ڈھالا چندہ پہنا ہوا تھا۔ اس کے سر پر ایک لمبوتری ٹوپی تھی جس میں جا بجا مور کے پر اڑے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں رسی تھی جو دو بڑے بندروں کے گلے میں پڑی ہوئی تھی، اور کوئی چار پائچ چھوٹے چھوٹے بندر کے پچھے اس کے جسم پر جا بجا چھٹے ہوئے تھے۔ کوئی کندھے پر بیٹھا تھا کوئی گردن پر۔ کوئی پینچھے کے ساتھ لگا ہوا تھا، اور ایک نخاماں سا بچہ اس کی ٹوپی پر فراغت سے بیٹھا موگ کچلی ٹھونگ رہا تھا۔ ڈگنڈی کی آواز سن کر ٹوپی والا بندر نیچے اتر آیا اور چیاؤں چیاؤں کرتا ہوا لپک کر رابرٹ لانگ کے رانوؤں پر آبیٹھا۔ اس کے میں موگ کچلی کا دانا تھا۔ اور وہ رابرٹ لانگ کا منہ چڑا چڑا کر اسے کترنے لگا۔ رابرٹ کو یہ ادا بہت پسند آئی اور اس نے پیار سے بندر کو اپنی گود میں بٹھا لیا۔

”ڈگ ڈگ، ڈگ ڈگ۔“ بندروالا بڑا کایاں تھا۔ زور زور سے ڈگنڈی بجا کر اس نے قیمت کا اعلان کیا۔ ”صاحب بڑا نسلی بندر ہے۔ صرف ایک سور و پیس۔“
اتنے میں سلیمان بھی پان اور بیڑی کا سودا چکا کر واپس آگیا تھا۔ سور و پیس سن کر اس کے کان کھڑے ہوئے۔ ”ارے سور و پے کے پچھے۔ ڈاکہ ڈالنے کا ارادہ ہے کیا؟“
”اجی میاں، اپنا راستہ ناپو، تم کیوں ہماری بات میں نانگ اڑاتے ہو۔“
”اچھا جی، یہ بات ہے؟ میں کہتا ہوں بیٹا۔ میرے ساتھ معاملہ کرو۔ ابھی بکوا دوں گا۔ ہاں ایسے صاحبوں کو الگیوں پر نچانا تو روز کا کام ہے اپنا۔ کیا کہتے ہو؟“
”بولو۔ کیا دلواتے ہو۔“

”تمس! بیس تمہارے دس اپنے۔ کیا کہتے ہو؟“
”کچھ اور دلواؤ استاد۔ تمہارے قدموں کے طفیل ہمارا بھی بھلا ہو گا۔“ بندروالا خوشامد کرنے لگا۔

”اچھا رکھتا ہوں، تم بھی کیا یاد کو گے بیٹا۔“
بندروالے اور سلیمان میں کافی دیر تک جج جج ہوتی رہی۔ وہ پائچ اترتا تھا۔ یہ دو بڑھتا تھا۔ اور انجمام کا رسودا پچاس پر آ کے رکا۔ رابرٹ لانگ نے ڈالروں کا حساب لگایا تو پندرہ یا سولہ ڈالر بننے تھے یعنی نیوارک کے ہوٹل میں دواجھے لپخوں کی قیمت۔ یا پھر س

میں کسی ناٹ کلب کی ایک رات۔ اس قیمت پر نخاماً بندر منگا نہیں تھا۔ جو اس کی گود سے نکل کر اب اس کے کندھے پر بیٹھا بڑے مزے سے موگنگ چلی کھا رہا تھا۔ نظر بچا کر سلیمان نے بیس روپے اپنی جیب میں ڈال لئے اور تمیں بندر والے کے پروے کیے۔ رابرٹ لانگ دل ہی دل میں سلیمان کی مدد پر احسان مند ہوا جس نے کمال محنت سے بندر کی قیمت سورپے سے پچاس روپے کروائی تھی۔ جب وکٹوریہ دوبارہ چلی تو تھوڑے کی چال میں پہلے سے زیادہ سکلی تھی اور سلیمان کا چاپک بھی غیر معمولی سرگرمی سے کام کر رہا تھا۔ اس نے اپنے منہ میں بھری ہوئی پیک کو ایک راہ چلتی ہوئی گائے کی پیٹھ پر پچکاری مار کر تھوک دیا۔ ٹوپی اتار کر اس کی گرد کو جھاڑا۔ پھندنے کو سمجھایا۔ کانوں میں رومال گھما کر میل نکالی اور پھر گردن گھما کر اپنی جھینکی آنکھ کے ترچھے زاویے سے رابرٹ کی طرف دیکھا "ہلا گلا صاحب؟" اس نے رازدارانہ انداز سے دریافت کیا۔

"ہلا گلا؟" رابرٹ لانگ نے سوچا، شاید کسی ہندوستانی ملھائی کا نام ہو۔ یا شاید یہ اس پُر اسرار یوگی کے کسی خفیہ تہ خانے کی طرف اشارہ ہو۔ بہریف وہ اپنے محض کا دل توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اگر سلیمان کی مرضی ہے کہ وہ اپنے مسافر کو وکٹوریہ میں زیادہ سے زیادہ عرصہ بٹھا کر کرایہ میں خاطر خواہ اضافہ کر سکے تو کرنے دو۔ یہ اس کا حق ہے۔ آخر اس نے بھی تو کوشش کر کے بندر کی قیمت میں پچاس روپیہ کی تخفیف کرائی تھی۔ تاج محل ہوٹل کیا ہے۔ ایک گھنٹے پہلے پنجے یا بعد، فرق ہی کیا پڑتا ہے۔ ہاں، استاد سلیمان! اگر تمہاری خوشی ہلا گلا ہی میں ہے تو ہلا گلا ہی سی۔ یہ کسی ہندوستانی ملھائی کا نام ہو یا کسی یوگی کے پُر اسرار تہ خانے کا۔ ایک ہی بات ہے۔ تم اپنا جی خوش کرلو۔

"آپ کا دل بہت خوش ہو جائے گا۔ صاحب اس کے بغیر بہتی میں جینا بھی بیکار ہے اور مرتباً بھی بے کار ہے۔" سلیمان نے اپنا فلسفہ بیان کیا پھر اس نے ایک بجلی کے سکھبے کے پنجے رک کر گاڑی کے دھوان آکوڈ، میلے لپوں کو روشن کیا۔ شام کا دھنڈ لکا اب تاریکی میں بدل گیا تھا اور گنجان بازاروں کی ریل چلی سے نکل کر وکٹوریہ ایک خاموش سڑک پر چلی جا رہی تھی۔ دونوں طرف کشادہ با غیبوں کے درمیان چھوٹی چھوٹی کوٹھیاں تھیں۔ اگر ان میں روشنیاں نہ ہوتیں، اور کہیں کہیں برآمدوں سے ہٹنے یا بولنے کی آوازیں نہ آتیں تو شاید یہ محسوس ہو تاکہ یہ آبادی نہیں قبرستان ہے۔ کوئی آدھ گھنٹہ

چلنے کے بعد وکٹوریہ سینٹ کے ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے رک گئی۔ پھاٹک پر ایک چوکیدار بیٹھا چلم پی رہا تھا۔ سلیمان کو دیکھ کر سلام کیا اور رابرٹ لائگ ایک سحر زدہ انسان کی طرح اس کے پیچے پیچھے اندر چلا آیا۔

ڈرائیک روم میں اور کوئی نہ تھا۔ فرش پر ایک پرانا قالین بچھا ہوا تھا۔ جس کا بر پامal ہو کر جگہ جگہ سے اڑ گیا تھا۔ اور اب اس کی صورت ٹاٹ ایسی نکل آئی تھی۔ صوفوں کے پریگ بیٹھے ہوئے تھے اور گدوں پر کہیں تیل، کہیں سیاہی، کہیں سالن کے چکنے دھبے تھے۔ دروازوں پر موٹے موٹے پردے لٹک رہے تھے، جن کا رنگ شاید کبھی سرخ تھا۔ لیکن اب مرغی ذنزع کرنے کے بعد نالی میں جتنے ہوئے خون کی طرح سیاہی مائل ہو گیا تھا۔ چھت پر مکڑی کے جالے نہ معلوم کس کس بھید کی پرده پوشی کر رہے تھے۔ دیواروں کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑ کر گیا تھا اور کہیں کہیں پکے ہوئے چھوڑے کی جلد کی طرح پھٹنے کے قریب تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دیواروں کی چھاتی سالہ سال کے راز چھپائے تھک گئی ہے۔ اور اب کسی وقت مجبور ہو کر اچانک بھک سے پھٹ جائے گی۔ فضامیں ایک عجیب سی کثافت تھی، اور کمرے کے ایک کونے میں ایک طوٹے کا پنجرا تک رہا تھا۔ طوٹے نے رابرٹ لائگ کی آمد پر تو کوئی توجہ نہ دی۔ البتہ اس کے کندھے پر بیٹھے ہوئے بندر کو شیم باز آنکھوں سے بڑی طرح گھورا۔ بندر نے بھی جوابی کارروائی شروع کی اور کچھ عرصہ تک وہ دونوں ایک دسرے کو گھور گھور کر اپنی شدید ناپسندیدگی کا اظہار کرتے رہے۔ قریب تھا کہ ان کا اختلاف رائے کوئی اور عملی صورت اختیار کرے کہ یہاں ایک ایک پردے کو جبنش ہوئی اور ایک ادھیز عمر کی کالی کلوٹی، موٹی سی عورت یوں کمرے میں داخل ہوئی جیسے ریل کا انجن بھک بھک کرتا پلیٹ فارم پر آتا ہے۔ ”خوش آمدید، خوش آمدید۔ میرے اچھے نوجوان یہ تمہاری نیک بختی ہے کہ تم یہاں چلے آئے۔“ ورنہ اجنبی نوجوان اس غلیظ شرمیں بڑی طرح بھک جاتے ہیں اور پھر پشت ہاپٹت تک ان کے خون میں پاکیزگی پیدا نہیں ہوتی۔ سلیمان بڑا اچھا راہنمہ ہے۔ میری چھت کے نیچے ابھی تک کوئی جرا شیم پیدا نہیں ہوئے۔ یہاں پر تم اپنے آپ کو یوں محفوظ سمجھو، جیسے تم ڈی، ڈی، ٹی کے ٹپ میں بیٹھے ہو۔ آؤ، آؤ، جوان آؤ۔ ”بھک بھک کرتا ہوا انجن روانہ ہوا اور رابرٹ لائگ ریل کے ڈبے کی طرح اس کے ساتھ جاتا ہوا پیچے پیچے چلنے لگا۔

عورت کے بال کٹے ہوئے تھے اور ان میں جا بجا میل کے سفید سفید ذرے ابرک کی طرح چمک رہے تھے۔ اس نے نیلی چھینٹ کا فرماں پہننا ہوا تھا۔ جس کے نیچے اس کی بہمنہ پنڈلیاں آبنوی گددروں کی طرح نکلی ہوئی تھیں۔ پاؤں میں اوپنجی ایڑی والی گرگابی تھی، جس پر مدت سے پالش نہیں ہوا تھا۔ وہ ابھی چند قدم ہی چلے تھے کہ یک ایک عورت کے منہ سے ایک ڈراؤنی چیخ نکلی اور وہ اچھل کر دھرام سے فرش پر گر گئی جیسے ریل کا انجن پنزدی سے اتر کر الٹ جائے۔ رابرٹ لانگ نے جلدی اس کا فرماں درست کیا۔ اور اپنے بازوؤں کا سارے دے کر اسے اٹھایا۔

”معاف کجھے“ میں بہت شرمندہ ہوں۔ میرے اس بے وقوف بندرنے خواہ مخواہ آپ کے کندھے پر کوڈ کر آپ کو ڈرایا۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔“

”اوہو! یہ تمہارا بندر ہے۔ آہا، کیسا پیارا بچہ ہے۔ میں خواہ مخواہ ڈر گئی۔ کتنا سوہنٹ ہے۔ یہ“ عورت نے اپنے سے ہوئے چہرے پر جھوٹی مسکراہٹ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس کے منہ پر پسینے کے قطرے بکھرے ہوئے تھے۔ جن میں پودر گھل گھل کر برص کے داغوں کی طرح پھیل رہا تھا۔ اس کے بالائی ہونٹ پر بالوں کی لکیر جو کرم اور پاؤڑ کی تسویں میں دبی ہوئی تھی۔ اب گھبرائی ملی کے رو گنگوں کی طرح کھڑی ہو گئی تھی۔

ڈاٹنگ روم سے نکل کر وہ ایک والان میں آئے۔ وہاں سے وہ مکان کے پچھوڑے میں ایک اور کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ کمرہ بڑا خوش نما تھا۔ چھت پر کئی سو کینڈل پور کے نکتے نور بر سار ہے تھے۔ دیواروں پر پھولدان اور گلدنے لگئے ہوئے تھے۔ فرش پر ایک بے داغ سفید چاندنی پچھی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں خوبصورت ایرانی غالیچہ تھا۔ اس پر ریشم کے گاؤں لکنے لگے ہوئے تھے۔ اور ایک نکتے کے سارے نجمہ ایک تنی ہوئی کمان کی طرح یہم دراز تھی۔ اس کی کالی زلفیں زہرناک ہانگوں کی طرح اس کے شانوں پر لہر رہی تھیں۔ اس کی غزالی آنکھوں میں مقناطیس کے گلڑے تھے۔ اس کے جسم کا گداز کمرے کی فضائیں عود اور غبر کی طرح سلگ رہا تھا۔ رابرٹ لانگ نے حیرت سے آنکھ ملی۔

نجمہ کے ہونٹوں پر گلاب کی پتیاں سی کھلیں۔ رابرٹ لانگ نے اپنی آنکھوں کو دوبارہ ملا۔ نجمہ مسکرائی۔

”کشمیر سے آئی ہے۔“ موٹی عورت نے ٹلسم کو توڑتے ہوئے کہا۔ ”کشمیر کا نام تو تم نے سنا ہو گا، بخوان؟ تمہاری یو، این، او، وہاں کا جھگڑا چکا رہی ہے۔ بڑی اچھی جگہ ہے۔ سبب، انگور، ناشپاتیاں اور۔۔۔“

رابرٹ کے دل کے ساتھ اب اس کے صحافی دماغ نے ایک شدید کروٹ لی۔ اس نے سوچا کہ شاید آج کی رات اس پر مسئلہ کشمیر کے کچھ راز بھی آشکار ہوں۔ شاید کل صبح وہ اپنے اخبار کو ایسا تاریخی ڈپیچ ارسال کر سکے جس سے اس میں الاقوامی گتھمی کو سُلجنہانے میں ایک نئی شاہراہ کا نشان مل سکے، شاید۔۔۔“

”پچاس روپے۔“ موٹی عورت نے بندر بیچنے والے کی طرح قیمت کا اعلان کر کے اس کمرے کے ٹلسم کو ایک بڑا پھر توڑ ڈالا۔

چھاس روپے

بندر!

نجم!

کشمیر!

یو، این، او

اور امریکی نامہ نگار اپنا تاریخی ڈپیچ تیار کرنے میں مشغول ہو گیا۔

پکے پکے آم

علی الصبح جب ریل گاڑی جموں توی کے قریب پہنچی، تو بڑا حسین مظہر تھا۔ چنگاب کی جھلسی ہوئی لوکی جگہ خنک ہوا کے جھونکے آرہے تھے۔ سامنے ایک پہاڑی پر جموں کا شر آباد تھا۔ جیسے کسی نشیب پر کلیاں اُگی ہوئی ہوں۔ پس منظر میں پہاڑوں کی چوٹیاں تھے در تھے متوازی خطوط کی طرح بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھیں۔ اور انہی کا نکتہ عروج برف پوش ہمالیہ کا وہ سلسلہ کوہ سے تھا، جو ان سب کے پیچھے ایک سنگلاخ چٹان کی طرح ایستادہ تھا۔

جس طرح جموں کے پس منظر میں پہاڑوں کی بلند سے بلند تر چوٹیاں ہیں۔ اسی طرح جموں شر میں سب سے نمایاں چیزیں کے مندر ہیں۔ کالے مندر۔ سُرخ مندر۔ سفید مندر سونے کی چادریوں میں لپٹئے ہوئے زر کا مندر۔ رابرٹ لانگ نے دوربین لگا کر ان کے کلنس گھننے کی کوشش کی لیکن جس طرح تارے گنتے وقت ہر خالی جگہ پر ایک نیا ستارہ جھلکانا لگتا ہے، بالکل اسی طرح ہر لمحہ کسی مکان یا درخت یا دیوار کی اوٹ سے ایک نئے مندر کا کلنس نمودار ہو جاتا تھا اور اس کی کوشش رائیگاں جاتی تھی۔ حکیم گوراندہ مل جو لاہور سے سوار ہوئے تھے۔ رابرٹ کی مشکل بھانپ کر اور کمال شفقت سے اس کی معلومات میں اضافہ فرمائے گئے۔ وہ ایک بھاری بھر کم کوٹ میں ان دوائیوں کی شیشیاں اور پیکٹ بھر رہے تھے جو وہ لاہور سے خرید کر لائے ہوئے تھے۔ اس کوٹ کے اندر کی طرف بے شمار تھے خانے اور چور جیسیں بنی ہوئی تھیں اور وہ ٹوٹل ٹوٹل کر ہر خالی جگہ شیشیاں اور ڈبے ٹھوںس رہے تھے۔ اس حرکت کے جواز میں فرمایا کہ ریاست میں دوائیوں پر تین سو فیصدی تک کشم ڈیوٹی عاید ہوتی ہے۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔

چنانچہ حکیم گوراندہ ایسا ایماندار اور شریف انسان بھی مجبور ہے کہ وہ اپنے عجیب و غریب کوٹ کی جیلوں میں دوائیوں کو چھپا کر کشم ڈیوٹی بچائے۔ وہ اپنے شر کا مسیح انفس اور ہر دلعزز طبیب ہے۔ اس کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ وہ مفلس و نادار مریضوں کو کم سے کم قیمت پر دوائیاں فراہم کرے۔ اس فرض کی انجام دہی میں اگر اسے کشم سے بچنے کے لیے چوری یا دھوکہ دہی کا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے تو یہ کوئی جرم نہیں، بلکہ یعنی ثواب ہے۔ اخلاقیات پر طبع آزمائی کے بعد حکیم صاحب مندروں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور رابرٹ لانگ کو اطلاع دیتے ہیں کہ جموں شر میں ۷۲ مندر ہیں۔ سونے کی چادر میں منڈھا ہوا رکھنا تھا مندر جس میں ضرورت کے وقت حضور مہاراجہ بہادر بہ نفسِ نفس قدم رنجہ فرماتے ہیں۔ دیوانوں کا مندر۔ وزیروں کا مندر۔ تھن کے راجپتوں کا مندر، منادر کے زیلداروں کا مندر۔ ذات پات رتبہ بہ رتبہ، بنے ہوئے مندروں کی تفصیلات کے ساتھ حکیم گوراندہ مل جموں کے نام کی وجہ تسلیہ پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ اور راجہ جا بولوچن سے لے کر مہاراجہ ادھیراج شری ہری سنگھ تک بت سی تاریخی اور جغرافیائی تفصیلات میں کچھ اس طرح الجھے کہ ان کی تقریر کا مفہوم رابرٹ لانگ کی سمجھ سے بالاتر ہو جاتا ہے۔ دراصل یہ حکیم صاحب کا قصور نہیں۔ کیونکہ وہ رابرٹ سے زیادہ اپنے مداری کے تھیلے ایسے کوٹ اور داؤں کے ڈبے کے ساتھ زیادہ مشغول ہیں۔ یوں بھی ایک خاندانی حکیم کا یہ فرض ہے کہ وہ کسی غیر ملکی نامہ نگار پر وقت ضائع کرنے کی بجائے اپنے غریب مریضوں کے لیے ستی دوائیں فراہم کرنے کی زیادہ کوشش کرے۔

اس ڈبے میں ایک سردار جی بھی ہیں۔ غالباً کپڑے کے تاجر ہیں اور اپنے غریب گاہوں کے لیے سلک، بو سکی اور جارجٹ سنتے داموں فراہم کرنے کی سروٹ کوشش فرم رہے ہیں۔ اپنے کپڑے اتار کر وہ سلک، بو سکی اور جارجٹ کے نکڑے اپنی ٹانگوں، پیٹ، چھاتی اور بازوؤں پر تھے در تھے لپیٹ لیتے ہیں اور ان کے اوپر پاجامہ، قیض و اسکٹ اور کوٹ چڑھا لیتے ہیں۔

جس کے جسم کی ساری ہڈیاں کسی حادثے میں نٹ گئی ہوں اور پلاسٹر آف پیرس لگا کر اسے سر سے پاؤں تک پیوں میں باندھ دیا گیا ہو۔ حکیم گوراندہ مل بھی اپنے کوٹ میں عجیب الخلق تھیز نظر آتا ہے۔ لیکن کیا کریں بچارے دونوں اپنے اپنے احساسِ فرض

سے بیجد مجبور ہیں۔

جموں میں نیکیوں کا رواج نہیں۔ اس لیے رابرٹ لانگ حکیم گوراندہ مل اور اپنے ہم سفر استاد جی کے ساتھ ایک تانگے میں سوار ہو جاتا ہے۔ کشم ہاؤس کے سامنے ایک وردی پوش محل دار تانگے کو روکتا ہے۔ اس کے آگے دو اور تانگوں کی تلاشی ہو رہی ہے۔ ٹرینک سوت کیس اور بیتر سرڈک کے عین درمیان کھلے پڑے ہیں۔ کشم ہاؤس کا ایک جوان سال افسر جس نے کھلے گلے کی زرد قبیض اور سفید پتوں پہنی ہوئی ہے ایک بر قعہ پوش عورت کے بر قعے کے اندر ہاتھ ڈال کر اس کی کمراوری سینے کی تلاشی لے رہا ہے۔ ایک دلما پتلا مریل سا آدمی جواس کا خاوند یا بھائی ہے پاس کھڑا غصے سے مل کھا کھا کر احتجاج کر رہا ہے۔ لیکن ایک وردی پوش سپاہی اپنے ہاتھ کا موٹا سا ڈنڈا دکھا کر اسے خاموش رہنے کی تلقین کرتا ہے۔

راابرٹ لانگ حکیم گوراندہ مل سے بچتا ہے کہ کیا اس ریاست میں عورتوں کے جسم پر بھی محصول لگتا ہے؟

حکیم گوراندہ مل حسب معمول اس کے سوال کی طفر آمیز تنجی کو محسوس نہیں کرتا۔ وہ دہانہ چھاڑ کر ہستا ہے اور رابرٹ کو ایک راز کی بات بتاتا ہے کہ مسلمان عورتوں کے ساتھ یہ حرکت جائز ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ سرکار کے خزانے کو دھوکہ دینے کے لیے انہوں نے اپنے بر قعوں کے اندر مال چھپایا ہوا ہو۔

بر قعہ کے اندر اچھی طرح ٹنڈل کر کشم ہاؤس کا جوان سال افسر ناک بھوں چڑھاتا ہے اور اپنے پاس کھڑے ہوئے وردی پوش سپاہی کو حکم دیتا ہے۔ ”رام لال! جانے دو۔ دہاں پلپے آموں کے سوا کچھ نہیں۔ جاؤ گڑوی میں پانی لاو اور میرے ہاتھ دھلاو۔ خواہ مخواہ بد مزہ ہو گئے صحیح صحیح۔“

دوسرے تانگے میں ایک شخص واپسیا مچا رہا تھا کہ وہ اپنے بچوں کے لیے سیالکوٹ سے سیر بھر مٹائی لیتا آیا ہے۔ اب کشم والے ذریعہ روپیہ کی مٹھائی پر ۳۳ آنے محصول طلب کر رہے ہیں۔ اس بار سے بچنے کے لیے وہ تانگے میں بیٹھے بیٹھے جتنی مٹھائی کھا سکتا ہے کھا لیتا ہے۔ اور باقی ماندہ پر آس پاس منڈلاتے ہوئے وردی پوش سپاہی ہاتھ صاف کرتے ہیں۔

جب رابرٹ لانگ والے تائنگے کی باری آتی ہے تو حکیم گوراندہ مل ہاتھ جوڑ کر کشم کے جواں سال افسر کو سلام کرتا ہے۔ کیلاش جی نہستے۔ یہ صاحب بہادر ریزیدنٹ نسی سے آئے ہیں۔ شاید سرکار کے لیے ضروری کاغذات لائے ہوں۔ معلوم نہیں گیٹ ہاؤس کی کارا بھی تک کیوں نہیں پہنچی۔ جب سے سرکار نے کرنیل عدالت خان کو گیٹ ہاؤس کا انچارج بنایا ہے۔ سارا انتظام ہی درہم برہم ہو گیا ہے۔ خیر میں دکان پر چینچتے ہی سارا انتظام کر دوں گا۔ بھلا سوچئے تو سی کیلاش جی۔ ہم سرکار کی بدناہی کیسے برداشت کر سکتے ہیں۔ اچھا کیلاش جی نہستے۔

کیلاش اپنی فیلٹ ہیٹ اٹھا کر رابرٹ لانگ کو سلام کرتا ہے۔ اور ان کا تائنگہ بڑی عزت اور رعب کے ساتھ کشم ہاؤس سے روانہ ہوتا ہے۔ رابرٹ لانگ حکیم گوراندہ مل کے سفید جھوٹ پر کسی قسم کا احتجاج نہیں کرتا۔ کیونکہ یہ چال چلنے سے اس کے دو کیمرے نصف درجن فلمیں، دوربین اور دیگر بہت سی اشیاء بھی بڑی صفائی کے ساتھ کشم کے جھنجھٹ سے بچ نکلتی ہیں۔

ڈاک بندگہ پہنچ کر جب رابرٹ لانگ شیو اور غسل سے فارغ ہوا تو حسن علی خان سماں اپنی کتاب اٹھائے اس سے ناشتا، لپخ اور ڈزر کا آرڈر لینے آیا۔

”جناب بریک فاست پر پوری تیج، ٹوٹ، مکھن، جیم، چائے یا کافی اور فروٹ تیار ہو گا۔ صاحب انڈا بوائل مانگتا یا فرمائی؟“ حسن علی خان سماں لپخ اور زبان کے حساب سے جان میکفرسن کے بیرے افضل کی برادری کا قریبی رشتہ دار معلوم ہوتا ہے۔ رابرٹ لانگ نے کافی اور تلے ہوئے انڈوں کی فرمائش کی۔

لپخ کے لیے حسن علی خان خان سماں نے سوپ، مجھلی، کولڈ مٹن، سبزی، پلاو بنانا مری ٹرزا اور کافی کا حکم لگایا۔

راابرٹ لانگ نے سر تسلیم خم کیا۔

جب ڈزر کی باری آئی تو حسن علی خان سماں اچکن کی پیٹی پر ہاتھ باندھ کے رابرٹ لانگ کے حکم کے انتظار میں ہمسہ تن گوش کھڑا ہو گیا۔

راابرٹ لانگ بھی سنبھل کر سیدھا ہو بیٹھا۔ معاً اسے شاہد کی بات یاد آئی کہ جموں اور کشمیر کے ڈاک بندگوں میں ڈزر کے ہر کورس میں ایک نیا رومان پوشیدہ ہوتا ہے۔

چنانچہ جب چکن کا حکم دیا جائے تو خانام مغض مرغی پکاتا ہے۔ لیکن اگر چوزے کی فرماںش ہو تو ۱۵ یا ۲۱ برس کی تازہ چھوکری حاضر ہوتی ہے اور مرغی مانگتے تو اس سے زیادہ ہر عمر اور ہر سائز کی عورت ملتی ہے۔ رابرٹ لانگ کے چرے پر شرارت کی مسکراہٹ پیدا ہوئی اور اس نے حسن علی خانام پر کچھ طبع آزمائی کا فیصلہ کر لیا۔

”خانام تھارا نام کیا؟“ رابرٹ لانگ نے کچھ کچھ بے تکلفی کی ابتدائی۔

”صاحب، ہمارا نام حسن علی خال خانام ولد جشن علی خال خانام ہے۔“ تین پشت سے ہم برابر اس ڈاک بنگلے میں کام کرتا ہے۔ ”حسن علی اپنے نام کے ساتھ خال التزام سے لگاتا تھا۔ جیسے شاعر تخلص کو استعمال کرتا ہے۔“

”بہت خوب، تم بڑے خاندانی شخص نظر آتے ہو۔“

”ہمارا کیا منہ“ جواب! ہم تو صاحب لوگ کی خدمت کو اپنا فرض سمجھتا ہے۔ آپ کی دعا سے تین پشت سے پیلس کا سارا اپلاٹی بھی برابر ہمارے ہاتھ سے جاتا ہے۔“

”آہا، پھر تو تم بڑے کار آمد اور تجربہ کار انسان ہو۔“ رابرٹ لانگ نے خانام کو

شہدی۔

”صاحب! ہم اپنے منہ سے کیا بول سکتا ہے۔ ہم صاحب لوگ کا خدمت برابر اپنا فرض سمجھتا ہے۔“

”اچھا تو خانام، پیلس میں چوزہ زیادہ چلتا ہے یا مرغی؟“ رابرٹ لانگ نے دریافت کیا۔

اس سوال پر خانام ذرا سنبل کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور کن انکھیوں سے بغور رابرٹ لانگ کا جائزہ لینے لگا۔
را برٹ اس کی بچکچاہٹ کو تماز گیا۔

”اچھراو نہیں، خانام۔“ اس نے کہا۔ ”میں کوئی ریزیڈنسی سے نہیں آیا بلکہ مغض ایک ٹورست ہوں اور امریکہ میں لکھنے کا کام کرتا ہوں۔“

”صاحب امریکی ہے؟ صاحب ٹورست ہے؟ صاحب بولتا کہ صاحب ریزیڈنسی سے نہیں تھا۔“ خانام نے مزید اطمینان کے لیے تفتیش کی۔

”ہاں، خانام، تھارا خیال بالکل درست ہے۔“

اب حن علی خاں نے کچھ اطمینان کا سائنس لیا۔ صاحب پوچھنا مانگتا ہے کہ پیس میں مرغی زیادہ لگتا ہے یا چوزہ؟
”ہاں“ خانام۔ بالکل ٹھیک۔“

جواب دینے سے پہلے خانام نے بڑی احتیاط سے دائیں بائیں آگے پیچھے گھوم کر جائزہ لیا کہ کوئی ان کی باتیں تو نہیں سن رہا۔ اس نے دیکھا کہ برآمدے میں گلا بو مترا جھاؤں دینے کے بھانے ان کی طرف پکا۔ ”تحم خنزیر پر تم اس طرف اپنی ماں حرامزادی کے پاس آتا ہے؟ جاؤ دوسری طرف کام کرو۔ لعین۔ بے شرم۔ کمین۔“

گلا بو مترا سے پشت کر خانام واپس آیا اور دوبارہ گرد و پیش کا جائزہ لے کر اس نے رابرٹ لانگ کو اس بھید سے آگاہ کیا کہ مہاراجہ کے محل میں کم من لڑکیاں اور جوان عورتیں دونوں برابر کام کرتی ہیں۔

”صاحب پہلے ہم برابر مسلمان چھوکری سپلائی کرتا تھا۔ کیونکہ اس وطن میں یہ جنس غریب ستا ہے۔ اس دین سے ہم کو بہت منافع پختا تھا۔“ حن علی خانام نے اپنے منہ پر زور سے تھپڑ مار کر کہا۔ ”صاحب اس وقت ہم کافر تھا۔ ہم خنزیر تھا۔ ہم شیطان کا پچھہ تھا۔“ اپنی شان میں ہر کلے پر خانام اپنے دائیں اور بائیں رخساروں پر اس زور سے تھپڑ مار رہا تھا کہ اس کی آنکھوں سے بے اختیار پانی نکل آیا۔

”لیکن صاحب! باخدا اب ہم نے توبہ کر لیا ہے۔“ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”اب ہم مُسلمان چھوکری کو اپنا مبن سمجھتا ہے۔ اب ہم پیس سے لے کر ڈاک بنگلے تک صرف ہندو چھوکری لگاتا ہے۔ اس میں ہم کو منافع بہت کم پختا ہے۔ لیکن جناب پروا نہیں۔ اب ہم نے توبہ کر لیا ہے۔ باخدا۔“ حن علی خانام نے کندھے پر سے رکا بیاں صاف کرنے والا انگوچھا اتار کر پہلے اس سے آنکھیں پوچھیں اور پھر اس میں زور سے اپنی ناک صاف کی۔

”صاحب جب حق تعالیٰ سے ہمارا حساب بے باق ہو جائے گا تو ہم فوراً یہ دھندا چھوڑ دے گا۔ صاحب ہم ہجرت کر کے مدینہ شریف چلا جائے گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روپہ مبارک پر سرپنک پنک کے اپنا گناہ کا معافی مانگے گا۔ صاحب ہم بڑا موزی گنگا رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام پر حن علی نے شہادت کی

انگیاں ملا کر چوما اور بڑی عقیدت سے اپنی آنکھوں پر لگایا۔

عورتوں کی دلالی اور روحانیت کے ذکر کے بعد حسن علی خانامان نے سیاحت کی طرف توجہ مبذول کی اور بڑے بڑے رازدارانہ لمحے میں رابرٹ لائگ کو آگاہ کیا کہ پہلے وہ نیشنل تھا۔ لیکن اب مسلم کافرنی ہے۔ ”صاحب جب حضرت جناح صاحب جموں تشریف لایا تھا تو اللہ تعالیٰ کی برکت سے اس ڈاک بنگلے میں ٹھرا تھا۔ صاحب ہم نے خود اپنے ہاتھ سے حضرت جناح صاحب کا کھانا پکایا تھا اور بوث صاف کیا تھا اور سوت پر استری کیا تھا۔“ حسن علی خان نے اپنے ہاتھ انھا کر انہیں بڑے پیار سے دیکھا اور پھر تعظیماً ”انہیں اپنی سفید داڑھی پر ملا۔

ان انکشافتات کے بعد حسن علی خان خانامان نے ایک بار پھر رکابیاں صاف کرنے والے انگوچھے سے ناک صاف کی اور پھر اچکن اور پیٹی کو درست کر کے اپنے آبائی انداز میں کھڑا ہو گیا۔

”صاحب، آج رات جناب ڈنر پر چکن مانگتا یا چوزہ مانگتا یا مرغی مانگتا؟ ہم ہر چیز صاحب کی مرضی کے موافق پیش کرے گا۔“ اس نے دریافت کیا۔
رابرٹ نے صرف چکن کی فرائش کی۔

آرڈر لینے کے بعد جب خانامان رابرٹ کے کمرے سے لکلا تو اس نے دیکھا کہ گلابو مہتر دروازے کے پیچھے دیوار کے ساتھ چپکا کھڑا ہے۔ حسن علی نے لپک کر اس کو گروں سے پکڑ لیا اور اس کے منہ پر زور زور کے طمانچوں اور گھونسوں کی بارش برسانے لگا۔ جب اس کے ہاتھ تھک گئے، تو اس نے حسب توفیق پاؤں سے بھی گلابو بھنگی کی مرمت کی۔ لیکن یہ حرہ کچھ زیادہ کام نہ آیا۔ کیونکہ حسن خانامان ایک نائگ سے لنگڑا تھا۔

مار کھانے کے بعد گلابو مہتر نے اطمینان کی سانس لی۔ اور خانامان کے پاؤں پر سر رکھ کے گڑ گڑا کر کہا۔ ”خانامان جی، اب تو اس غریب پر مہربانی کرو۔ تمہارے سر کی سو گند اب تو نتھیا بالکل تیار ہے۔“

ختم خذیر، ابھی اس کا عمر بارہ برس ہے۔ تم اس کو کیسے تیار بولتا ہے؟ دو برس اور صبر کرو۔ قانون میں لڑکی ۱۳ برس سے پہلے بالغ نہیں ہوتا۔“

گلابو مہتر نے کچھ اور گزگڑانا چاہا۔ لیکن حسن علی خانسام نے اس کے منه پر تھوک کر خاموش کر دیا۔ ”حرامزادے کے بچے، تم ہم کو جیل بھیجننا چاہتا ہے؟ ہم نابالغ چھوکری کو خراب کر کے اپنی عاقبت نہیں بگاڑے گا۔۔۔“

خانسام بڑا تباہ ہوا، لئکر اتنا ہوا وہاں سے چل دیا لیکن گلابو مہتر اپنی جگہ کھڑا رہا۔ دیر تک اسے حسرت دیاں سے دیکھتا رہا۔ نتھیا اس کی پانچ بیٹیوں میں سب سے بڑی لوکی تھی۔ اور کالونے اسے بڑے ارمانوں سے پلا تھا۔ زندگی کا ہر سال جو نتھیا کے خون میں گرمی اور اس کے بڑھتے ہوئے جسم میں تناؤ پیدا کرتا تھا۔ کالوں کے لیے بڑی خوش آئند توقعات کا پیش خیمہ ہوتا تھا۔ نتھیا سارے خاندان کی امیدوں کا سارا تھی۔ جب وہ جوان ہو گی تو حسن علی خانسام کی مدد سے وہ ضرور ڈاک بیٹھلے میں وہندے پر لگ جائے گی۔ پھر تو بس گلابو کے دن بھی پھر جائیں گے۔ وہ تو نوکری چھوڑ کر چین کی بنی بجائے گا اور دن رات جی کھول کر اپنی محبوب چرس پیا کرے گا۔ نتھیا کی کمائی سے اس کی چار چھوٹی بہنوں کی بیاہ شادی کا سامان بھی ہو جائے گا اور شاپد نتھیا کی ماں کا علاج بھی ہو جائے جو کئی برس سے چار پائی پر گلی، تپ دق کے مرض میں ٹھلل کردم توڑ رہی ہے وہ نتھیا کی جوانی کا بڑے شوق اور بڑی بے صبری سے منتظر تھا۔ جس طرح آم بیچنے والا کچھ آموں کو بھوے میں دبا کر ان کے پکنے کا بے قراری سے انتظار کرتا ہے۔

اس وقت گلابو بھنگی کو مہاراج ادھیراج کے خزانے سے مبلغ سات روپے آٹھ آنے ماہوار ملتے تھے۔ پچھلے سال جب سرکار ولایت سے پولو کا بیچ جیت کر واپس آئے تھے تو اس خوشی کی یادگار میں اس کی تنخواہ میں چار آنے ماہوار کا اضافہ بھی ہوا تھا۔ لیکن ان پونے آٹھ روپوں میں سے بارہ آنے میونسلی کا داروغہ وصول کر لیا کرتا تھا۔ ایک روپیہ سونے کے کلس والے رگوناتھ مندر کے محکمہ دھرم ارتھ میں داخل ہو جاتا تھا اور باقی چھ روپوں میں نہ تو گلابو کو جی بھر کر چرس ملتی تھی۔ نہ اس کی بیٹیوں کی شادی بیاہ کا سامان ہو سکتا تھا، اور نہ ہی اس کی مدقوق بیوی کا علاج ممکن تھا۔ چنانچہ گلابو بھنگی اور اس کا سارا خاندان کچھ عرصہ سے گلابو بھی یہ دیکھ دیکھ کر باغ باغ ہو رہا تھا کہ نتھیا کا جسم جوانی کے تناؤ سے کمان کی طرح چھ گیا تھا۔ اس کی سیاہ جلد کے نیچے گرم گرم خون کی مُرخی جوش کھا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بے قرار مخموری رہنے لگی تھیں۔ اور چال

میں بھی ایک متنانہ سی لپک اور بے باکی آگئی تھی۔ یہ علامات گلابو کے مستقبل کا پیشہ خیسہ تھیں۔ لیکن خانہ مال کی باتوں نے اس کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ وہ حرامزادہ اسے ابھی دو برس اور صبر کرنے کی تلقین کر رہا تھا۔

اگرچہ جب پہلا پہلی بار پیلس گئی تھی تو اس کی عمر گیارہ برس سے ایک دن بھی زیادہ نہ تھی اور کملا اور رنیکا اور شانتی اور پریتم اور جمنا ۔۔۔ اور یوں بھی گلابو مہتر کو زمانے کے اس عجیب انصاف پر بڑا غصہ آیا کہ قانون میں لوگ کی ۱۷ برس سے پہلے جوان ہی نہیں ہو سکتی۔ کاش کہ قانون بنانے والوں نے ایک نظر اس کی نتھیا کو بھی دیکھا ہوتا۔

پھوڑے والی ٹانگ

نندہ بس سروس کی جس اسٹیشن ویکن میں رابرٹ لائگ کو جگہ ملی۔ اس میں پانچ سواریاں اور بھی تھیں۔ پرانس آف ولیز کالج جموں کے ایک کشیری پنڈت پروفیسر صاحب تھے جو کالج میں گرمیوں کی چھٹیاں ہونے پر سری نگر جا رہے ہیں۔ اُنکے ساتھ ان کی پنڈتانی بیوی صاحبہ تھیں۔ اگرچہ اس وقت جموں میں کوئی ۱۰ درجہ گرمی تھی لیکن حفظ مانقدم کے طور پر پروفیسر صاحب نے نواری رنگ کے پتوں کا چوڑی دار پاجامہ، اس کا ہم رنگ گلے کا گرم کوٹ اور سر پر اونی کٹوپ پہنا ہوا تھا۔ کندھوں پر اعلیٰ پشمینے کی تھیں رنگ کی کاظمی ہوئی چادر تھی۔ پروفیسر صاحب کے کوٹ کی جیبیں پھول کر باہر نکلی ہوئی تھیں۔ ایک میں نمک، الائچی، سیاہ مرچ، اور ک، لوگ اور دارچینی کی پڑیاں تھیں۔ دوسری جیب میں لیموں اور امرت دھارے کی شیشیوں کے ڈبے تھے۔ یہ انتظامات پروفیسر صاحب کی بیوی کے لیے تھے۔ جسے بانہال روڈ کے پے درپے موڑوں پر شدید چکر آیا کرتے تھے۔ پنڈتانی نے سفید لٹھے کا فرن پہنا ہوا تھا جو کلیسا کی راہباؤں کے لبادے کی طرح ٹخنوں ٹخنوں تک آتا تھا۔ پاؤں میں لکڑی کی کھڑاویں تھیں۔ سر پر گھرے سرخ پشمینے کی خوبصورت چادر تھی جس کے نیچے سے اس کی دراز زلفوں کا جوڑا سانپ کے پھن کی طرح جھانک رہا تھا۔ ان کی عمر کوئی تیس برس کے قریب ہو گی۔ رنگ گورا تھا جس میں گلابی رنگ کی ہلکی سی تحریر جھلک رہی تھی۔ جموں کی تماثل سے رخساروں کے گلب مر جھا گئے تھے۔ اب سری نگر پہنچتے ہی ان پر تازگی آجائے گی اور اس کے گال پھر کا گزری میں دیکتے ہوئے کوئلوں کی طرح تمثالتے لگیں گے۔ پنڈتانی کے چہرے پر سب سے نمایاں چیز اس کی ناک اور آنکھیں تھیں۔ اس کی ستواں ناک میں ایک ناقابل بیان

زاکت تھی، جیسے دودھی بلور کو تاش کر اسے سانچے میں ڈھالا گیا ہو۔ اس کی گھری نیلگوں آنکھوں میں بڑا حسین حزن تھا۔ جیسے سکوت شام میں کسی دور دراز جھیل پر سکون کی ادا سی چھائی ہوتی ہو۔ ماتھے پر قشة تھا۔ مانگ میں ساگ کے سیندور کی لکیر تھی اور ہونٹوں پر اخوت کے چھکلے کی سُرخی کبوتر کے خون کی طرح چمک رہی تھی۔ پنڈتانی کے ہاتھ میں سُرخ، سبز اور نیلے ابرک سے منڈھی ہوئی ایک کاغذی تھی۔ اس میں وہ گھر سے راکھ بھر کے لائی تھی۔ تاکہ پانماں سڑک کے موڑوں پر جب اس کا جی متلاعے تو وہ آسانی سے اس میں قے کر سکے۔

اسی شیش و یگن میں پرنس عبدالرحیم سرفندی بھی تھے۔ ان کے ساتھ ان کی بیگم صاحبہ کے علاوہ ایک حسین و جمیل جوان پارسی خاتون تھی۔ اس کا نام لو لو تھا۔ اور وہ پرنس سرفندی کے ساتھ مسوری سے مہاراجہ بہادر کے مہمان کی حیثیت سے کشمیر میں موسم گرامزار نے آ رہی تھی۔

پرنس عبدالرحیم سرفندی نے گیہڑیں کی جود چوری بر جس اور بند گلے کا کوت پہنا ہوا تھا۔ سر پر ہلکے فاختی ٹرنگ کی فیلٹ ہیٹ تھی۔ جس پر موتیوں اور ہیروں سے جڑا ہوا مور کے پر کا بروج آویزاں تھا۔ پرنس سرفندی کی عمر پینتالیس برس سے زیادہ نہ تھی لیکن دیکھنے میں وہ کافی م عمر نظر آتے تھے۔ ان کے سُرخ و سفید چہرے پر ریشم کے سلوٹوں کی طرح جھریاں ہی جھریاں تھیں اور آنکھوں کے پوٹوں کے نیچے سیاہی مائل حلقوں کے درمیان سوچے ہوئے گوشت کی تھیلیاں سی لٹک رہی تھیں۔ اگر غور سے نظر جما کر دیکھا جائے تو پرنس سرفندی کے ہاتھوں میں رعشہ کی ہلکی سی کپکاہٹ بھی تھی، جسے چھپانے کے لیے وہ باتیں کرتے وقت اپنے ہاتھوں کو بار بار بڑے ڈرامائی انداز میں جھٹکا کرتے تھے۔ جب وہ باتیں نہ کر رہے ہوں تو ان کے ہاتھ عموماً ایک خوبصورت ریشمی اسکارف سے کھلیتے رہتے تھے، جو ہر وقت اس مقصد کے لیے ان کی جیب میں موجود رہتا تھا۔

بیگم سرفندی کی عمر اپنے خاوند سے کوئی دس برس کم تھی۔ لیکن شکل و شباہت سے وہ چیزیں چھبیس برس کی نو خیز دلمن سے زیادہ نظر نہ آتی تھی۔ اس کا قد سرو کی طرح بلند اور جسم چتار کی طرح (Majestic) تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی غزالی تھیں۔ جلد میں ایرانی قالینوں ایسی نری اور دیابت کا احساس تھا۔ اور رخسار قندھاری اناروں کی طرح

دیکھتے تھے۔ بیگم سرفندی کے بال کمر کرتک لبے تھے۔ اور وہ انہیں بڑی خوبصورتی سے کھلا چھوڑ دیتی تھی۔ اس کے سر اپا میں جوانی اور صحت اور نسوانیت کی بڑی دلکش تکمیل نظر آتی تھی۔

پنس عبدالرحیم سرفندی نے اپنا شجرہ نب اصلی آرٹ پیپر پ سنری حروف میں چھپوا یا ہوا تھا۔ جس کے مطابق ان کا حسب نب چند پشت پہلے سرفند اور بخارا کے شاہی خاندان کے ساتھ ملتا تھا۔ جب ہندوستان میں سلطنتِ مغلیہ کا آفتاب غروب ہوا۔ تو پنس عبدالرحیم کے آبا اجداد غالباً اس ڈوستی ہوئی کشتی کو سارا دینے کے لیے ہندوستان میں وارد ہوئے۔ یہاں آکر انہوں نے کمپنی بہادر کے نیچے بڑے بڑے عمدے حاصل کئے۔ ان کی دانست میں کمپنی بہادر ملکہ و کنوریہ اعظم کے فرزند ارجمند کا اسم گرامی تھا، جو اپنی والدہ ماجدہ کا سکھ چلانے کے لیے بہ نفس نیس ہندوستان بھیج گئے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ جب انہیں معلوم ہوا کہ کمپنی بہادر تو محض تاجریوں کی ایک جماعت کا نام ہے، تو اس کی ملازمت کو انہوں نے اپنی شاہی خاندان کے روایات کے منافی سمجھ کر ایسٹ انڈیا کمپنی کو خیریاد کیا، اور ہندوستانی راجوں مہاراجوں سے تعلقات پیدا کیے۔ یہاں بھی انہیں خاطر خواہ کامیابی نصیب ہوئی۔ چنانچہ پنس عبدالرحیم سرفندی اب تک بڑی وفاداری سے اپنے خاندان کی روایات پر گامزن تھے اور مہاراجگان کشیر، پیالہ، الور، جے پور، بیکانیر وغیرہ سے ان کے بڑے گھرے تعلقات تھے۔ ان میں سب سے زیادہ لگاؤ انہیں جموں و کشیر کے مہاراجہ کے ساتھ تھا اور وہ پچھلے ستائیں برس سے برابر اس کی مصاحت میں چلے آرہے تھے۔ اس وفاداری اور دوستی کے صلہ میں سرکار نے انہیں سرینگر کے قریب ایک وسیع و عریض باغ، ایک شاندار کوٹھی، دو پیکارڈ موڑوں کے علاوہ دربار میں کری نشین درجہ اول کا اعزاز عطا فرمایا تھا۔

راجوں مہاراجوں کی برادری میں پنس عبدالرحیم سرفندی کی بڑی مانگ تھی۔ ایک ماہرا اور جدی و پشتی درباری ہونے کے علاوہ وہ ایک اچھے دوست اور وفادار ساتھی بھی تھے اور ان کے کمالات کا شرہ یورپ اور ہندوستان کے شاہی حلقوں میں عام تھا۔ مہاراجگان اور مہارانیوں کی مشکلات اور ضروریات کو فوراً بجانپ جانا اور چشم زدن میں ان کے حل فراہم کروئیا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ مہاراجہ الور کی ضروریات کے

پیش نظر پرنس عبدالرحیم سرفقندی نے ان کو یہ مشورہ دیا تھا کہ ریاست میں ہر اسماں کے لیے درخواست کے ساتھ امیدواروں کی تازہ ترین فوٹو بھی ضرور آنا چاہئے۔ یہ زریں مشورہ کچھ ایسا کار آمد ثابت ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے راج پپلا چھتیں گڑھ اور ایسٹرن شیش ایجنٹی کے سب راجوں اور رانیوں نے اس رسم کو بڑے شدود مدد سے اپنالیا۔

مہاراجہ پٹیالہ کی آکتا لیسوں سالگہ پر پرنس عبدالرحیم سرفقندی نے انہیں ایک بھل کی مشین تحفہ دی تھی۔ جو انہوں نے خاص فرماںش کر کے پیرس میں بنوائی تھی۔ اس مشین کی مدد سے مہاراجہ صاحب آکتا لیس سال کی عمر میں بھی گیارہ عورتوں کی ٹیم کے ساتھ ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹہ فٹ بال کا پیچ کھیل سکتے تھے۔ یوں بھی شاہی خاندان پر پرنس سرفقندی کا فیض بڑا عام تھا، بانجھ مہارانیوں اور پیدائشی نامروں مہاراجوں کے ہاں ولی عمد پیدا کرنا ان کا خاص کمال تھا۔ جس کی برکت سے وہ ہندوستان کے بے شمار شاہی خاندانوں کی نسل برقرار رکھنے کے ذمہ دار تھے۔ ریاست جموں و کشمیر پر بھی ان کا بڑا احسان تھا۔

جب حضور مہاراجہ بہادر کی عمر چالیس برس ہونے کو آئی اور یہکے بعد دیگرے چار مہارانیوں کے باوجود راج محل میں ولی عمد کے کوئی آثار نظر نہ آئے، تو راج دربار میں بڑی تشویش پیدا ہونے لگی۔ خاندان کی بڑی بوڑھیوں نے ہر دو ارجاکر چلہ کشی کی۔ راج گروں نے سونے اور چاندی کی جھنکار سے اپنے سوئے ہوئے خداوں کو جگانے کی کوشش کی۔ سونے کے کلس والے رگھوناٹھ مندر کے پچاریوں نے بھی حسب توفیق ہاتھ پاؤں مارے۔ فرانس، جرمنی، انگلستان اور امریکہ سے بڑے بڑے ڈاکٹر بھی آئے۔ ایک یوگی کے کہنے پر خود مہاراجہ بہادر بھی صبح سوریے لگنوٹ باندھ کر شبہنی گھاس پر۔ آسن کی مشق فرمائے گئے۔ لیکن شاہی نسل کے جو ناکے بند ہو چکے تھے، وہ بند ہی رہے۔ ساری ریاست کی ڈوگرہ اور راجپوت برادری پر مایوسی کا عالم چھانے لگا۔ ولی عمد کا نہ ہوتا نہ صرف راج گدی کے لیے چیخیدگیوں کا موجب ہو گا بلکہ یہ ڈوگرہ اور راجپوتوں کی مرداگی پر بھی لکنک کا زبردست ٹپکا تھا۔ چوتھی مہارانی کانگڑے کی تھی اور وہاں کے راجپوت ابھی سے جموں کے ڈوگرہ راجپوتوں پر طعن و تشنج پر اُتر آئے تھے۔ اس نازک وقت پر پرنس عبدالرحیم سرفقندی نے اپنی کرامت و کھانی اور مہارانی تارا دیوی کے بطن سے ایک خالص سو فیصدی راجپوتی خون والا ولی عمد برآمد کر کے انہوں نے ریاست جموں و کشمیر

کے ڈوگروں کی لاج رکھ لی۔ یہ مجذہ پیرس میں سرانجام دیا گیا تھا اور اس کی برکت سے مہاراجہ کویراج، مہارانی کو بیٹا۔ ٹھاکر جموں سنگھ کو ڈیڑھ لاکھ سالانہ جاگیر اور پرنس عبدالرحیم سرفندی کو سری نگر کے مضائقات میں پھولوں اور پھلوں کے وسیع باغات عطا ہوئے تھے۔

اسٹیشن ویگن میں داخل ہوتے ہی بیگم سرفندی نے ناک بھوں چڑھا کر احتجاج کیا۔

”ڈارلگ ہم اس کباڑ خانے میں کیسے سفر کریں گے؟ ہائے میرا تو یہاں دم گھٹتا ہے۔“
بیگم سرفندی کے لجھ میں ایک خوبصورت سی بیگانگی تھی۔ جو سرفند اور بخارا کے شاہی خاندان کے افراد کے لجھ میں بہر حال ہونی ہی چاہئے۔

پرنس سرفندی نے اپنی بیگم کو کم اور اسٹیشن ویگن کے دوسرا مسافروں کو زیادہ مخاطب کر کے اس بات کی صفائی پیش کی، کہ آج اپنی دو دو پیکارڈ گاڑیاں چھوڑ کر کرائے کی اس ویگن پر سوار ہونے کے لیے کیوں مجبور ہوئے ہیں۔ ایک پیکارڈ، جس پر وہ سوری سے آرہے تھے جموں پہنچ کر خراب ہو گی۔ اگر وہ سری نگر ٹیلیفون کر دیتے تو شام تک ان کی دوسری پیکارڈ بھی آ جاتی۔ لیکن جموں کی گرمی میں سارا دن کون بس رکرتا؟ یوں بھی ان کے ایک اشارے پر صوبہ جموں کے سارے افسر، جاگیردار، سفید پوش اور کرسی نشین اپنی موڑ گاڑیاں ان کی خدمت میں پیش کرنے میں بڑا فخر محسوس کرتے لیکن اپنے آرام کے لیے دوسروں کو تکلیف پہنچانا ان کے اصولوں کے خلاف ہے۔ ”صاحب میریان، صرف آٹھ نو گھنٹے کی تو بات ہے۔ شام تک ہم لوگ سری نگر پہنچ جائیں گے۔ اس وقت تک جس طرح گزارا ہو سکے گزارا کرنا چاہئے۔“

اس تقریر کے بعد انہوں نے مسافروں کے چہرے پر آئے ہوئے تاثرات کو غور سے بھانپا۔ کشمیری پنڈت پروفیسر صاحب نے ان کا رتبہ پہچان کر پرنس عبدالرحیم سرفندی کو خوب جھک کر سلام کیا۔ خاوند کا اشارہ پا کر ان کی پنڈتانی نے بھی اپنے مرمریں مخروطی ہاتھ جوڑ کر بیگم سرفندی کو پر نام کیا اور وہ دونوں میاں بیوی پچھلی سیٹ پر یوں سمٹ کر بیٹھ گئے، جیسے انہوں نے ویگن پر سوار ہو کر پرنس سرفندی کی شان میں کوئی بڑی گستاخی کی ہو۔

راہرٹ لانگ اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا۔ جہاں سفید چڑی سے واسطہ

ہو۔ وہاں پرنس سرقندی ایک مختلف Social Order کے قائل تھے۔ چنانچہ انہوں نے خود پیش قدمی کر کے رابرٹ کے ساتھ اپنا تعارف کرایا۔ اور بڑی نیازمندی سے معدرت کی کہ ان کے ساتھ زیادہ سامان ہونے کی وجہ سے شاید اسے تکلیف ہوئی ہو۔ رابرٹ لانگ نے خوش اخلاقی سے انہیں یقین دلایا کہ اسے مطلقاً کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ اور حقیقت میں وہ بڑے آرام میں ہے۔ اس تعارف کے بعد پرنس سرقندی نے رابرٹ لانگ کو کد کے ڈاک بیگلے میں اپنے ساتھ لے کھانے کے لیے مدعو کیا۔ بیگم سرقندی نے بھی تائید کی اور رابرٹ نے شکریہ کے ساتھ دعوت قبول کر لی۔

جوں شر سے نکل کر جب گاڑی مہاراجہ بہادر کے موسم سرما کے محلات کے قریب پہنچی۔ تو پرنس سرقندی نے ڈرائیور کو حکم دیا کہ تنظیماً اس مقام پر گاڑی کی رفتار بہت کم ہونی چاہئے۔ جب تک محلات کے سامنے سے گزرتی رہی۔ پرنس سرقندی اپنی فلیٹ ہیٹ ہاتھ میں لیے مودبانہ بیٹھے رہے۔ بیگم سرقندی نے بڑے شوق سے لوٹو کو سرکار کے بیٹھنے کھانے، اور سونے کے کروں کی کھڑکیاں دکھائیں۔ کشمیری پنڈت پروفیسر صاحب نے رومال منہ کے سامنے کر کے پرنس سرقندی کے اس اظہار وفاداری پر خوب ناک چڑھائی، اور کہنی مار کر اپنی بیوی کو بھی یہ تماشا دیکھنے کی تلقین کی، لیکن بیچاری پنڈتانی یہ مظہرنہ دیکھ سکی، کیونکہ وہ اپنے فرن کے گریبان میں منه ڈال کر کانگڑی میں بڑی شدت کے ساتھ قے کرنے میں مصروف تھی۔

جوں سے ادھم پور تک بے آب و گیاہ پہاڑوں کا سلسلہ کوہ تھا۔ نہ زیادہ چڑھائی تھی، نہ اُترائی۔ لیکن سڑک بڑی پیچیدہ اور گھنگری لے بالوں کی طرح بل کھاتی ہوئی جا رہی تھی۔ کہیں کہیں بکریاں پہاڑ کی ڈھلوان پر جھاڑیاں چرتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ کہیں کہیں اچانک کوئی پہاڑی جھرنا آ جاتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں چٹانوں پر ایسا جمود چھایا ہوا تھا۔ کھیتوں میں خونخوار صورت اور بڑی بڑی موچھوں والے ڈوگرے بیٹھے چلم پی رہے تھے۔ یا اپنے جوتے ہاتھوں میں اٹھائے ننگے پاؤں مژگشتی میں مصروف تھے۔ کبھی کسی گنڈنڈی یا موڑ پر اچانک کوئی ڈوگری آ جاتی تھی تو فضا میں ایک بجلی سی کونڈ جاتی تھی۔ لابنے لابنے قد۔ رنگ برلنگے چُست کرتے، سڑوں ٹانگوں پر سانس کی طرح بل کھاتے ہوئے چوڑی دار پا جائے۔ قوسِ قزح کی طرح فضا میں لرا تی ہوئی رنگیں چڑیاں۔

گورا گورا رنگ، تیز تیز عقابی آنکھیں۔ اس حسن میں ایک عجیب جلال تھا۔ سر پر دودھ کی ملکیاں یا لکڑی کے گھٹھے اٹھائے جب یہ ڈو گریاں مستانہ چال سے پھاڑی گڈنڈیوں پر چلتی ہیں تو فضامیں ایک ارتعاش سا چھا جاتا تھا۔ پرانی سرفتادی بڑی فصاحت اور بلاغت سے ڈو گری نسل کی فضیلت پر تبصرہ کر رہے تھے۔ کیونکہ کہ حضور مہاراجہ بہادر بھی اسی نسل کے چشم و چراغ تھے۔ ”مریان صاحب یہ سمجھ لو کہ دنیا میں بس دو خاندانوں کا خون اب تک ٹاپاک نہیں ہوا۔ ایک تو سرکار کا خاندان مبارک ہے اور صاحب مریان دوسرا خاندان شہزادگان سرفتادی کا ہے۔ ڈو گرہ نسل گنگا جل کی طرح پوتا ہے۔ اور خان صاحب مریان، شاہزادگان سرفتادی کا خون آب زمزم کی طرح مصفا ہے۔“

پرانی عبدالرحیم سرفتادی نے جتوں شر سے نکلتے ہی اپنے پینڈ بیگ سے کاک ٹیل شیکر، جن، بڑز اور سنتروں کی بو تلیں نکال لی تھیں اور خانم سرفتادی تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد اپنے سرتاج کو لنیز کاک ٹیل تیار کر کے پیش کر رہی تھی۔ پرانی سرفتادی بڑی فصاحت سے سرکار کے شکار کے شوق کی داستانیں سُنا رہے تھے۔ جب انہوں نے سرکار کے لیے سوڑ، شیر، چیتے اور ریچھ کے شکار کے لاجواب انتظامات کیے تھے۔ کوئی آدمی درجن نوش جان فرمائے پرانی سرفتادی نے سرکار کو چھوڑ کر لولو کی طرف رجوع کیا، جو بیزاری کے عالم میں بیٹھی مہاراجہ کے شکار کی تفصیلات اور خانم سرفتادی سے مہاراجہ کے محلات کے مختلف کمروں کی کلر سکیم، فرنچیز، قالینیوں اور پردوں کے حالات میں سُن رہی تھی۔ نشے کی ترنگ میں آکر پرانی سرفتادی نے لولو کے دائیں رخسار کے تل پر انگلی رکھ کے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بڑی رقت سے فرمایا:

”صاحب مریان! اس دل آویز تل کی کیا بات ہے۔ لولو میری جان!

ہمارے آباو اجداد نے تمہارے اس خال پر سرفتادی اور بخارا کی پادشاہی

قریان کر دی تھی۔ ہائے صاحب مریان! بخارا ہندو شہر میں۔ سرفتادی بخارا!

لولو نے غصے سے پرانی سرفتادی کا ہاتھ ایک طرف جھٹک دیا اور احتجاجاً ان کی بیوی کی طرف دیکھا۔ خانم مکرانے لگی، ”لولو! تو ان کی باتوں کا خیال نہ کر، یہ تو تیرے باپ کی جگہ ہیں۔ ایسے ہی مذاق کرنا تو ان کی عادت ہے۔ سرکار کو ان کا مذاق بہت پسند ہے۔ ایک روز انہوں نے سرکار کے سامنے ہرہائی نس کو چوم لیا تھا۔ پیلس میں بڑا شور

ہوا، لیکن سرکار نے کہا، کوئی بات نہیں، پرانس سرفقدی تو ممارانی کا بھائی ہے۔۔۔“
لیکن لولو پر ان دلائل نے کچھ اثر نہ کیا۔ پرانس سرفقدی اب اس کے رخار کے
تل سے ہٹ کر اس کی کمر کی گولائی ناپنے پر اتر آئے تھے اور اس عمل میں بار بار اسے
اپنی گود میں بٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ بر سر عام یہ اظہار عشق دیکھ کر لولو کا منہ غصہ
سے لال ہو گیا۔ اس نے ہاتھ گھما کر پرانس سرفقدی کے منہ پر ایک زناٹ کا طمانچہ رسید
کیا اور ”اویڈیم سوانٹن“ کہتی ہوئی ان کے پاس سے اٹھ کر دوسرا سیٹ پر آبیٹھی۔

لولو کے طمانچے نے پرانس سرفقدی پر خاطر خواہ اٹھ کیا۔ یکے بعد دیگرے دو اور
کاک ٹیل اپنے گلے میں انڈیل کروہ اپنی خانم کے ساتھ لپٹ گئے اور اس کی گردن پر منہ
رکھ کے بے اختیار رونے لگے۔ خانم بڑی شفقت سے اس کا سرسلا نے لگی اور رفتہ رفتہ
بچکیوں کے درمیان پرانس سرفقدی ایک معصوم بچے کی طرح سو گئے۔ خانم نے ان کا سر
بڑی احتیاط سے اپنی گردن سے اٹھا کر اپنے زانوؤں پر رکھ دیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے
سرفقدی اس گداز محملیں تکیے پر لیئے لیئے خراٹے لینے لگے۔ خراٹوں کی شدت سے پرانس
سرفقدی کا جھریلوں زدہ چہرہ ایک پُرانے فٹ بال کی مانند پھیلتا اور سکرتا تھا جس میں بڑی
کوشش سے ہوا بھری جائے، لیکن وہ ہر بار نکل جائے۔ رخاروں اور ہونٹوں کے اس
زیر و بم کے ساتھ ان کے مصنوعی دانتوں کا جبرا بھی ڈھیلا ہو گیا تھا اور ہر خراٹے کے
ساتھ یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ کھٹاک سے باہر آپڑے گا۔ خانم سرفقدی نے اپنے ریشمی
دوپٹے کا پلو اپنے سرتاج کے چہرے پر ڈال دیا اور پھر ملامت سے پُر آنکھوں سے لولو کی
طرف دیکھا۔

لولو سیٹ کے کنارے یوں بیٹھی تھی۔ جیسے خطہ کا اشارہ پاتے ہی اٹھ کر بھانگنے پر
آمادہ ہو۔ غصتے سے اس کا چہرہ تنا ہوا تھا اور اس کے رنگ کی قدر تی پلپلا ہٹ میں اب ایک
ہلکی قرمزی جھلک بھی نمایاں تھی۔ خانم سرفقدی کو اپنی طرف گھوڑتے دیکھ کر لولو نے خود
بھی پیش قدی کی۔ ”مجھے افسوس ہے آئٹی۔ لیکن میں سری نگر نہیں جانا چاہتی۔ میں کہ
سے کسی بس پر واپس آ جاؤں گی۔“

لولو کا عزم سُن کر خانم سرفقدی کی آنکھوں سے ملامت کی خشونت یوں غالب ہو گئی
جیسے اُبنتی ہوئی ہندیا کی بھاپ ہوا میں آ کر یکاکی تحلیل ہو جاتی ہے۔ ملامت کی جگہ اب

آس کی آنکھوں میں لجاجت، خوشابد اور عاجزی کے موٹے موٹے آنسو آگئے۔ وہ جلدی سے اُٹھی کر لولو کو گلے سے لگا لے۔ اس عمل میں اسے سرتاج کا بھی خیال نہ رہا جو اس کے زانوؤں کے تکیے پر سر نکائے مزے سے پڑا سو رہا تھا۔ بیکم سرفندی جب سرعت سے اُٹھی تو پرانس سرفندی کا سرتیوز کی طرح ہوا میں اچھل کر پہلے سیٹ کے گدے پر گرا اور پھر Rebound کر کے سیٹ کی چوبی پشت کے ساتھ کٹاک سے ٹکرایا۔ لیکن بیکم سرفندی کے مشاق ہاتھوں کے بنائے ہوئے آٹھ کاک میلز کا نہ اتنا کچانہ تھا کہ اس معمولی سے جھکلے سے ٹوٹ جاتا۔

”میری پیاری لولو جان۔“ بیکم سرفندی نے لولو کو گلے سے لگا کر کہا۔ ”تم اتنی سی بات پر بگڑ گئیں۔ لو، تم میرے منہ پر جتنے طماںچے جی چاہے مار لو۔“

بیکم سرفندی نے اپنے گالوں کے قدمداری انار لولو کے سامنے جھکا دیے لیکن یہ پیش کش بھی لولو کے غصہ کو ٹھنڈا نہ کر سکی۔

”میری جان لولو۔“ بیکم سرفندی نے اب اپنی آواز میں رفت پیدا کر کے کہا۔ ”تم نے اس درویش کی بات کا بُرا منالیا؟ دیکھو تو میرا فقیر کس طرح ایک بے ضرر خرگوش کی طرح سویا پڑا ہے۔ میں نے پورے پچیس سال اس کے ساتھ گزارے ہیں۔ خدا کی قسم، اس میں عورت کو ضرر پہنچانے کا مادہ ہی نہیں۔“ یہ کہہ کر بیکم سرفندی نے لولو کو معنی خیز انداز سے جھنجوڑا اور اپنا چنار ایسا Majestic جسم تان کر جھر جھری سی لی۔ اپنے خاوند کی معصومیت کا دعویٰ کچھ جھوٹا نہ تھا۔ کیونکہ پچیس سالہ ازدواجی زندگی کے باوجود پرانس سرفندی اپنے آبا اور اجداد کی شاہی نسل برقرار رکھنے کے لیے کوئی صورت پیدا نہ کر سکے تھے۔ یہ بھی قدرت کی قسم طریقی تھی کہ ہندوستانی ریاستوں کے لیے ولی عد فراہم کرنے والا پرانس سرفندی خود اس نعمت سے محروم تھا۔

پرانس سرفندی کی جسمانی اور جنسی صلاحیتوں کی تفصیلات نے بھی لولو کے دل کو نرم نہ کیا۔ وہ بدستور منہ پھلانے بیٹھی رہی اور کہ سے کسی بس پر واپس آنے کا دوبارہ اعلان کیا۔

لولو کی اس ضد نے خانم سرفندی کے اعصاب کو شل کر دیا۔ اس کے جسم کے شاندار چنار پر پت جھڑکی سی بے رونقی چھا گئی۔ آنکھوں کے بڑے پیالے میں آنسو چلک

آئے اور خانم سرفقہ کو اپنے شاہی خاندان کا مستقبل بڑا تاریک نظر آنے لگا۔ کیا کیا جتن کر کے انہوں نے لو لو کو سرکار کا مہمان بننے پر آمادہ کیا تھا۔ اب اگر وہ راستے ہی میں واپس لوٹ گئی، تو وہ سری نگری جا کر سرکار کو کیا منہ دکھائیں گے۔ اپنے خطوط میں انہوں نے لو لو کی دلاؤیز رعنائی، اس کے چھریے بدن کی نزاکت اور اس کے کندن کی طرح دکتے رنگ کو نئے نئے زاویوں سے پیش کیا تھا۔ اور اب سرکار بڑی شدت سے اس کی آمد کا انتظار فرم رہے ہوں گے۔ اگر لو لو سری نگر نہ گئی تو شاہان سرفقہ کی تاریخی ناک کٹ جائے گی۔ اور راج دربار میں ان کے رتبہ عالیٰ کو بڑا صدمہ پہنچے گا۔ راج دربار کا دستور تھا کہ ہر سال بھار کے موسم میں سرکار کے مقربین خاص بڑی ججو کے بعد مہاراجہ بھادر کے لیے حسین و جمیل مہمان لایا کرتے تھے۔ حضور مہاراجہ بھادر کی ذات مبارک تو افلاطونی عشق کی اس منزل پر پہنچ چکی تھی جسے مرزا غالب نے یوں ادا کیا ہے۔۔۔

گر ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے

رہنے دو ابھی ساغر د میا میرے آگے

چنانچہ جنسی لحاظ سے ان مہمانوں پر تذکرہ تائیش کی کوئی قید نہ تھی، جسے ساغر ملتا تھا، وہ ساغر لے آتا تھا۔ جسے میا میسر ہوتی تھی، وہ میا حاضر کرتا تھا۔ پچھلے ستائیں برس سے پرانے سرفقہ بڑی باقاعدگی سے ساغر و میا کے اس کاروبار میں بڑھ چڑھ کے حصہ لے رہے تھے۔ سرکار کو ان کے حسن معاملہ پر بڑا بھروسہ تھا۔ اس وجہ سے دوسرے درباری دل ہی دل میں پرانے سرفقہ اور خانم سرفقہ کے خلاف بہت کڑھتے تھے۔ اب اگر وہ لو لو کے بغیر سری نگر پہنچ تو ستائیں برس کے بے داغ اور شاندار ریکارڈ کے بعد ان کی یہ پہلی نکست ہو گی۔

خانم سرفقہ کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو ٹپک رہے تھے، جو اس کے سلکی بلاوز پر پھیل کر جذب ہو جاتے تھے۔ لو لو بدستور غصے کے جوش سے کمان کی طرح تن پیٹھی رہی۔

مجھے افسوس ہے آٹی! میرا ذرہ بھر بھی ارادہ نہیں کہ آپ کو کوئی رنج پہنچے۔ لیکن میں آگے نہیں جا سکتی۔ مجھے کد سے واپس آنا ہی ہو گا۔“

”لو لو“ میری جان! تم بہت غصے میں ہو۔ اس وقت تم میری کوئی بات نہ مانو گی۔

میرے درویش کو اٹھنے دو۔ وہ تمہیں ضرور منا لے گا۔ میرا فقیر سب کو منا لیتا ہے۔ لولو
میری جان! دیکھو اب چڑھائی شروع ہو گئی ہے۔ یہ لو، ایک فروٹ ڈریپ چوس لو،
تمہاری طبیعت بشاش رہے گی۔ ”خانم سرفقدی نے اپنے پرس سے ایلیمن ڈریپ نکال
کر لولو کو دیا اور پھر آئینہ دیکھ کر اپنے چہرے پر محفلی پھر کے سے پوڈر کیا۔

اُدھم پور کے بعد بانہال روڈ کی چڑھائی شروع ہو گئی تھی۔ چچ در چچ چکر کھاتی
ہوئی سڑک میں بپھاڑ کے گرد ایک سیاہ اٹو ہے کی طرح لپٹی ہوئی جا رہی تھی۔ کشمیری
پروفیسر کی پنڈتیانی بیوی کا جی اب اور بھی متلانے لگا تھا۔ پروفیسر صاحب خود ہمہ تن گوش
بنے بیٹھے تھے۔ اور پنس سرفقدی خانم اور لولو کے ڈرامے کا ہر لفظ اور ہر سین بڑی محنت
سے ذہن نشین کر رہا تھا۔ پے در پے چکر ڈول کی وجہ سے رابرٹ لانگ کا جی بھی کچا ہونے
لگا تھا، اور وہ سیٹ پر سرٹیک کر آنکھیں بند کیے آرام کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

کوئی ایک بجے کے قریب جب اسٹیشن ویگن کد کے ڈاک بنگلے کے سامنے جا کر
رکی تو خانم سرفقدی کا معصوم درویش بھی اپنے مرابتے سے بیدار ہو چکا تھا اور پنس
سرفقدی اپنی پشت ہاپشت کی دربارداری کے آداب جمع کر کے لولو کی خوشامد میں لگے
ہوئے تھے۔ ان کی زبان کی مٹھاس میں بہت سی ریاستوں کے تخت اور تاج اپنے
تاجداروں سمیت ایک کمھی کی طرح بے دست و پا گرفتار تھے۔ بیچاری لولو کی کیا مجال تھی
کہ ان کے سحر سے نجع نکلتی۔ چنانچہ جب پنس سرفقدی اپنی خانم، لولو اور رابرٹ لانگ
کے ساتھ ڈاک بنگلے میں لنج پر بیٹھے، تو ساری رنجیں بیز کے جھاگ دار گلاسوں میں
ڈوب کر مٹ چکی تھیں۔ اور مچھلی مرغ، پلاؤ، کوفتہ اور بلائی دار سویوں کے ہر کورس
کے ساتھ دوستی اور وفاداری کا ایک نیا باب کھل رہا تھا۔

لنج کے بعد تیلوںہ کا اہتمام تھا۔ پنس سرفقدی اور خانم لباس شب خوابی زیب تن
کر کے ایک کمرے میں چلے گئے۔ لولو نے برآمدے میں آرام کری کو انتخاب کیا اور
راابرٹ لانگ کو نظام دین سنتے کی جستجو ہوئی، جو اس ڈاک بنگلے میں پانی لایا کرتا تھا۔ اس
نے ڈاک بنگلے کے بیرے سے نظام دین کے گھر کا پتہ پوچھا۔

بیرا رابرٹ لانگ کی معلومات کی وسعت اور اس کے انتخاب کی صحت پر مسکرا،
”صاحب، اس کی نانگ میں پھوڑا نکلا ہوا ہے۔ دس بارہ روز سے وہ چلنے پھرنے سے معدود

ہے۔ اور ڈاک بگھے میں پانی نہیں لاتا۔“

”کوئی بات نہیں۔“ رابرٹ لانگ نے کہا۔ ”تم مجھے اس کے گھر کا پتہ بتا دو۔ میں خود اسے دیکھنے جاؤں گا۔“

بیرے نے سر ہلا کر مایوسی کا اظہار کیا۔ ”کوئی فائدہ نہیں صاحب۔ اس کے پاس بڑا اچھا رانہ ہے، لیکن وہ اسے ہوا بھی نہیں لگنے دیتا۔ وزیر وزارت صاحب، پولیس کپتان صاحب، تحصیلدار صاحب، تھانیدار صاحب، سب کو شش کر رہے ہیں۔ ہم نے بھی آپ جیسے صاحب لوگوں کے لیے بڑے بڑے جتنی کیے ہیں۔ لیکن وہ حرامی نظام دین کسی طرح قابو میں نہیں آتا۔ اس کے پاس جانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ صاحب!“ اس اطلاع کے بعد بیرے نے یہ تجویز پیش کی کہ اگر صاحب کا جی چاہتا ہے تو وہ وہ منٹ میں خیرائیتی تیلی کی سترہ سالہ لڑکی لاسکتا ہے۔ شکل و صورت میں وہ کسی طرح نظام دین کی جیلیہ سے کم نہیں۔ اس کا خاص طراہ امتیاز یہ ہے کہ ایک روز جب سرکار یہاں سے گزر رہے تھے، تو ان کی نظر خیرائیتی تیلی کی بیٹی پر پڑی جو ایک تیلی سی چادر اور ٹھیک نیبی چشمے پر بیٹھی نہار ہی تھی۔ سرکار نے اپنی موڑ روکی، اور مودوی کیمرون کا نکال کر اس کے بہت سے فوٹو لے

رابرٹ لانگ نے بڑی کوشش سے بیرے کو یقین دلایا کہ اس کو خیرائیتی تیلی کی بیٹی اور اس کے خاص اعزازات سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ البتہ وہ نظام دین بہشتی سے ملنا چاہتا ہے۔ کیا بیرا اس کی مدد کر سکتا ہے؟

بیرے نے طوباً و کہاً خیرائیتی تیلی کی بیٹی کا بیان چھوڑ کر رابرٹ لانگ کی طرف مایوسی سے دیکھا جو اس رنگیں اور گداز حقیقت کو چھوڑ کر خواہ خواہ نظام دین کا کھمبانوچنے چلا تھا۔ خیر اس نے باور جی خانے سے ایک چھوکرے کو بلا کر رابرٹ نانگ کے ساتھ کر دیا کہ وہ اسے نظام دین سے کے گھر لے جائے۔

پھاڑی پگڈنڈیاں چڑھتے چڑھتے رابرٹ لانگ کا سانس پھول گیا۔ لیکن ان کا راہنمایا کا ایک سکسار گھری کی طرح بھاگتا، پھلانگتا، پھلتا بڑھتا گیا۔ پھاڑی کی ڈھلوان پر جا بجا خوشنما کوٹھیاں سانپ کی چھتریوں کی طرح ایستادہ تھیں۔ کہیں کہیں جھرنوں کا سرو د تھا۔ کسی جگہ ناشرپاتی کے درختوں سے جھولے بھی لٹک رہے تھے۔ کوئی ڈیڑھ دو میل چل کر

چیز کے گنجان درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جنگل کی ہوا ان درختوں کے پیچ بڑی صیب چینیں مارتی ہوتی گزرتی تھی۔ ان چینیوں کے علاوہ چاروں طرف گرا نانا تھا اور اس نالے میں نظام دین سنتے کی جھونپڑی واقع تھی۔ نظام دین اپنی جھونپڑی کے آگے ایک کھاث پر بیٹھا تھا۔ اس نے پھوڑے والی دائیں لانگ کھول کر دھوپ میں پھیلائی ہوتی تھی اور ہاتھوں سے پہاڑی سن گھٹے کی رسیاں بناتا رہا تھا۔ ڈاک بنگلے کے چھوکرے کے ساتھ ایک گورے صاحب کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا، اور حفظ ماقدم کے طور پر وہ اپنی لانٹھی کا سارا لے کر کھڑا ہو گیا۔

”خبردار“ نظام دین نے ڈاک بنگلے والے چھوکرے کو ڈاٹ کر لالکارا، ”تم اپنی ماں کے خصم کو کہاں لا رہے ہو؟ میں تم دونوں حرامزادوں کی گردن کاٹ دوں گا۔“

رابرت لانگ نے اپنی امن پسندی کے اظہار میں اپنا سفید رومال ہوا میں لرا یا۔

”تم یہ رومال اپنی ماں کو دکھاؤ۔“ نظام دین غصے سے پاگل ہو کر چلایا۔ ”یہ رومال اپنی بیٹی کو دو۔ یہاں کس سالی کے پاس آ رہے ہو۔ جاؤ۔ خبردار“ میں جان سے مار ڈالوں گا۔“

ایک چھوٹا سا پتھر سنتا ہوا آیا اور ڈاک بنگلے کے چھوکرے کے ننگے سر پر کھٹاک سے لگا اور وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اور نظام دین کو گالیاں دینے اور رونے لگا۔ رابرت لانگ نے دیکھا کہ نظام دین کے پیچھے ایک نو عمر لڑکی قیض کی جھولی میں پتھر بھرے بچھری ہوتی شیرنی کی طرح کھڑی تھی۔ باعثیں ہاتھ سے اس نے جھولی تھامی ہوتی تھی، اور دائیں ہاتھ سے وہ بڑی سرعت کے ساتھ پتھر نکال نکال کر رابرت لانگ کو نشانہ بناتی تھی، اس کی وجہ سے اس کے گال تتما رہے تھے اور اس کے پریشان بالوں کی ایک لٹ غصیلی ناگن کی طرح بل کھاتی ہوتی بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے آ جاتی تھی۔ رابرت لانگ پچھلی جنگ میں کئی محاذوں کا دورہ کر چکا تھا اور گولوں کی بوچھاڑ میں اسے آگے بڑھنے کی کافی مشق تھی! چنانچہ اس نے اپنی ہیئت کو ڈھال کی طرح سامنے کر کے سر جھکایا اور تیز تیز قلانچیں بھرتا ہوا نظام دین کے پاس پہنچ گیا۔ جیلہ سفیدے کے بوٹے کی طرح کاپنے لگی پتھروں کی جھولی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ ایک زخم خورده ہرنی کی طرح دردناک چینیں مارتی جھونپڑے میں بھاگ گئی۔ نظام دین نے اپنی لانٹھی ہوا میں

گھاکر رابرٹ لانگ پر دار کرنا چاہا۔ لیکن اس کے چھوڑے والی زخمی ٹانگ نے اس کا ساتھ نہ دیا اور وہ تیورا کے چارپائی پر گر گیا۔ اس بے بسی کی حالت میں اس نے بھی وہی کیا جو ہر بے بس انسان کرتا ہے۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹنے لگا۔

سینوگرافر

یہ شاید اس کا پہلا شعر تھا۔

”میرے سپنوں کے باغ میں دبے پاؤں کون آیا؟ مالی! اسے تھام لے! وہ میرے
شبہم کے موٹی چارہا ہے!“

ٹائپ کیے ہوئے کاغذوں کے پنڈے میں شاید وہ اپنا پرائیورٹ نوٹ پیپر رکھ کے
بھول گئی تھی۔ میں نے میز کی گھنٹی بجا کر اسے بلایا۔

”دیکھو گرسی، یہ شاید تمہارا کاغذ ہے۔“

”لیں سرا!“ وہ جھینپنی اور پھر اس کا گلا بھر آیا۔ جیسے میں نے اس کی ٹائپنگ میں
ہزاروں غلطیاں کپڑلی ہوں۔ ”سوری سرا! میری بھول سے دوسرے کاغذوں میں چلا آیا
ہے۔“

”جب تمہاری غزل پوری ہو جائے مس، تو مجھے دکھانا!“ میں نے مذاقاً کہا۔

اس نے ٹرے کی فائلوں کو اکٹھا کیا اور جلدی سے نکل گئی۔

اس روز شاید وہ سارا دن اپنی مکمل ہونے والی غزل میں کھوئی رہی۔ صبح صبح میں
نے کئی ضروری سرکلر لکھائے تھے۔ وہ شام تک ٹائپ کر کے نہ لائی۔

میں نے بلا کر پوچھا۔ ”سب کاغذ ضروری ہیں مس! ابھی ختم نہیں ہوئے؟“

”سوری سرا! میں فوراً لاتی ہوں۔“ اس کے لمحے میں انتباہ تھی۔

”اور غزل؟“ میں نے طعنہ دیا۔

میرا خیال ہے، میرے اس طنز سے اس کے دل پر چر کا سالگا۔ غالباً وہ اس اچانک
چوت کے لیے تیار نہ تھی۔ تھوڑی دیر بعد چڑا سی ساری ٹائپ شدہ فائلیں لے آیا۔

عموماً مجھے اس بھولی سی لڑکی پر ترس آتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ تیر کی طرح سیدھی اور بے مل تھی۔ وہ ابھی تک اپنے سکول کا نیلا فرماں پن کر دفتر آیا کرتی تھی۔ اب تک اس میں کلاس روم کی عادتوں کا پر تو تھا۔ سکول کی لڑکیوں میں جو البری بے باکی ہوتی ہے، گریسی میں ابھی تھی۔ اس کو فائدتوں کے انبار نے پانماں نہیں کیا تھا۔ ایک دن لکھاتے لکھاتے میں نے گرامر کی غلطی کی۔ گریسی نے ٹوک دیا۔

”دونوں طرح ٹھیک ہے۔“ میں نے اپنی پوزیشن کا لحاظ رکھنا ضروری سمجھا!

”نہیں، سرنیلسن کی ہائی گرامر میں اسے غلط ٹھہرا یا گیا ہے۔“

میں نے ہار مان لی۔ مجھے تلاش کے باوجود بھی اس کے نائپ کیے ہوئے پلندوں میں الٹا کی غلطی نہ ملتی تھی۔ اگر وہ سکول چھوڑنے سے پہلے سینٹر کیمرج کا امتحان پاس کر لیتی تو شاید دفتر میں اسے اگلا گریڈ مل جاتا۔

جب وہ کانگزوں کے ڈھیر میں نائپ رائٹر کے سامنے بیٹھتی تھی تو یوں نظر آتا تھا جیسے ایک سنجیدہ سے بچے کو زبردستی بزرگوں کے کپڑے پہنادیے ہوں۔ وہ بولتی بہت کم تھی۔ میں نے دو چار دفعہ اتفاقاً ”اے ہنستے دیکھا تھا۔ ایک بار اس وقت جب کچھ لکھاتے لکھاتے میری پنسل میز سے پھسل کر نیچے جا پڑی، میں نے دونوں پاؤں جوڑ کر کئی بار اسے اٹھانے کی کوشش کی، لیکن ناکام رہا۔ پھر میں نے گھنٹی بجا کر چپڑا سی کو بلایا۔ اس نے پنسل اٹھادی۔ گریسی بے اختیار ہنس پڑی۔

”کیا بات ہے مس؟“ میں نے پوچھا۔

”کچھ نہیں سر۔ مجھے کنگ بروس اور مکڑی کا قصہ یاد آگیا تھا۔“

چوت برجستہ تھی۔ لیکن مجھے زیادہ نہ بھائی۔ شاید گریسی کو بھی میرے تیور بُرے لگے۔ لیکن یہ میرا قیاس ہی قیاس ہے کیونکہ اس کا گول مول چڑہ اپنے کی طرح تھا جس میں جذبات کے پرنا لے بھی ہوں تو نشان چھوڑے بغیر جذب ہو جائیں۔

دوسری بار جب میں نے اسے ہنستے دیکھا تو نازک موقع تھا۔ اس روز دفتر کی ایک لیڈی اسٹنٹ مس مارگرٹ نے دو ماہ کی چھٹی کے لیے درخواست بھیجنی تھی۔ کلر کوں میں کانا پھوسی ہو رہی تھی اور وہ اپنے سیکشن کی نائپسٹ لڑکیوں کی طرف کن انگھیوں سے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ لڑکیاں جھوٹ موت نائپ کی مشینوں پر انگلیاں مار کے ایک

بھدا ساتر نم پیدا کرنے کی کوشش کر رہی تھیں اور مارگرٹ کی افسوس ناک مجبوریوں پر زیرِ لب تبصرہ ہو رہا تھا۔ گرسی نہ مسکراہٹوں میں شامل تھی۔ نہ چہ میگوئیوں میں وہ حسبِ معمول کاغذوں کا لپنڈہ لیے کھٹ کھٹ ناٹپ کر رہی تھی۔

”بد معاش!“ دفتر کے ہیڈ اسٹنٹ ایلش بابو نے مارگرٹ کی درخواست پر سفارش نوٹ لکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ اینگلو انڈین چھوکریاں آگا چیچھا تو دیکھتی نہیں اور پھر دو مہینے کی چھٹی مانگتی ہیں۔ دفتر نہ ہوا، باوا گھر ہوا۔ کس نے کہا تھا کہ سالے ٹائمیوں کے ساتھ دن رات رکشا میں گھوما کرو۔“ ایلش بابو نے قلم کان میں گھما کر کچھ ایسی ادا سے کہا، جیسے ٹائمیوں کی بجائے اگر مارگرٹ اس کے ساتھ رکشا میں گھومتی تو گویا محفوظ رہتی۔

پھر ایلش بابو نے کھیانی بلی کی طرح کن انگھیوں سے گرسی کی طرف دیکھا اور آواز میں لوح پیدا کر کے بولے۔ ”مس گرسی، تمہارا کیا خیال ہے؟ اگر مارگرٹ کے لیے صرف ایک مہینہ کی چھٹی کی سفارش کر دوں تو کام چل جائے گا۔ نا؟“

گرسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ۔۔۔ ناٹپ مشین چل رہی تھی۔ ”مغرور ہے سالی۔“ ایلش بابو جل کر بولے۔ پھر انہوں نے ٹائمیٹ لڑکیوں کی طرف دیکھا۔ ”دیکھوں لوں گا، جب سالی خود اپنی درخواست بھیجے گی۔“

لڑکیوں نے ایلش بابو کی خوشامد کے طور پر ہلکے ہلکے قبیلے لگائے، گرسی کا منہ تمتما گیا۔ اس نے دھک سے ناٹپ مشین پرے دھکیل دی، اور اپنی فائلوں کا لپنڈا اٹھا کر نکڑے نکڑے کر ڈالا۔ ”نعتا“ کمرے میں سکوت چھا گیا۔ کنفیڈنسل فائلوں کے نکڑے دیکھ کر سارے کلرک سسٹم سے گئے۔ ایلش بابو کان میں قلم گھماتے میرے کمرے میں آئے۔ میں نے گرسی کو بلا کر پوچھا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ”سوری سر۔ مجھے غصہ آگیا تھا۔“

غصہ! مجھے اس کی آزاد سادگی پر بہت نہیں آئی۔ ایلش بابو کھیانے ہو گئے۔ اگلے روز میں نے کئی کلرکوں کو دوسرے سیکشن میں تبدیل کر دیا۔

جس روز شینو گرافر کی آسامی کے لیے انٹرویو ہوا تھا، بہت سی لڑکیاں، امیدوار تھیں۔ قریباً سب نے اپنے چروں کو خاص اہتمام سے آراستہ کیا ہوا تھا۔ ان کی

سائزیوں اور گاؤنوں میں سیاقے کے مل تھے۔ جن کے سارے کمراور سینے کے خطوط والہانہ طور پر عربی ہو رہے تھے۔ گریسی نے فقط اپنے سکول کا نیلا فرائک پہنا ہوا تھا۔ اور اس نے ابھی سینٹر کیمرج کا امتحان پاس نہ کیا تھا۔

انڑویو کے وقت لڑکیاں زبان کی جگہ آنکھوں سے جواب دینے کی کوشش کرتی تھیں۔ ہر سوال پر ان کے ہونٹوں کی گلابی سی پتیاں ایک لطیف سی مسکراہٹ کو ٹھیک کرتیں۔ ان کی گردنوں میں ہلکے ہلکے خم اٹھتے، اور وہ اپنی زندگی کی ساری رعنائیوں کو اکٹھا کر کے بولنے کی جگہ گانے کی کوشش کرتیں۔ کسی کو پیانو میں مہارت تھی۔ کوئی مشاق ڈانسر تھی۔ ایک نے مویسیقی کے تنگے جیتے تھے۔ دوسری تیرنا بہت جانتی تھی۔ جب گریسی کی باری آئی تو بورڈ کے صدر نے کوالی فنی کیشن والا سوال دہرا دیا۔
”سرشارٹ ہینڈ اور ٹائپ کرنا جانتی ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔
”اوڑ؟“ بورڈ کے ایک ممبر نے کریدا۔

”سرشارٹ ہینڈ میں میری رفتار بہت تیز نہیں۔ لیکن میں مشق کر رہی ہوں۔“

”اوڑ کچھ“ دوسرے ممبر نے زور دیا۔

”سر آپ کو شاید شینو گرافر کی ضرورت ہے۔“ گریسی نے یاد دلایا۔

ترماخ! — انڑویو بورڈ کے ممبر گویا ایک دھماکے کے ساتھ پیانو اور ناچ اور گانے کی محفل سے دفتر کے کمرے میں آگرے! معاً انہیں یہ محسوس ہوا، اس چھوٹی سی لڑکی نے ان سب کے کان کھینچ دیے ہیں۔ ان کی بزرگی اور عظمت کو ایک پوشیدہ ساجھنا لگا۔ لیکن شاید مجبور ہو کر انہوں نے گریسی کو رکھ لیا۔

جب گانے اور ناچنے اور تیرنے والی لڑکیوں نے دیکھا کہ ایک بُنگی سی نیلے فرائک والی چھوکری ان پر بازی لے گئی ہے تو ان کی گردنوں کے لوج نکل گئے۔ ہونٹوں کی گلابی پتیاں بد نما طور پر بکھر گئیں اور انہوں نے ناک سکیڑ کر سوچا، آج یہ بورڈ کے ممبر کیا پہچانیں، بوڑھے کھوست —

جب وہ پہلے روز دفتر میں آئی تو ایک باپو سب سے اول چیل کی طرح اس پر جھپٹئے جس طرح ہر نئی ٹائپسٹ لڑکی پر سب سے پہلے جھپٹتا وہ اپنا حق سمجھتے تھے۔ چالیس پینتالیس سال کی مستقل گردش میں ان کے اگلے دو دانت اور سر کے بہت سے بال مگر

گئے تھے۔ لیکن ان کا ایمان تھا کہ ریٹائر ہونے میں آٹھ دس برس باقی ہیں۔ جب سرکار کو خود ان کی جسمانی اور دماغی حالت پر مکمل بھروسہ ہے تو ان سالی چھوکریوں کے ناک بھُوں چڑھانے سے کیا ہوتا ہے۔ ہاتھ لگ جائے تو رشوت اور عورت ایک برابر ہیں۔ اور یہ انگلوانڈیں لڑکیاں تو ہاتھ کا میل ہیں، ہاتھ کا میل۔ چلتی کا نام گاڑی ہے بھائی، روپیہ ہو تو سب حلال ہے۔ چنانچہ بابو ایلش چندر ہر مینے اپنی بالائی آمنی کا ایک حصہ اس ہاتھ کے میل کے لیے اٹھا رکھتے تھے۔ یوں بھی ان کے ہاتھ میں زنجیر کے دونوں سرے تھے۔ اگر ان کی چلتی ہوئی گاڑی کو ذرا سا ہچکولا بھی لگے تو لڑکیوں کی ترقی کے پروانے ایلش بابو کی لوہے کی الماری سے گم ہو جاتے تھے۔ ان کی چھٹی کی درخواستیں درازوں میں پڑی پڑی گرد سے اٹ جاتی تھیں۔ اور ان کی تنخواہوں کے بل میں غیر حاضریوں کے سُرخ سُرخ نشان نظر آنے لگتے تھے۔ لیکن اب شاید عمر میں پہلی باراً ایلش بابو کو محسوس ہوا کہ ان کی گاڑی کے پیسے کے سامنے ایک بڑا ساروڑا آپڑا ہے۔ اس لیے وہ گریسی سے زیادہ خوش نہ تھے، وہ جب ان کے سامنے آتی، تو ان کے منہ کے بائیں گوشے سے پان کی پیک نادانستہ طور پر بننے لگتی۔ اور ان کے مصنوعی دانتوں کا جبراً انگوروں کی ترشی کو بڑی شدت سے محسوس کرنے لگتا۔

دفتر نہ ہوا، سالا راہب خانہ ہوا!۔۔۔ ایلش بابو عموماً جھلایا کرتے تھے۔ گریسی کے آنے سے ٹانپنگ سیکشن پر سنجیدگی کا موٹا سالحاف گر جاتا تھا، جس طرح آدمی رات کے وقت کسی رقص گاہ میں گر جے کا پادری ہاتھ میں انجلی اٹھائے آکھڑا ہو۔۔۔ اس کی زندگی میں ایک سادہ سی، ساکن سی یکسانیت تھی۔ جیسے کلاک کی سویاں ۱۲ سے ۱۲ تک ایک ہی دائرے میں گردش کرتی رہیں۔ کلاک کی سویاں کہنا بھی غلط ہے۔ کیونکہ ان کے مدھم مدھم جھنکوں میں تو زندگی کے پُر اسرار لمحے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ گریسی تو شاید ایک معمولی سی چادر تھی جسے ہر صبح دھوپ میں سکھانے کے لیے کھڑکی میں ڈال دیا جائے۔۔۔ اور وہ شام تک لکھی رہے۔۔۔ دفتر میں جو اور ٹانپنگ لڑکیاں تھیں۔۔۔ ان کی زندگی میں رنگیں چور دروازوں کے کھلے ہوئے پٹ تھے۔ خفیہ کھڑکیاں تھیں، چھپے ہوئے روزن تھے، لیکن گریسی گویا ایک تاریک قبر میں رہتی تھی، کہ جس کے راستوں کو بڑی بڑی سلیں رکھ کر مسدود کر دیا گیا ہو۔ دن کے ایک بجے جب لنج کے لیے گھنٹے بھر کی رخصت ہوتی تو

ریفرمنٹ روم کی بلوہری میزوں کے گرد ایک ایک شمع اور کئی کئی پروانے جمع ہو جاتے۔ ایلش چندر اور ان گے ہم خیال بابو اس موقعہ پر اپنے ہاتھ کا میل شامی کبابوں، مرغ مسلم اور بیر کی رنگین بو تکوں کی شکل میں اُتار چینکتے تھے۔ جب ٹائپسٹ لڑکیاں اور لیڈی کلر کیس واپس لوٹتیں، تو ان کی آنکھوں کے پیوٹے بھاری بھاری ہو کر گرنے لگتے اور بیر کا خمار لوریاں بن کر انہیں تھپکنے لگتا۔ ایلش بابو کو بھی اس وقت گریسی کے ٹائپ رائٹر پر غصہ آتا تھا۔ کیونکہ اس کی نک اسکے ماحول کی خاموش موسیقی میں مانوس کر کردا ہیں پیدا کرتی تھی۔ گریسی کی میز کی دراز میں ایک چھوٹا سا پیکٹ پڑا رہتا تھا جس میں اپنے پنج کے لیے چار چھوٹے چھوٹے سینڈوچ باندھ لایا کرتی تھی۔ جب شام کے پانچ بجتے تو وہ بچی ہوئی فانکلوں کا بندل اٹھا کر سائیکل پر جا بیٹھتی تھی۔ مجھے کئی بار خیال آیا کہ میں اسے اپنی کار میں بٹھا کر گھر چھوڑ آؤں۔ لیکن کچھ بات تھی، کہ میری کبھی ہمت نہ بندھی۔ جب دوسری لڑکیاں دفتر کے دروازے میں نمودار ہوتی تھیں تو مشتا قان دید کا غول ان کو ہاتھ لیتا۔ کچھ خالی وردیوں والے ہوتے تھے، کچھ کپیوں اور دفتروں میں کام کرنے والے اینگلو انڈین چھوکرے! کبھی کبھی ہولٹوں کے گائیڈ اور رقص گاہوں کے دلال بھی اپنا پھندا اٹھائے پکنچ جاتے تھے۔ کسی لڑکی کو رکشا میں جگہ ملتی۔ کوئی وکتوریہ میں سوار ہو جاتی، کسی کے لیے نیکی منتظر ہوتی۔ اور پھر ان کی شام کا آغاز فرپوز میں چائے کے ساتھ ہوتا۔ لائٹ ہاؤس میں سینما، گریٹ ایسٹرن میں ڈنر، ڈانس اور وسکی کے چھمچاتے ہوئے پیگ جذبات کے انگارے۔ آگ دھووان اور رات کے پراسرار سائے۔ لیکن گریسی کی زندگی میں تو ایک سائیکل تھی، جس پر سوار ہو کر وہ تیز تیز چور گنگی سے گزر جاتی۔ نیو مارکیٹ سے چاکلیٹ یا ٹافی کا ایک پیکٹ خریدتی اور پھر گورا چند روڈ پر اپنے چھوٹے سے فلیٹ میں چلی جاتی۔ اس کی زندگی کا سرمایہ جارج تھا۔ ایک چھوٹا بھائی، جسے قدرت کی ستم طریفیوں نے گریسی کی امانت میں دے دیا تھا۔ جب جارج بغل میں کتابوں کا بچہ اٹھائے سکول سے لوٹتا تو گریسی کے لیے گویا زندگی کا ایک نیا دن طلوع ہوتا تھا۔ وہ شخصی سی لڑکی اپنی زندگی کا المحہ لمحہ جارج کے قدموں پر بچھا دیتی تھی۔ اگر اس کا بس چلتا، تو وہ ساری کائنات سمیٹ کر جارج کی جھوٹی میں ڈال دیتی۔

گریسی کے ذہن میں اپنے بچپن کے دھنڈے سے عکس تیرتے رہتے تھے۔ اس کا

باپ کلکتہ کی ایک اسٹینز کمپنی میں ملازم تھا۔ گریسی کو محض اتنا سایاد تھا کہ عام طور پر آدمی رات گئے ایک بد مست اور مخمور باپ شراب کے نشے میں چور گھر میں آیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ گریسی کی ماں کو بغل میں لے کر یوں جنجنجوڑ نے لگتا جیسے بھوکا کتا ہڈیاں چھوڑ رہا ہو۔ لیکن عموماً وہ آتے ہی غصے سے بے تاب ہو جاتا تھا۔ نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں میں شرارے سے چھوٹنے لگتے، اور وہ شور بے اور گوشت کی ہلیوں کو انداھا دھند بچاری بیوی کے سر پر دے مارتا تھا۔ کئی دفعہ اس نے گریسی کو بھی پینٹا تھا، یونہی بلا وجہ۔ اور گریسی کو اب تک یاد تھا کہ اس کا باپ کئی بار عجیب سی لڑکیوں کو گھر میں لے آتا تھا۔ پیلی پیلی، دھنسی ہوئی آنکھیں، زرد گالوں پر سُرخی اور پوڈر کے بدنما دھبے، بکھرے ہوئے بال۔ بانہوں پر ابھری ہوئی نیلی نیلی رگیں۔ ایک دفعہ ایک ایسی ہی سُرخ گالوں والی بد صورت لڑکی کئی روز ان کے گھر ٹھہری۔ اور جب جانے لگی۔ گریسی کے باپ نے گھر کے کپڑے، برتن اور زیور اٹھا کے نیکسی میں ڈال دیے اور سُرخ گالوں والی لڑکی کے بازو میں بازو ڈال کر چلا گیا۔ پندرہ برس سے گریسی کی ماں اُمید کا چراغ جلائے بیٹھی تھی کہ شاید نیکسی پر آدمی رات گئے ایک بد مست شرابی گھر میں آئے اور اس کی ہڈیاں چھوڑ کر رکھ دے اس بچاری کا سر ہلیوں کی چوت سننے کے لیے ترس گیا، لیکن جو نیکسی جا چکی تھی وہ واپس نہ آئی۔ جانے والا اس کی جھوٹی میں گریسی اور جارج دو نشانیاں چھوڑ گیا تھا۔ وہ ایک ہسپتال میں نرس بن گئی اور پندرہ برس تک اس نے اپنی دونوں امانتوں کو سنبھالا، ایک دن جب وہ ہسپتال سے نکلی تو ایک گزرتی ہوئی ٹرام نے اچانک اسے کچل دیا۔ اس کا سر پھٹ کر نکڑے نکڑے ہو گیا تھا۔ لیکن اس کے ہاتھ میں ابھی تک چاکلیٹ کے دو پیکٹ تھے، جو ہر شام گریسی اور جارج کے لیے خرید کر لے جایا کرتی تھی۔

خدا جانے وہ کون سا ازلی انصاف تھا، جس نے یکاکیں گریسی کو سکول کے کمرے سے نوج کر دفتر کی میز پر لا بٹھایا۔ وہ ابھی بچہ تھی۔ لیکن جارج کی خاطر اس نے اپنی زندگی کی شاہراہوں کو سمیٹ کر بینچے کر دیا۔ دفتر سے آتے ہوئے وہ ہر روز جارج کے لیے چاکلیٹ یا ٹانکی کا بندل لایا، نکلتی تھی۔ اس کے پاس اپنے سکول کے چند فرائک تھے، لیکن جارج کے لیے وہ ہرفیشن کے کپڑے سلوایا کرتی تھی۔ اتوار کے روز وہ اسے پک بک پر لے جایا کرتی تھی، ہر دوسرے تیرے روز وہ سینما چلے جاتے تھے۔ ان کے پاس کوئی

ملازم نہ تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں گھر سنبھالتی تھی۔ رات کے وقت جارج اس سے پریوں اور جنوں اور سمندری ڈاکوؤں کی کمانیاں سنتا تھا۔ اور پھر گرسی دفتر کی بچی ہوئی فالٹیں ٹاپ کرنے بیٹھ جاتی۔ زندگی کی اس ان تحک گر دش میں شاید ایسے لمحے بھی ہوتے تھے جو اس چھوٹی سی لڑکی کے دل میں سپنوں کے باغ کھلا دیتے تھے اور وہ کسی دبے پاؤں آنے والے چور سے شبہم کے موتی چھپا لیتی تھی۔

گرسی اب بھی شینو گرافر ہے۔ لیکن اب اس کے پاہ بست سے بھر کیلے فراک ہیں۔ شام کے وقت وہ سائیکل پر گھر نہیں جاتی۔ اسے رکشہ میں جگہ ملتی ہے یا دکٹوریہ میں یا کسی شاندار ٹیکسی میں۔ اور اب اس کی زندگی میں بھی فرپوز کی چائے ہے۔ لائٹ ہاؤس سینما، گریٹ ایسٹرن میں ڈر، ڈانس و سکی کے چھچھاتے ہوئے پیک۔ جذبات کے انگارے۔ آگ، دھواں اور رات کے پُر اسرار سائے۔

جارج بھی سیانا ہو گیا ہے۔ وہ آدمی آدمی رات گئے نئے میں چور گھر آتا ہے اور غصے سے بے تاب ہو کر شوربے اور گوشت کی پلٹیں گرسی کے سر پر دے مارتا ہے۔ کبھی کبھی اس کے ساتھ کوئی دھنسی ہوئی آنکھوں والی لڑکی بھی ہوتی ہے۔ پیلے پیلے گال نیلی رگیں، اُلجھے ہوئے بال۔ گرسی کے دل میں پیغم ایک زہرناک خدشہ لرزتا ہے کہ شاید وہ کسی روز ایک سُرخ بالوں والی لڑکی کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ کر چلا جائے گا۔ وہ اپنی زندگی کی ساری لڑیاں جمع کر کے روپوں کے جال بنتی رہتی ہے، تاکہ جارج اُڑنہ جائے۔ جارج کو روپیہ چاہیے۔ شراب کے لیے روپیہ، سُرخ بالوں والی بھدی لڑکیوں کے لیے روپیہ۔ گرسی اس کا ہاتھ خالی نہیں رہنے دیتی۔ وہ روپیہ لاتی ہے۔ وہ روپیہ کماتی ہے۔ اور وہ روپیہ چرتی ہے۔ دفتر کی تختواہ سے۔ صاحب کے تحفوں سے۔ ایک بابو کے ہاتھ کے میل سے۔ فرپوز سے۔ لائٹ ہاؤس سے۔ گریٹ ایسٹرن ہوٹل سے۔

مجھے معلوم نہیں زندگی کی اس سکون پرور آبشار میں یہ جوار بھاٹا کیسے آیا۔ پرسوں سے وہاں سے میرا تبادلہ ہو چکا تھا۔ جارج دینے سے پہلے میں نے نئے صاحب کو دفتر کے عملے سے ملایا۔ جب گرسی کی باری آئی تو انہوں نے چکپے سے میرا ہاتھ اپنی طرف بھینچا اور زیرِ لب ٹکنگائے۔ "گڈلارڈ پٹاخہ ہے بھی پٹاخہ۔" اس وقت میرے دل میں

دنعتا" یہ خواہش اُبھری کہ کاش دفتر کی چھت پر ایک زبردست بم کا گولا چھت جائے ۔۔۔
 جب میں ریل گاڑی پر سوار ہوا تو دفتر کا سارا شاف الوداع کرنے آیا ہوا تھا۔ ان میں گریسی
 نہ تھی۔ مجھے بڑی مایوسی ہوئی، کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ اس کے دل میں ضرور میرا احترام
 تھا ۔۔۔ لیکن جب گاڑی اگلے شیشن پر جا کر رکی تو میں نے دیکھا کہ وہ پلیٹ فارم پر
 پھولوں کی چھوٹی سی نوکری اٹھائے کھڑی ہے، جب انہوں نے پھولوں کا گلدستہ مجھے دیا تو
 اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ اس کے سینے میں نتھے نتھے خطروں کا طوفان سا الٹما ہوا تھا۔
 وہ بار بار کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے میرا بازو تھام لیتی تھی۔ میں نے اسے زندگی کے
 نشیب و فراز پر ایک چھوٹا سا یکپھر دیا۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹ گلاب کی پتوں کی طرح
 تھر تھراؤٹھے۔ جیسے آندھی کے تمیزدیوں نے انھیں اچانک جھنجھوڑ دیا ہو۔

"سر! میں کمزور نہیں ہوں۔ لیکن میرے دل میں ایک نامعلوم ساخوف سایا جا رہا
 ہے سر، مجھے معلوم نہیں کہ میرا دل اس قدر ڈوب کیوں رہا ہے۔ سر! ۔۔۔" وہ اس سے
 ہوئے پچھے کی طرح میرے قریب کھکتی آرہی تھی، جیسے ایک گری اور تاریک کھائی کے
 سرے پر بے یار و مددگار چھوڑ دیا ہو ۔۔۔

جب گاڑی چلنے گئی تو میں نے پہلی بار اس کے بالوں میں انگلیوں سے سکنگھی کرتے
 ہوئے اس کی ہمت بندھائی۔ گریسی نے میرا دیاں ہاتھ اٹھا کر اپنے ہونٹوں سے لگالیا۔
 اس کی پلکوں میں دو گرم گرم آنسو مچلے، اور ترپ کر میرے ہاتھ پر گر پڑے ۔۔۔ دو جلتے
 ہوئے انگارے جو ازال تک اپنے خاموش داغ چھوڑ گئے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ گریسی
 کے سپنوں کے خواب بھی اُجز گئے۔ اس کے عینم کے موتنی بھی لُٹ گئے۔ وہ جیتے جی مر
 بھی گئی ۔۔۔ لیکن اس کے دو غیر فانی موتیوں کو کون چھیز سکتا ہے جو میرے دائیں ہاتھ کی
 رگ رگ میں پوستہ ہیں؟

شلوار

”شلوار؟“ رشیدہ نے میز پر مکہ مار لے کیا۔ ”کبھی دیکھا بھی ہے تم نے کسی کو شلوار پہنے؟ نہ سمجھ نہ بوجھ،“ بس ہلا دی بالشت بھر کی زبان اور لگے افلاطون کے کان کاٹئے

” نیم بے توجی سے مُسکرا�ا۔ اس نے رُنگ کا دھواں گھما گھما کر منہ سے نکالا۔ ” وہ دیکھو بھائی،“ میں نے کیا اچھے رُنگ بنائے ہیں!“ ”الو“ رشیدہ غصتے سے بولی۔ ”میں شلوار کی بات کرتی ہوں،“ اور تم رُنگ بنائیں کر

”اچھا، بابا، اچھا۔ بتاؤ کیا کریں شلوار کو؟“ ”اپنے سر پر باندھ کر ناچو، اور کیا کریں؟ بد تمیز کیس کے، جو منہ میں آیا بک دیتے ہو۔ نہ موقعہ، نہ لحاظ، نہ شرم، اگر وہ بُرا مان جائے تو؟“ ”خدا کی قسم!“ نیم شرارت سے مُسکرا�ا۔ ”بُرا مزا آئے! میں نے اسی کو ستانے کے لیے تو کہا تھا، بھائی!“ ”بس یہی کرتب سیکھنا تم۔ جوں جوں بڑے ہوتے جاتے ہو توں توں عقل حکمتی جاتی ہے۔“

اور پھر یہ کایک نیم کو خیال آیا کہ شاید جیلہ نے سچ مج بُرا مان لیا ہو! آہا، ضرور چڑھنی ہو گی! اسی لیے تو وہ سرجھکائے سن سے باہر نکل گئی۔ اس کے گال ضرور لال ہو گئے ہوں گے، اور اس کے کانوں کے پیچھے نادم سی گرماہٹ پھیلی ہو گی۔ جبھی تو وہ سرسراتی ہوئی نکل بھاگی۔ درنہ وہ اسے دیکھ کر نہ سرتی، رکتی، بھجتی، جاتے ہوئے قدم قدم پر گھومتی

اور جیسے چاری کو یک لخت ساری بھولی ہوئی باتیں یاد آگئی ہوں ۔۔۔ ”بھالی میری اون ضرور بھیجننا۔ ہاں بھالی دیکھیو، بلکہ عنابی رنگ کی ہو ۔۔۔ اوی اللہ“ بھالی نے اپنی نئی چوڑیاں تو دکھائی ہی نہیں ۔۔۔ ”کبھی چوڑیاں دیکھنے، کبھی سلائیاں اٹھانے، کبھی جھوٹ موث کی باتیں دہرانے وہ جاتی، لوٹنی، گھومتی، اور نہ جانے کیوں ایک میٹھا سا ارتعاش اس کے سینے میں کپکپا نے لگتا، اس کے گالوں پر بلکل بلکل سی تمناہٹ دکھ اُٹھتی اور اس کی آنکھیں ۔۔۔ یا اللہ، اس کی بیکی بیکی نظریں کس طرح صابن کے رنگ برنگ بلبلوں کی طرح ہوا میں تیرتیں ۔۔۔ اور نیم کو یوں محسوس ہوتا کہ اس کا خون سگریٹ کے دھوئیں کی طرح رنگ بناتا ہوا اُبل رہا ہے۔ اور وہ چور چور سی آنکھیں اس کا ایکسرے کرنے پر تملی ہیں ۔۔۔

”جمیلہ ضرور چڑھنی ہو گی! شبنم کی طرح حساس تو ہی بھلا چڑھتی کیوں نہ؟“ نیم نے بھالی کو جنمبوڑا۔ ”میں کرتا ہوں بھالی، اس نے مراتا ہو گا!“

”چل بھیوارہ۔“ بھالی نے میز پر سے چائے کی پالیاں اکٹھی کرتے ہوئے کہا۔

”شرم تو نہیں آئی ہو گی ابھی؟“

”شرم؟ ارے واہ!“ بھالی کی جنمبلہٹ پر نیم ہٹنے لگا۔ اور ہستا گیا۔ یہ اس کی عادت تھی۔ جب وہ ہستا تو ہستے ہی جاتا۔۔۔ ہی، ہی، ہی۔۔۔ سفید سفید دانتوں کی بیتی ہے کہ نکلتی آ رہی ہے، دونوں رخساروں پر یہ گمرے گول گول گڑھے مچل اُٹھتے اور جب تک بھالی جھپاک سے ٹکھے کی ڈنڈی اس کے حلق تک نہ لے جاتی، وہ بند نہ ہوتا۔ جمیلہ پر تو نظر پڑتے ہی اس کا دل گدگدا نے لگتا اور وہ زور زور سے چلا تا۔

”بھالی، بھالی، لانا ڈنڈی! یہ پڑا دورہ۔۔۔ یہ۔۔۔ ہی، ہی، ہی۔۔۔ ہی، ہی۔۔۔“

نہ جانے کیوں، بھالی کو دورے کے نام سے وحشت تھی۔ سنتے ہی بلبا اٹھتی ”اللہ نہ کرے، کسی کو دورہ پڑے۔ میری توبہ نیم، تیرے منہ میں لگام بھی تو نہیں۔“ نیم کھل کھل کر مچلتا رہتا۔ جمیلہ بیٹھے بیٹھے سکڑتی سی جاتی۔ اس کا رنگ خواہ مخواہ قمزی سا ہونے لگتا اور نیم کا جی تملتا تاکہ میں اس گدری سی گٹھڑی کو رو بڑ کی گیند کی طرح دبا کر پچکا دوں! گیند؟ ارے معاز اللہ۔۔۔ جمیلہ کا چھر را بدن شستوت کی ٹھنڈیوں کی طرح جھومتی ہوئی نازک با نہیں، لمبی لمبی ناچھی ہوئی سی ٹانگیں، چھم چھم تھرکنے والے سڈوں پاؤں۔۔۔

جس دن وہ چوڑے پا تھوں والی کاسنی شلوار، نیلے موراکین کا چھولدار پھسا پھسا کرتہ، اور گلابی رشیم کا سر سراتا ہوا دوپٹہ پہن کر آتی، تو نیم کی آنکھیں چکا چوند ہو جاتیں اور جھپ جھپ پلکیں مار کر دروازے کے پردوں کے پیچھے کھلکتا جاتا۔ — ”آؤ میری چھلچڑی!“ — بھالی ہنس کر کما کرتی، — ”او نسوں!“ جیلہ گلابی ہونٹ بسوارتی۔ ”پہلے شبرات تو آنے دو، بھالی!“ نیم پردوں کو بانسوں پر لپیٹ کر گھومتا۔ اور انجان بن کر زور زور سے پوچھتا۔ ”شبرات آگئی بھالی؟ اور حلوہ؟“

”شبرات بھی آئے گی بھیا، ابھی تو چھلچڑی آئی ہے!“ بھالی شرارت سے کہتی۔

جمیلہ شرما کراپنا سر بھالی کی گود میں چھپا دیتی۔

نشیم خواہ مخواہ انجان بنتا ”آہا بھالی۔ چھلچڑی کیا، ہم تو انار لیں گے انار! چم چم کرتے ہوئے انگارہ سے انار۔ — پٹانے — گلابی گلابی، کاسنی کاسنی نیلے نیلے کاغذوں میں لپٹے ہوئے پٹانے — جودل کی گوینا ہلا کر رکھ دیں۔ — اور پھر بھالی کی ناک کی طرح تیز تیز نکملی چچھوند ریں۔“

بھالی زور زور سے ہنستی، اور اس کا ایک ہاتھ اپنی ناک اور دوسرا ہاتھ کی ڈنڈی پر جا پڑا! جیلہ سکڑتی بھالی کی گود میں دھنسنی جاتی، اور پھر بھالی اس قویں قزوں کے نکڑے کو دھکیل کر پیڑھی پر بٹھادیتی۔ — ”اب ہٹ بھی جیلہ پا گل کیں کی!“ نیم مجھ کر بھالی کے سامنے رکھی ہوئی نوکری میں سے مژوں کی پھلیاں اٹھاتے ہوئے چوری چوری جیلہ کی طرف رکھتا۔ — ”ویکھا بھالی میں نہ کھتا تھا، وہ گلابی جارح نہ لو۔ — رنگ کچا ہے!“

”اے ہے کچانہ کچا۔“ بھالی اپنے گلابی جارح پر دونوں ہاتھ پھیرتی۔ ”چار دھو دھل چکی ہے، لیکن دیسی کی دیسی تو پڑی ہے۔“

”ہاں ہاں، جی دیکھ لو، کچا ہے۔ جیلہ کے مٹہ پر کتنا لگ گیا ہے۔ — ہی ہی ہی۔ — ہی ہی۔ — ”وہ بھوول سے دانت کھلتے۔ قمقوں کی آندھی سی چلتی، بھالی کے ہاتھ کی ڈنڈی ہوا میں بلند ہوتی۔ — اور جیلہ اپنے تمٹاتے ہوئے بھجوکا سے گالوں کو کھنیوں میں چھپائے بھاگتی، جاتی، پھر رکتی، بھجتی، لوٹتی، گھومتی، — اور اس کو بہت سی بھوولی ہوئی باتیں یاد آ جاتیں، اپنی اون، بھالی کی چوڑیاں — اور پھر وہ ڈیوڑھی پر گئی ہوئی موٹی

سی جن اخہ کر چلی جاتی، جیسے آسمان کی رنگیلی پینگیں شام کے دھنڈ کے میں تخلیل ہو جائیں۔

نسیم کے دل میں طرح طرح کے ہواں قلعے بناؤ کرتے تھے۔ کبھی وہ سوچتا کہ جمیلہ ریشم کے پتلے پتلے دھاگوں میں بندھی ہوئی پنگ کی طرح آسمانوں میں اڑتی جا رہی ہے — اُونچی اُونچی، ستاروں کے جھرمٹ پھاندتی ہوئی — اور پھر وہ چاند کی پیشانی پر ایک سترنگے قلعے کی طرح جائیٹھتی —!! جب وہ کمکشاں کی دودھیلی کیاریوں کو ریکھتا تو اس کے دل میں بے باک سی، باغبانہ سی، جھلکیاں آنے لگتیں۔ جیسے جیلہ کی کاسنی شلوار اور نیلی قیض نے کمکشاں کے ایک بکھرے ہوئے آوارہ سے ٹکڑے کو اپنے دامن میں چھپا رکھا ہو! بادلوں والی رات، اسے ایک بھیانک اور منہوس ساخواب نظر آتی — وہ جنبجلا کر اپنی انگلیاں چبانے لگتا، کہ اس کا بس چلے تو وہ بادلوں کی چادر کو نوچ کر تار مار کر ڈالے۔ جس نے کمکشاں کی لطیف سلوٹوں پر گھنے گھنے سائے ڈال رکھے ہیں — اور نہ جانے کیوں، اسے جیلہ کی کاسنی شلوار اور نیلے موراکین کی قیض پر غصہ آنے لگتا — اور وہ دالان میں کھڑا ہو کر چاہتا کہ بھالی پنچے کی ڈنڈی زور سے اس کے حلق میں مار دے

ایک روز وہ مچھلی کے شکار کو گیا۔ ندی کا نیگلوں پانی، ہلکی ہلکی لہروں میں چھلک رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی، اُبھی ہوئی سی لہریں — سفید گلب کا ایک بڑا سا پھول ان کے بہاؤ میں تیز تیز جا رہا تھا — ڈگمگاتا ہوا۔ تھرکتا ہوا، کبھی وہ مچھلی ہوئی لہروں کے زیر و میں ڈوتا۔ کبھی اُچھلتا، پھر ڈوتا، پھر اُچھلتا — اور نیم کا جی بے اختیار اسکا کہ وہ دھم سے پانی میں کوڈ مرے، اور اس تیز رفتار پھول کو جھپٹ کر روک لے۔ جو جیلہ کی گول گول، سفید ایڑی کی طرح بھاگتا ہوا جا رہا تھا — جیلہ کی ایڑیاں! جب وہ اپنا تمباکیا ہوا چڑہ کہنیوں میں چھپائے ڈیوڑھی کی جن کی طرف بھاگا کرتی تو نیم چندھیائی ہوئی آنکھوں سے اس کی گول مول سڑوں ایڑیوں کا تعاقب کرتا، جن پر کاسنی شلوار کے آبشاری پانچے اور گردابی بل کبھی گرتے، کبھی اٹھتے، کبھی اٹھتے، کبھی گرتے —

اور پھر آخر شبرات آئی! بھالی عورتوں کی مجلسوں میں گئی ہوئی تھی۔ نیم کمرے میں بیٹھا پناخ گن رہا تھا۔ اتنے میں چھلچڑی آگئی! رنگین شراروں کی طرح چم چم کرتی اور

دلان میں کھڑی ہو گئی۔

”بھالی، یہ لوچچھوندریں!“ اس نے ہلکی سی نہی دبا کر کہا۔

نیم چونکا۔ ”اوہ، پھل جھڑی ہے؟ زرا پٹاخوں سے بچ کے رہنا!“

”میں تو بھالی کو پوچھتی ہوں۔“ جمیلہ نے ایک ادا کے ساتھ کہا۔

”بھالی نہیں ہے۔“ نیم خرگوش کی طرح بھاگتا ہوا آیا، اور مٹھی بھرپٹانے زمین پر

مار کے بولا۔ ”یہ گئے پٹانے! اب باری ہے چل جھڑی کی!“

جمیلہ شرمکر بھاگی، ہرنی کی طرح چوکریاں بھرتی۔ نیم بھاگ۔ مٹس، مٹس، مٹس

۔۔۔ پٹانے چھوٹ رہے تھے۔ جھرررر۔۔۔ جمیلہ کا پاؤں شلوار کے پانچھے میں الجھا اور وہ

دھڑام سے گری۔۔۔ نیم نے لپک کر سنبھالا، اور بانہوں پر اٹھایا۔۔۔ انار، شرارے!!

آگ!!! دونوں کھو سے گئے، جس طرح آتش بازی کے شعلوں میں دھواں کھو جائے۔۔۔

اور ایک بودھیا سی بے باک نانگ ہوا میں ناچنے لگی، جیسے قوس قزح کی لڑیوں سے

کمکشان کا دھارا پھوٹ نکلے! اور پھروہ جاگی، جھجکی، گھبرائی۔۔۔ اور بے اختیار بھاگی۔ اس

کا پھٹا ہوا پانچھے پیچھے پیچھے گھٹنے لگا۔۔۔ جس طرح چل جھڑی کے ساتھ ساتھ چچھوندر

بھاگ رہی ہو۔

دوسرے روز وہ آئی تو سفید یوسکی کا سیدھا پاجامہ پہنے ہوئے تھی۔ بھالی دیکھتے ہی چلائی۔۔۔ اے ہے۔۔۔ جی، یہ کیا لڑکا سی بن گئی ہو؟ شلوار کیا ہوئی؟“

جمیلہ کا پاؤں گرمائیا۔ ”کل پاؤں الجھا، تو پھٹ گئی۔ میں بھی تو دھڑام سے گری

بھالی۔۔۔ اب سب کے گھوڑے پانچھے چھوٹے کروانے دے دیئے ہیں۔“

”توبہ! چوت تو نہیں آئی؟“ بھالی نے پوچھا۔

”بہت ہلکی سی!“۔۔۔ جمیلہ نے ایک چھپے ہوئے سرور کی جھر جھڑی لے کر کہا۔

اور پھروہ یک ایک جھپنسی۔ اور بات ٹالنے کے لیے بولی۔ ”کل کا جلسہ کیسا رہا بھالی؟“

”بڑے مزے کا۔۔۔ بیگم غیاث نے اچھا خطبہ دیا، تم کیوں نہ آئیں؟“

”یو نہی رہ گئی۔۔۔ خطبے میں کیا کہا؟“

”بہت سی باتیں، شرات کی فضیلت، اور نہ جانے کیا کیا؟ توبہ، سب کچھ یاد بھی تو

نہیں رہتا۔۔۔“

”بھالی! شبِ برات میں فرشتے اُرتے ہیں؟“ نیم نے پردے کے پیچھے سے مُنہ نکال کر پوچھا۔

”اللہ میاں کی رحمت ہے بھالی۔ فرشتے تو آتے ہی ہیں۔“ بھالی نے ایک قسم کی روحاںی زندگی سے کہا۔

”اور حوریں — بھالی؟“ جیلہ نے آنکھیں جھکا کر شرارتاً ”پوچھا۔“

”ہاں ہاں — ضرور!“ نیم چلا یا۔ ”لیکن پھٹی ہوئی شلواروں والی۔“

جیلہ کے گالوں پر گلابی ڈورے آئے اور وہ پانی کے ریلے کی طرح مچل کر بھاگ گئی۔

”توبہ! ایسی بات بھی کوئی کہتا ہے بھلا؟“ بھالی نے چائے کی پیالی کھٹ سے پرج میں رکھ کر کہا۔

”میں نے کوئی اسے کہا تھا کچھ؟ شلوار کی بات تھی!“

”چل چپ رہ۔ بدھا ہو گیا ہے اور بات کی تمیز نہیں۔“

”تو میں کیا کروں بھالی — ؟ یہ لباس ہی بدتمیز ہے!“ نیم نے بات ٹالی۔
بھالی کو بھی غصہ آگیا۔

”شلوار؟“ اس نے میز پر مکامار کے کما۔ کبھی دیکھا بھی ہے تم نے کسی کو شلوار پہنے۔“

جگ جگ

”جگ جگ، حضور؟“ سفید داڑھی والے بیرے نے کافی کی پیالی میز سے اٹھا کر پوچھا۔

افضل نے کہا ”لے آؤ۔“ کلکتہ میں آتے ہی ڈرام میں اس نے کسی کو پہلی بار جگ جگ کئے نا تھا۔ وہ سمجھا کہ ڈم ڈم یانع نج کی طرح کسی جگہ کا نام ہو گا۔ اب رات کے کھانے پر جب ہوٹل کے بیرے نے پوچھا، ”سوپ حضور؟“ تو افضل نے کہا۔ ”لے آؤ۔“ کللس حضور؟ — ”لے آؤ!“ سلطانہ پنگ حضور؟ — ”لے آؤ!“ — جگ جگ حضور؟ ”لے آؤ۔“ افضل نے سوچا کوئی چینی مٹھائی ہو گی۔ پھر اسے خیال آیا کہ شاید شراب ہو۔ اس خیال سے اس کے رو گنوں میں کچھی سی ہوئی۔ کیونکہ وہ ابھی شراب کو منہ لگانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے دل میں فرشتہ بننے کی خواہش بھی نہ تھی۔ لیکن ہر چیز کے لیے اس نے زندگی میں خاص خاص منزلیں بنا رکھی تھیں۔ مثلاً سگرٹ — کالج میں کئی بار سگرٹ پینا چاہتا تھا۔ لیکن اس آرزو کی تجھیل کو اس نے ایم اے پاس کرنے تک اٹھا رکھا تھا۔ چنانچہ اب وہ چار مینے سے سگرٹ بھی پیتا تھا، اور جی بھر کر پیتا تھا۔ اس کی زندگی کی شاہراہ میں اگلی منزل کا نشان قدیسہ کا بام یہی کوئی دوچار ہاتھ دور تھا۔ کیونکہ وہ اس کی مسکیت تھی۔ اور اگلے مینے کی دس تاریخ کو رو اجا۔ اس کی ملکیت میں آنے والی تھی۔ انسان کی تعمیر میں کچھ پوشیدہ رکیں ایسی بھی ہیں جو آرزوئے ملکیت چرے اغتیار پہنچ کر اٹھتی ہیں۔ افضل کے پاس روپیہ تھا۔ اور جب بُک کی پاس بُک پکار کر کہتی تھی کہ میاں افضل! یہ سب روپیہ تمہارا ہے، محض تمہارا۔ تو اسے ایک خفیہ تیکین ہوتی تھی۔ اور وہ لمحہ بھر کے لیے جعلی دستخط بنانے والوں کو بھی بھول جاتا تھا! لاہور کے

ماڈل ٹاؤن میں جب اس نے ایک چھوٹی سی خوش نما کو بھی بنوائی، تو اس کی پیشانی پر بڑے بڑے حروف میں "افضل کدہ" لکھوا یا گیا۔ اور انگریزی میں، نیچے اردو میں۔ جب کوئی راہ گیر اچانک اس نام کو پڑھ کر گزر جاتا تو، تو شاید افضل کی کوئی خاموش رُگ مطمئن ہو جاتی تھی، کہ شکر ہے۔ گزرنے والے کو یہ دھوکا نہیں لگا کہ شاید یہ خوبصورت مکان کرم بخش کا ہو، یا طوطارام کا —

اب اگلے میںے اس کی ملکیتی جاندا میں قدیسہ کا لپکتا ہوا چھر را جسم بھی شامل ہونے والا تھا۔ قدیسہ کو پالینے کے بعد افضل کے ارض و سما ایک دھندلی سی افقی لکیر میں کھو جاتے تھے۔ کبھی وہ سوچتا تھا کہ وہ انارکلی میں کپڑوں کی ایک بہت بڑی دکان کھول لے گا۔ کبھی اس کا تخيّل قدیسہ کو لے کر تاج محل اور اجتنا آرٹ کی سیاحت کے لیے چل نکلتا تھا۔ بسا اوقات اس کے تصور میں ارغوانی لروں والے چھماتے ہوئے پیگ گھوم جاتے تھے۔ اصل میں قدیسہ کے بعد افضل کی تمناؤں پر زنگ سالگ جاتا تھا۔ اور اسے خود محسوس ہوتا تھا کہ شاید اس کی زندگی اس گرم گرم دیکھتے دیکھتے ہوئے کوئی کی طرح رہ جائے گی۔ جسے پانی میں ڈال کر چحن سے بجھا دیا گیا ہو۔۔۔ افضل آوارہ مزاج نہیں تھا۔ وہ آسودہ مزاج تھا۔ آسودگی ساحل کے کنارے بیٹھ کر لہرس گنتی ہے۔ آوارگی ان لروں کی آغوش میں کو دیتی ہے۔ چنانچہ جب افضل کو معاً یہ خیال آیا کہ شاید جگ جگ کسی شراب کا نام ہو۔ تو وہ گھبرا سا گیا۔ وہ ابھی شراب پینا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے لاکھ عمل میں شراب کی منزل عورت کے بعد تھی۔ عورت کا وجود قدیسہ کا وجود تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کی کائنات میں عورت کا روپ یا تماں کا روپ ہوتا ہے، یا بن کا یا بیوی کا۔۔۔ وہ عورت کو ایک ست رنگی پینگ نہیں سمجھتا تھا۔ جو انسان کی زندگی پر قوس قزح کی طرح تھی ہوئی ہے۔ جب وہ قدیسہ کو پالے گا تو سمجھے گا کہ دنیا کے ساتھ اس کا ایک ضروری حساب بے باک ہو گیا ہے۔ یعنی سارے جہاں کی عورتوں میں اس کے حصے کا جو نکلا تھا، وہ اسے مل گیا۔ افضل نے کبھی کسی سے محبت نہ کی تھی۔ لیکن پیدا ہوتے ہی اسے حق ہو گیا تھا کہ ایک خاص عمر پہنچ کے وہ دنیا سے اپنے حصے کی عورت مانگ سکتا تھا۔۔۔

ہوٹل کا ڈائینگ روم کھچا کھج بھرا ہوا تھا۔ تیز تیز برقی قلعے جگہ جگہ جل

رہے تھے۔ افضل کے سامنے والی میز پر ایک ادھیر عمر کا آدمی اور ایک جوان عورت بیٹھے ہوئے آئس کرم کھارہے تھے۔ ایک بیرا بمانے بمانے جمک کر میز کے نیچے نظر دوڑاتا تھا۔ ادھیر عمر والے آدمی کے گھٹنے جوان عورت کے گھٹنوں سے ملے ہوئے تھے۔ اور ان کے پاؤں ایک خاموش تال پر ناچ رہے تھے۔ — باہمیں طرف ایک بھڑکی سی لڑکی بناؤ سنگار کیے بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ ایک میلے کپڑوں والا لڑکا تھا۔ اس کے سامنے چائے کی پیالیاں تھیں۔ لیکن وہ نہ تو چائے پیتے تھے، نہ آپس میں بولتے تھے۔ دونوں کی نگاہیں ہال کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک گھوم رہی تھیں۔ یک ایک افضل کی نگاہیں لڑکی سے ملیں۔ وہ جھینپ گئی۔ افضل نے پھر دیکھا۔ وہ مسکرا پڑی، اور اس کے سفید دانتوں کی لڑکی سرخ ہونٹوں کے درمیان موٹیوں کی طرح جگنگا اُٹھی۔ وہ دیر تک کن انگھیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکراتے رہے۔ پھر وہ میلے کپڑوں والا لڑکا کسی بمانے اُٹھ کر چلا گیا۔ لڑکی نے گول گول آنکھیں گھما کر خالی کرسی کو دیکھا۔ پھر اس نے چائے کی پیالی کو چچے سے مدھم مدھم سُر میں بجانا شروع کیا۔ اس جلتِ نگ کی آواز افضل کو اپنی طرف بلانے لگی۔ لیکن اس نے تو گاؤں کی سنسان گلیوں میں بھی کسی ایک لڑکی کو کھلے طور پر گھورا نہیں تھا۔ اب اس بھرے ہوئے ہال میں وہ اس اجنبی لڑکی کے ساتھ کیسے جا بیٹھتا؟ اس کے دل میں ایک عجیب سا اضطراب ہونے لگا۔ جس میں غصہ تھا۔ مایوسی تھی، عزم تھا، شرم تھی۔ لیکن وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ وقت کا پیچھی اور دریا کی لہر کسی کا انتظار نہیں کرتے۔ یہی اصول عورت کا ہے۔ افضل اپنے عجیب سے اضطراب میں الْبُجَارہَا۔ اتنے میں ہال کے دوسرے کونے سے ایک لڑکھڑاتا ہوا آدمی آیا۔ اور مدھم سے لڑکی کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ بیرے نے جلدی سے آکر کھانے کا آرڈر لیا۔ ان دونوں کے گھٹنے میز کے نیچے مل گئے۔ انکے پاؤں کسی خاموش تال پر ناپنے لگے اور افضل کو بیٹھے بٹھائے یوں محسوس ہوا کہ اس لڑکھڑاتے ہوئے شرابی نے چانٹا مار کر اس کے منہ کا سگریٹ چھین لیا ہے!

اتنے میں سفید داڑھی والا بیرا دروازے میں نمودار ہوا۔ افضل کو احساسِ ٹکست نے اداں کر دیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اپنی کم ہمتی پر شرمندہ ہو رہا تھا۔ اگر جگ جگ کوئی تیز اور تند شراب بھی ہوتی تو اس وقت افضل ضرور دو گھونٹ بھی پی لیتا۔ لیکن جب

اچانک سفید داڑھی والے بیرے نے اس کے سامنے شراب کی جگہ ایک چھلکتی ہوئی عورت کو لا بھایا، تو اس کے قدم لڑکھائے۔ جیسے چاند کے لیے خند کرنے والے بچے کے ہاتھ میں سورج کا دہکتا ہوا الاؤ رکھ دیا جائے! اس نے بیٹھتے ہی میز کے نیچے اپنے گھٹنے افضل کے گھٹنوں سے ملا دیے۔ وہ ترپ کر پیچھے ہٹ گیا۔ عورت مسکرانے لگی، جیسے کہ رہی ہو۔ ”میں تمہاری ماں نہیں ہوں، بُن نہیں ہوں، مجھ سے ڈرتے کیوں ہو؟۔۔۔“

”بُوائے! میرا بُل لاؤ۔“ افضل نے زور سے جیخ کر کما۔

آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں نے اس بد تیزی پر ناک چڑھائے۔ وہ عورت غصے سے کانپ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے موٹے موٹے نتھنے پھول گئے اور اس نے سفید داڑھی والے بیرے کو قبر آلوں نظر سے دیکھ کر کما:

”تھو“ غفور چاچا، سفید بال ہو گئے تیرے، پر آدمی کی پرکھ نہ آئی اب تک۔“ اور پھر وہ تیرتی ہوئی مرغابی کی طرح میزوں کے گرد منڈلانے لگی۔ ایک موٹا سا آدمی و سکی کا گلاس سامنے رکھے اونگھے رہا تھا۔ اس نے نیم باز آنکھوں سے اس عورت کو دیکھا اور زیر لب بڑو بڑا یا۔

”جُک جُک؟“ عورت نے مسکرا کر کما۔ اور پھر وہ دونوں گھٹنے سے گھٹنا جوڑ کر بیٹھ گئے۔

ہوٹل کے باہر فٹ پاٹھ پر ایک نو دس برس کا گول مٹول سا چھوکرا اس کی طرف پکا ”گوری بی بی، جناب؟“ چھوکرے نے افضل کی انگلی پکڑ کر پوچھا۔
افضل نے اسے جھڑک دیا۔

”کالی بی بی جناب؟“ چھوکرے نے دوسری پیش کش کی۔

افضل نے پھر اسے ڈانت دیا۔

”جُک جُک جناب؟“ چھوکرے نے اصرار آکما۔

افضل نے اسے دھکا دے کر پرے پھینک دیا۔

افضل میں اخلاقی جرأت کے ساتھ ساتھ ظرافت کا نادہ بھی عنقا تھا۔ ورنہ وہ اس گول مٹول چھوکرے کو دھکیل کر پرے نہ ہٹاتا۔ وہ نخا سالڑا کا راہ گیروں پر لپک لپک کر

ان کے معیار کا سودا کیا کرنا تھا۔ اس کے یوپار میں کئی قسم کی جنس تھی۔ کالی بی بی اور گوری بی بی کی رنگت میں امتیاز تھا، نسل میں فرق تھا، بازار الگ الگ تھے۔ قیمت جدا جُدا تھی — لیکن جگ جگ ایک بین الاقوای چیز تھی۔ وہ بینی نوع انسان کی مشترکہ جائیداد ہے۔ اس میں کالے گورے، پیلے، بھورے کی تمیز نہیں۔ وہ ہر جگہ ہے اور ہر کسی کے لیے ہے۔ نوکری میں رکھے ہوئے تربوز کی طرح، جس کی ایک پھانک کاٹ کر اسے خفیہ طور پر نگاہ کر دیا ہو۔ افضل جس طرف جاتا تھا۔ اس کے سامنے جگ جگ آ جاتی تھی۔ لکلتے کی ساری شاہراہیں ایک ہی منزل پر مل رہی تھیں۔ نیکیوں میں جگ جگ تھی۔ رکشاوں میں جگ جگ تھی۔ گھوڑا گاڑیوں میں جگ جگ تھی۔ وہ سرسراتی ہوئی خوبصورت سائزیوں میں تھی۔ اس نے رنگ برنگ فراق پنے ہوئے تھے۔ وہ عظیم الشان کمروں میں تھی۔ وہ خوشناپدوں کے پیچھے تھی، وہ جہاں کہیں بھی تھی، جو کچھ تھی نوکری میں رکھے ہوئے تربوز کی طرح تھی جس کی ایک پھانک تراش کر اسے خفیہ طور پر نگاہ کر دیا ہو!

وہ ایک لدی ہوئی ژرام میں پھنس کر کھڑا ہوا تھا۔ اس کے پہلو میں ایک نازک سی لڑکی تھی۔ جس کے تراشے ہوئے بال پھولوں کی طرح ملک رہے تھے۔ جب ژرام رکتی تھی، تو ہر ہچکو لے کے ساتھ اس لڑکی کا سارا بوجھ افضل کے کندھوں پر آگرتا تھا، اور اسے یوں محسوس ہونے لگتا تھا جیسے عطروں میں باہوا ریشم کا تھان اس پر ڈال دیا ہو — وہ دل ہی دل میں دعا کرنے لگتا کہ ژرام قدم قدم پر رکے، اسے گام گام پر ٹھوکریں لگیں اور پھر وہ کسی دوسرے ژرام سے ٹکرا کر ٹوٹ جائے — جیسے تارے ٹوٹتے ہیں۔ لیکن دعا منوانے کے لیے بھی ہمت درکار ہے۔ ژرام گز گز اتنی بھاگی جا رہی تھی۔ ایک تند خونوجوان کھلکھلتا ہوا آگے بڑھا اور ان دونوں کے درمیان گھس کر کھڑا ہو گیا۔ اب افضل کو شاید پہلی بار یہ تجربہ ہوا کہ ہچکو لے لئے کے لیے ضروری نہیں کہ ژرام کو جگہ جگہ رکنا پڑے۔

”نان نس“ اس لڑکی نے غصے سے نوجوان کو ڈانٹا۔

”جگ جگ!“ نوجوان نے اس کے کندھے پر ٹھوڑی رگڑ کے کما۔

”جگ جگ!“ وہ مُسکرا پڑی —

عین اس وقت افضل کو سفید داڑھی والا بیرا یاد آگیا۔ اور پھر وہ بھڑک لی لڑکی جو چائے کی پیالی پر چمچے مار کے جلت نگ بجارتی تھی۔— لیکن پھر اچانک اسے قدیمہ یاد آگی۔ اس نے اپنے آپ کو ایک زبردست گالی دی۔ وہ گلکتے میں شادی کا سامان خریدنے آیا تھا۔ اس کا یہ مطلب تو نہ تھا کہ وہ ہر راہ چلتی عورت کے قدموں میں پامال ہو جائے۔ اس نے جیب سے چیزوں کی فرست نکالی اور ایک بہت بڑی دو منزلہ دکان میں چلا گیا۔ یہ دکان گلکتے کی بڑی دکانوں میں سے تھی۔ اس میں مختلف چیزوں کے لیے الگ الگ سیکشن تھے۔ ہر سیکشن میں گاہوں کی مدد کے لیے آدمی یا عورتیں مامور تھیں۔ سیشنسی والے تھے میں ایک خریدار کاؤنٹر پر جھکا ہوا تھا۔ ایک درمیانی عمر کی عورت جس کے چہرے پر جھریلوں کی پہلی لہراٹھنے والی تھی، بڑی مستعدی سے چیزیں نکال کر لا رہی تھی۔ رائینگ پیڈ، لفافے، سیاہی۔۔۔ اور پھر خریدار نے ادھر ادھر دیکھ کر زیر لب کہا ”جگ جگ!“ عورت کے سنبھال چہرے میں کچھ تبدیلی ہوئی۔ اس نے احتیاط سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر مسکرا پڑی۔

ایک خوبصورت اور نوجوان جوڑا سنگار کی الماریوں کے پاس گھوم رہا تھا۔ وہ دھیمی دھیمی آواز میں سرگوشیاں کر رہے تھے، اور ان کی بے تاب آنکھیں ایک دوسرے کو اپنی اٹھاگھرائیوں میں ڈبو رہی تھیں۔ تین بے باک چھو کرے سکرٹ پیٹے ان کے پاس سے گزرے۔ انہوں نے بنی ٹھنی ہوئی دلمن کو گھوڑ کر دیکھا۔ پھر وہ تینوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور سکرٹ کا دھواں زور زور سے موم کے ان رنگیں مجسموں پر چھوڑنے لگے۔ جونما کئی سازھیاں، گاؤں اور فرآک پہنے کھڑے تھے۔

ان مجسموں کے اعضاء اقلیدس کی عظلوں کی طرح مناسب تھے۔ ان کے انداز میں دنیا بھر کی رعنائیوں کو منجد کر دیا گیا تھا۔ اگر کوئی آرٹ اس کے بدن میں تھوڑا سا لوح، تھوڑی سی حرارت ڈال سکتا تو یقیناً گاؤنوں، فرآکوں اور سازھیوں کے ساتھ وہ بھی منگے داموں بک جاتے۔

افضل ایک مجتنے کے سامنے کھڑا ہو گیا جس نے سلمی ستارے والی آسمانی سازھی پہنی ہوئی تھی۔ وہ اس کے رنگیں رخساروں کو دیکھتا رہا۔ اور پھر سازھی دیکھنے کے بہانے اس نے مجتنے کی ٹھوس کمر کو زور سے دباریا۔ اس کے دل میں ایک زبردست خواہش

اُبھری کہ وہ لپک کر اس موم کی مورت سے پٹ جائے اور اس کے کانوں میں جیج جیج کر کے ”جگ جگ، جگ جگ، جگ جگ۔۔۔“

”کیا میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں؟“ عقب سے ایک نوجوان چھوکری نے پوچھا۔
افضل اچک کر ایک طرف ہو گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی فراک والے مجتنے میں یا کایک جان پڑ گئی ہے۔

”جی ہاں، مجھے کچھ سائز ہیاں چاہئیں، کچھ فراک۔۔۔“ اس نے جلدی جلدی جواب دیا۔ گھبراہٹ میں وہ اور کوئی بات نہ بنا سکا۔

وہ لڑکی اسے ایک تکونے کر رے میں لے گئی۔ اور الماریاں کھول کر قسم کی سائز ہیاں نکالنے لگی۔ افضل کا دل زور زور سے پسلیوں کے ساتھ ٹکرا رہا تھا۔ وہ سائز ہیوں کی جگہ فراک والی لڑکی کو دیکھنے لگا۔ لڑکی نے شرارت سے منہ پھلا لیا۔ اور پھر ایک ملامم سی ریشی سائز کے نیچے ان کی انگلیاں اچانک مل گئیں۔ وقت کی رفتار لمحہ بھر کے لیے تھم گئی۔ افضل کے دل کی گمراہیوں سے جگ جگ کا الفاظ ایک متانہ ترنم کے ساتھ ابھرا، لیکن گلے تک آکر انک گیا، جیسے ناچتی ہوئی رقصہ کا پاؤں دھم سے اگالدان میں پھنس جائے۔۔۔ اس نے جلدی جلدی سائز ہیوں کا لپندا سنجالا اور باہر نکل آیا۔ سڑک کے کنارے ایک خالی رکشا والا پسئے سے لگا اونچھ رہا تھا۔ افضل اچک کر اس میں سوار ہو گیا۔ رکشہ والا ہر بڑا کر اٹھ بیٹھا اور نیم خوابی کی حالت میں بولا ”کہاں چلیں گے حضور؟ دھرم تلتے؟“

”حرامزادہ“ افضل کڑک کر بولا ”دھرم تلتے میں تیری ماں ہے سالے؟“ رکشا والے نے ایک زور کی جمائی لی۔ وہ ایک سدھے ہوئے گھوڑے کی طرح رکشا میں جوت گیا۔ اب اس کی نیند بھی دور ہو گئی تھی۔

”جگ جگ، حضور؟“ اس نے رکشا کھینچتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں سالے ہاں۔“ افضل دوبارہ کڑکا۔ جگ جگ ماں نہیں ہے، جگ جگ، میں نہیں ہے، جگ جگ بیوی نہیں ہے۔۔۔ تو کیا جگ جگ سانپ ہے؟ وہ اپنے ڈرپوک ضمیر سے لڑتا جا رہا تھا!

آیا

وہ تھی تو سانولی سی، سادہ سی، معمولی سی، لیکن اس کے جسم میں جوانی کا تناؤ تھا۔ سول لائے کے حلقوں میں مسٹر رام لال کی آیا کا چرچا تھا۔ سر شام جب وہ پریمبو لیشر میں رام لال کے بچے کو بھاکے نکلتی تو سول لائے کے افق پر گویا چاندنی سی چھا جاتی تھی۔ وہ بھی اپنے بدن کی مقناطیسی قوت سے بے خبر نہ تھی۔ وہ اپنے بالوں میں بگال کیمیکلز کا مشک بُو کو کونٹ ہیر آئیل ڈال کے سکنگھی چوٹی سے آراستہ ہو کر نکلتی تھی۔ ماتھے پر بندی، ہونٹوں پر مسٹر رام کی سنگار میز سے چڑائے ہوئے لپ اسٹک کی دھڑی، ناخنوں پر عتابی پاش، گردن میں خم، چھاتی میں ابھار، گالوں پر پاؤڑر، آنکھوں پر لگاٹ۔ کوٹھیوں کے خاناماں باورچی خانے چھوڑ کر اس سے راز کی ایک بات کہنے سڑک پر آ جاتے تھے۔ مہتر کمود کے پاث جھاڑیوں کے پیچھے چھپا کر اس سے نیاز حاصل کرنے کی تلاش میں منڈلاتے رہتے تھے۔ سفید برائق وردیوں میں ملبوس بیرے جیبوں میں بسکٹ اور دل میں ارمان دبائے اپنی دیوی کا انتظار کرتے تھے۔ چمکیلی کاروں میں فرائٹ بھرتے ہوئے دیدہ زیب، خوش لباس، دل پھینک بوڑھے اور جوان بھی اسے گھوڑے بغیر آگے نہ بڑھتے تھے۔ سول لائے کی کالی اور گوری میسیں اس سے جلتی تھیں۔ کالے اور گورے صاحب اس پر مرتب تھے اور ایک سانولی سی، سادہ سی، معمولی سی آیا نے آراستہ بنگلوں اور پیراستہ کوٹھیوں کی اس دنیا پر رومان کی قوسِ فرج بُن دی تھی۔

۳ نمبر کی کوٹھی میں مسٹر رام لال رہتے تھے۔ ۸ نمبر میں مسٹر رام ناٹھن۔ ۱۲ نمبر میں خان بہادر یوسف، ۱۳ میں مسٹر چیٹر جی، ۱۴ میں مسٹر نواب۔ باقی کوٹھیوں میں بھی انسان ہی آباد تھے۔ لیکن ان کی بیویاں بد صورت تھیں یا پردوے میں۔ ان کی بیٹیاں شاید ابھی جوان

نہ ہوئی تھیں۔ ان کے خاندان روزے رکھتے تھے یا مندر جاتے تھے۔ ان کے مرد شراب پینے سے پچکھاتے تھے۔ ان کی عورتیں غیر مرد کے سائے سے بھی ڈرتی تھیں۔ سول لائن میں ان کا وجود یوں تھا، جیسے زعفران کے کمیٹ میں سرسوں، یا شراب کے پیلے میں جوشاندہ یا سخن کے خستہ کبابوں میں ہڈی کے لکڑے۔ یہ کوٹھیاں سول لائن میں گم گشنا مزاروں کی طرح آباد تھیں۔ جن پر نہ کوئی پھول چڑھاتا ہے، نہ چراغ جلاتا ہے۔ نہ دل تھام کے دو گلے دعاہی کے ادا کرتا ہے۔ ان کوٹھیوں میں خانسماوں کو باورچی کرتے ہیں۔ بیروں کو خدمت گار اور بیویوں کے ساتھ شادی کرنے کا رواج تھا۔ راج کے وقت یہاں بھی رومان کے فرشتے اُترتے تھے لیکن ان کے نفوں کی صدائے بازگشت عموماً ایک نئے نہنے کی ریس ریس روں روں میں منتقل ہو جاتی تھی۔ ان خاندانوں میں خدا کی ذات پر ایک معصوم سا ایمان تھا کہ جو پیدا ہوتا ہے وہ اپنی روزی بھی ساتھ لاتا ہے۔ لیکن وہ یہ فراموش کر دیتے تھے کہ خدا کی سلطنت میں بھی ڈاکو آباد ہیں۔ جو رنگ بھی چُراتے ہیں، بھنگ بھی چُراتے ہیں، اور گندم کے سمری خوشے بھی! جس کی لاثمی اس کی بھیں۔ فرق تو سفید اور کالے نکلوں کی قیمت میں بھی ہے، پھر انسان کی رنگت میں امتیاز کیوں نہ ہو، کوئی دلائلی میں منہ کالا۔ جس کی رنگت سفید ہو وہ کوئی کی کان میں جائے ہی کیوں؟ درو کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا! کوئی جب حد سے کالا ہوتا ہے، تو ہیرا بن جاتا ہے۔ کشش تو ہیرے کی ہے، کوئی کی نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی کی کانوں میں زہریلی کسیس بھی ہوتی ہیں۔ ان میں حادثے بھی ہوتے ہیں۔ وہ پھٹ بھی جاتے ہیں اور جب وہ پھٹتی ہیں تو زمین کی تہ میں سوئے ہوئے کیڑے بھی ایک بار کروٹ لیتے ہیں!

مسٹر رام لال کی آیا، آیا بھی تو کیا ہوا؟ عورت تو تھی۔ جوان تو تھی۔ خوبصورت تو تھی۔ یوں کہنے کو عورت تو رام لال کی بیوی تھی۔ جوان تو خان بہادر کی لڑکی بھی تھی۔ خوبصورت تو پٹبرجی کی بیوہ بھو بھی تھی، لیکن خالی عورت ہونے اور جوان ہونے اور حسین ہونے سے تو کائنات کی کنجی ہاتھ میں نہیں آ جاتی!

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مرا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساتی
یہ ایک تھام لینے کا گڑھا جو آیا کے ہاتھ میں تھا۔ وہ پچھلے ہوئے جذبات کی بدرے

میں بنتے ہوئے پانی کی طرح بس جانے نہ دیتی تھی۔ وہ ایک آرٹسٹ تھی۔ فن کار کا کمال یہ ہے کہ وہ زندگی کے عکس کو زندگی سے بھی خوش نما اور رنگین بنانے کے دکھائے۔ آیا کا کمال یہ تھا کہ وہ عورت ہوتے ہوئے بھی عورت سے زیادہ پرکشش تھی، خانہ ماؤں، بیروں، مہتروں کی بات دوسری تھی۔ وہ اپنی چڑچڑی، تھکن آلوو اور زرد روپیوں سے اُتا کر ایک ایسی دنیا میں پناہ لیتے تھے، جہاں تصور ہی تصور میں وہ بنگلوں میں بننے والی دودھ کی طرح گوری، بالائی کی طرح نرم اور ریشم کی طرح نازک، عورتوں کو اپنی بانہوں کے درمیان جھنجھوڑ دیتے تھے۔ ممزز چیڑجی کا خانہ ماں رمضان دل ہی دل میں اپنے مالک کی بیوی سے عشق لڑاتا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ وہ ممزز چیڑجی کے چھپوں، پیالوں اور گلاسوں کو اپنی زبان سے چاٹ کر ترکردا تھا۔ جب ممزز چیڑجی اپنے چھپوں سے پڈنگ کھاتی تھی۔ یا پیالوں سے چائے پیتی تھی، یا بلور کے رنگین گلاس سے شیری کا پیسگ نوش کرتی تھی۔ تو رمضان خانہ ماں کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ ممزز چیڑجی کے عنابی ہونٹوں کو چٹا خ چٹا خ چوم رہا ہے۔

تو ہی نادان چند کلیوں پر قناعت کر گیا! رام پر تاپ مہتر نے ایک دوسری طرح اپنی شنگی دامان کا علاج تلاش کر لیا تھا۔ وہ خان بہادر یوسف کے گھر کا بھنگی تھا۔ سولہ روپے ماہوار میں اسے تین غسل خانوں کا کام سمینا پڑتا تھا۔ خان بہادر اور بیگم کے غسل خانوں میں جاتے ہوئے اُسے گھن آتی تھی۔ بیڑا اور دسکی کے پس خورده بخارات، زیابیس کے ایلیومن کی بدبو۔ کرچھن سالٹ کے فیض کا رہ عمل۔۔۔ وہ اس غیر طبعی ماحول کی عنوفت سے گھبرا لختا تھا۔ لیکن نعمت آرا کے غسل خانے میں جاتے ہی اس کے دل کی دنیا مہک لختی تھی۔ نعمت آرا خان بہادر کی اکلوتی بیٹی تھی۔ پکے ہوئے آڑو کی طرح جوان۔ رام پر تاپ کو نعمت آرا کے غسل خانے کی فضا میں گلاب اور چپا اور مویتے کی سوندھی سوندھی خوبیوں کا لطف آتا تھا۔ وہ بار بار دوڑ کر صابن کی گیلی نکیہ کو چھوتا تھا اور شرماتا تھا، کیوں کہ وہ نعمت آرا کے مشک بُون بدن کی آشناۓ راز تھی۔ تو لے کی نرم نرم، تازہ تازہ نرم آلووگی، اُتارے ہوئے کپڑوں میں سلگتی سی آنچ کا احساس، نہانے کے ٹپ میں پانی کے بلبلوں کی آنکھ میں سرود رفتہ کاغمار۔ رام پر تاپ مہتر غسل خانے کی چھٹنیاں اندر سے بند کر کے نعمت آرا کے ٹپ میں بیٹھ جاتا تھا۔ نعمت آرا کا گیلا صابن اس کی کالی کالی

کھدری جلد کو اپنی ریشمی اور مشک بار جھاگ کے غبار میں چھپا لیتا تھا اور جس طرح
ہتنا طیس کی رگڑ لوہے کے نکڑے میں بھی کشش پیدا کر دیتی ہے۔ اسی طرح نعمت آرا
کے تولیے کی رگڑ بھی رام پر تاپ کے نحیف اور خمیدہ بدن میں پکے ہوئے آڑوؤں کا رس
بھردیتی تھی غسل خانے کی کھڑکیاں اور دروازے بند کر کے وہ تصور ہی تصور میں اپنے
روئیں روئیں کو نعمت آرا کے مرمرس وجود سے آباد کر لیتا تھا۔ ایسے وقت اس میں اتنی
ہمت بھی نہ ہوتی تھی کہ وہ موچھوں پر تاؤ دے کر روز محمد ڈرائیور کے سامنے تن کرکھڑا
ہو جائے اور اپنی چھاتی کی ایک نکر سے اسے پچھاڑ کے رکھ دے!

روز محمد بڑا چاک دست ڈرائیور تھا۔ وہ بہت سی نازک اندام حسیناوں کو پہلو میں
بٹھا کر موڑ چلانا سکھا چکا تھا۔ ایسے موقعوں پر اچھی سے اچھی کار کے کل پُر زے بھی
جھنجھننا اٹھتے تھے۔ انجن کی رفتار خوفناک طور پر تیز ہو جاتی تھی اور خوف و ہراس، نیم و
رجا اور بے بسی کے اس عالم میں روز محمد کے مضبوط بازو سمنے ہوئے حسن کا سارا بن
جاتے تھے۔

عورتوں کے جسم پر روز محمد ایک ہوشیار ڈرائیور کی طرح بچی تمل نظر ڈالتا تھا۔
چنانچہ اس نے دیکھی سنی، جان پہچان کی عورتوں کے نام بھی کاروں کے مودل اور ان کی
ساخت پر موزوں کیے ہوئے تھے۔

بیگم یوسف فور ۱۹۲۸ء تھی۔ مسٹر رام لال ماشر یوک۔ مسٹر چیٹر جی کی یوہ بہو
سینڈ ہینڈ ٹوٹا۔ رائے صاحب کی حیثم و سخیم یوی، ہمبر کا کشاور سیلوں۔ کسی کو وہ ٹو میز کرتا
تھا۔ کسی کو ریس کار۔ کسی کو بے بی آشن۔ اور آیا کا نام اس نے نیکسی رکھا ہوا تھا۔ سیئی
بجائی اور حاضر۔ میز کے حساب سے آٹھ آنہ فی میل کرایہ ہال کا سواروپیہ گھنٹہ۔ کبھی
کبھار روپیہ آٹھ آنہ کی بخشش۔ دنیا میں کتنے ہی لوگ ہیں۔ جن کے پاس بیش قیمت
گرائیں کاریں ہیں۔ لیکن وقت بے وقت ان کو بھی نیکسی پر چڑھنا ہی پڑتا ہے۔ خیر روز
محمد کا فلفہ تھا کہ دنیا میں صرف موڑ ہی نہیں چلائی جاتی، عورت بھی چلائی جاتی ہے فقط
چلانے کا سلیقہ چاہیے اور چلنے کا بھی۔

رات کے گیارہ بجے جب سول لائن کی دنیا پر گناہ و ثواب کے چکبرے سائے چھا
جاتے تھے۔ عورتوں اور مردوں کے دو جلے بلا ناخہ منعقد ہوتے تھے۔ مردوں کی مجلس

روز محمد کی کوٹھڑی میں بعتی تھی! اس میں خاناماؤں اور بیروں، مالیبوں، مہتروں اور ڈرائیوروں کی برادری کے ارکان شریک ہوتے تھے۔ وہ خیال کی آنکھوں دیکھی اور دل کے کانوں کی سنی کہانیاں بیان کر کے روز محمد کی کوٹھڑی میں رومان کا ماحول کھڑا کر دیتے تھے۔ ایک خانامان سنا تھا کہ اس کے بنائے ہوئے شامی کتابوں پر عنابی ہونٹوں کا ایک جوڑا بے طرح جھپٹنا۔ ایک بیرا کہتا تھا کہ کاک ٹیل کا جام بڑھاتے بڑھاتے اس کے ہاتھوں نے کسی کی مخوذی الگیوں کو چوم کے رکھ دیا۔ ایک مالپی کہتا تھا کہ مصالحہ پیتے ہوئے اس نے پانی کی بجائے اپنے دہن کا لعاب ملا دیا۔ وزدیدہ محبت اور رومان کے یہ قصے روز محمد کے کرے کی فضا کو معطر کر دیتے تھے۔ لیکن پھر رام پر تاب مہتراس رنگین ماحول میں گندے انڈے کی طرح آپنکتا تھا۔ عنابی ہونٹوں، مخوذی الگیوں اور لنڈیز گالوں کے ذکر میں وہ نعمت آرا کے کمود کا قصہ لے بیٹھتا تھا۔ لیکن اس قصے میں بھی رس ہوتا تھا۔ اور خاناماؤں، بیروں، مالیبوں کی یہ برادری باور پی خانوں سے لے کر پانچانوں تک کی چار دیواری میں اپنی جنت گم گشتہ کا سُراغ پالیتی تھی۔

آیاؤں کی محفل میں رومانی قصے چلتے تھے۔ وہ سر سے سر جوڑ کر رموز خودی اور اسرار بے خودی کی تغیری گردانی تھیں۔ وہ تو اپنی کوٹھیوں کے خلوت اور جلوت خانوں کی آشناۓ راز تھیں۔ پرورش انسانی میں ان کا درجہ گویا ماں کا درجہ تھا۔ ان کے پاس جسم اور روح کی بالیدگی کے انوکھے گزر تھے۔ سنار مالا کی طرح ان کی آنکھوں سب کے لیے وا تھی۔ بچے تو سکون پا کر ان کی چھاتی پر سو جاتے تھے۔ لیکن جوان اور بوڑھے اپنی ماں کو پہچاننے سے قادر تھے۔ آیا میں مسکراتی تھیں کہ چلو بیٹھے خوش تو ہیں! چنیں ہوا تو کیا، چنان ہوا تو کیا!

یوں بھی زندگی عزز کی خاطر انھیں سو طرح کے ڈھنگ رچانے پڑتے تھے۔ زبان کے چٹھارے کے لیے خاناماؤں کی خوشامد، نئے کپڑوں کے لیے دھوپیوں کی منت۔ لگنے دو لگنے کی ضرورت کے لیے مہتروں، مالیبوں اور بیروں کی سماجت، نوکروں کے لیے تو خیران کا وجود من و سلوئی سے کم نہ تھا۔ لیکن اپنے مالکوں کے لیے بھی وہ نعمت خانے کا ضروری جزو تھیں، جنھیں وہ وقت بے وقت زائدہ بدلنے کے لیے نوش فرمایا کرتے تھے۔ اس پر بھی یہ شکوہ تھا کہ آیا میں آوارہ ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!

ایک دن روز محمد کار دھونے تالاب پر گیا تو اس کی نظر آیا پر پڑی۔ وہ نیلے کنارے والی سفید دھوتی بے پرواںی سے بدن پر لپیٹے بیٹھی بال سکھا رہی تھی۔ آیا کو دیکھ کر روز محمد ہارن بجا بجا کر ”ساون“ کے نظارے ہیں۔ ”گانے لگا۔ آیا نے اپنے ہونٹ دانتوں میں بھینچ کر اسے غصے سے گھورا۔

روز محمد اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ ہائے ہائے میری لاڈو۔ تیرے فیشن پر اللہ کی مار۔ میں کہتا ہوں گوری، نمونیہ سے مر جائے گی تو جب دیکھو۔ تالاب پر نما رہی ہے۔ مجھے بتاؤ تو سی کیا ارادہ ہے تیرا؟“

”چل، رو جم۔“ آیا روز محمد کو رو جم کہا کرتی تھی۔ ”تو نے تو مذاق ہا رکھا ہے۔ مجھے تو کسی فیشن کی لٹ نہیں، اپنی ضرورت سے سردھوتی ہوں۔ تم کیا جانو۔“ روز محمد نے ایک مشاق نظر آیا کے تن بدن پر دوڑا۔ جیسے وہ موڑ کا ٹاٹر جانچ رہا ہو کہ ہوا پوری ہے یا کم۔ آیا نے شرم کر دھوتی کا پلو کمر پر اچھی طرح لپیٹ لیا۔ روز محمد آنکھوں کے گوشے سمیٹ کر مسکرا یا۔

”آخر آگئی ناریوڑی کے پھر میں، کتنی بار کما تھا کہ سنبھل کے چل۔ لیکن تجھ پر توجہ کیا بھوت چڑھا ہوا تھا۔ اب بول کس سالے کو باپ بتائے گی؟“ ”باپ بتائے گی میری جوتی۔“ آیا نے ننگ کر کہا۔ ”میں تو اس کی ماں ہوں گی۔ اسے باپ کی کیا پرو؟“

”اری چُپ رہ۔ تو نہیں جانتی سالے کو ٹھیبوں والوں کو، تجھے کان سے پکڑ کے نکال دیں گے۔ ٹوڑنے بننے گز کھائیں اور گلگلوں سے پرہیز۔ چل تجھے یہذی ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گا۔ جو سو پچاس خرچ آئیں گے میں دوں گا۔ تیری نوکری تو رہے گی میری لاڈو۔“ روز محمد بھی یاروں کا یار تھا۔ ڈرائیوروں کی منڈی میں اسے سچی لیرا کہا کرتے تھے۔

دم بھر میں آیا نے ساری کائنات کا جائزہ لے لیا۔ اس نے اپنی زندگی کے نشیب و فراز پر نظر ڈالی۔ اپنی نوکری کا آگا چیچا سوچا اور دنیا بھر کے پچے پانے والی ماں کو خود اپنے پچے سے فرار کی ہوئی دوسری راہ نظر نہ آئی۔ اگلی صبح جب روز محمد کار دھونے کے لئے گیا۔ تو تالاب میں آیا کی لاش تیر رہی تھی۔ اب اسے ڈھونڈ چڑا غریب نہیں زیبائے کر۔

متلاش

مایوس، غمیدہ، ہزار۔ گوراں فٹ پانچھ پر ہولے ہولے جا رہی ہے، جانے دو۔ اس کا جسم، اس کا اپنا جسم ہے۔ جس طرح میرا کوت اپنا کوت ہے۔ میں اس کوت کو سنجال کے رکھوں یا چھاڑ ڈالوں۔ خود پہنوں، یا پیچ دوں، یا کسی راہ گیر کی جھوٹی میں ڈال دوں۔ مجھے کون روک سکتا ہے۔ میں اپنے کوت کا مالک ہوں۔ گوراں اپنے جسم کی مالک ہے۔ شاید اگلے موڑ پر کوئی گزرتا ہوا راہرو اسے خرید لے گا۔ خریدنے دو۔ مجھے پشمیانی کا احساس بھی کیوں ہو؟ دنیا کا نظام کاروباری لین دین پر تو قائم ہے اور پھر گوراں کا جسم اس کا اپنا جسم ہے۔ اسے اختیار ہے کہ وہ جب چاہے، اور جس قیمت پر چاہے اسے پیچ دے۔ اپنی چیز پر سب قادر ہوتے ہیں۔ کوئی دوسرا اس میں ناٹک کیوں اڑائے خواہ خواہ!

سرٹک پر بھل کے کھبوب کے نیچے روشنی کے بڑے بڑے دھبے ہیں۔ کھبوب کے درمیان سنان اندر ہیرا ہے۔ گوراں کی زندگی میں بھی تاریک اور آجلے سائے ہیں۔ وہ سرٹک کے کالے اور سفید دھبوب کی طرح ساکن اور مخد نہیں۔ زندگی کے سائے چلتے پھرتے نشان ہیں۔ تھمتاتے ہوئے سورج کے سامنے آوارہ بد لیاں آجائیں تو زمین پر ایک محدود سا سایہ چھا جاتا ہے۔ تحکا ہوا مسافر بے قراری سے اس کی طرف لپکتا ہے۔ بے وقوف آدمی! جوں جوں وہ سایہ اس کے قریب آتا جائے گا، چھاؤں بکھیرنے والے ابر پارے اس سے دور ہوتے جائیں گے۔ مجھے اس کا تجربہ ہے۔ میں نے کہا ”گوراں تم میری منزل ہو۔ مجھے اپنی منزل تک آنے دو۔“

گوراں نے کہا ”آ جاؤ! میں بھی اپنی منزل کے لیے بھٹک رہی ہوں۔“

جُوں جُوں میں گوراں کی طرف بڑھتا گیا۔ میری منزل مجھ سے دور ہوتی گئی۔ جیسے سراب کی طرف بھاگنے والا پیاسا مسافر بھاگتا جائے، بھاگتا جائے اور انجمام کار پانی کی ٹھنڈی لروں کی جگہ ریت کے گرم گرم تودوں میں اٹک کے رہ جائے۔ میں گوراں کی طرف بڑھتا گیا، بڑھتا گیا۔ اور جب میں نے گوراں کو قریب قریب پالیا تو وہ گوراں نہ تھی۔ وہ اس کا جسم تھا۔ خوبصورت، مرمریں۔ ستار کے تاروں کی طرح کسا ہوا، جھنجھنا تا ہوا جسم۔ عورت کی کائنات اس کا جسم ہی تو ہے۔ شاید گوراں کا مرمریں بدن سڑک کے اگلے موڑ پر بک گیا ہو۔ بکنے دو مجھے ہمدردی کا احساس بھی کیوں ہو؟ وہ اپنے خوبصورت جسم کی مالک ہے۔ بالکل مختار جیسے مجھے اپنے کوٹ پر اختیار ہے۔

ظہیر میری باتوں پر ہستا ہے۔ وہ میرا پرانا یار ہے۔ ہم برسوں ہم جماعت رہے تھے۔ اب قسمت کی ستم ظرفی نے ہم دونوں کو ایک ہی دفتر میں اکٹھا کر دیا ہے۔ میں ساڑھے بارہ سو پاتا ہوں۔ ظہیر کی تنخواہ چالیس روپے ماہوار ہے۔ جب ہم کیسیں اکیلے ہوتے ہیں۔ تو وہ بے تکلفی سے میرے سر پر چانٹا مار گرنے لگتا ہے:

”ابے او صاحب کے بچے! تم روز بروز سڑی ہوتے جا رہے ہو۔ تلاش، فرار، فلسفہ — میں کہتا ہوں سب بکواس ہے۔ تم کیا جانو عورت کس چیز کا نام ہے؟ میری طرف دیکھ، جب میری جیب میں ساڑھے پانچ آنے کے پیسے ہوتے ہیں، تو میں صبح سوریے سیدھا علم دین سبزی والے کی دکان پر پہنچتا ہوں۔ آدھ سیر پالک لیتا ہوں، ڈیڑھ پاؤ آلو، دو پیسے کے ٹماٹر — اور کسی کو یہ شکایت نہیں ہوتی کہ مجھے سبزی خریدنے کا ڈھنگ نہیں آتا! لیکن اگر کسی روز کوئی حرامزادہ ضرورت سے زیادہ مٹھی گرم کر دے، اور میری جیب میں دو ایک روپے کھلتے ہوں، تو میں سبزی منڈی میں جا کے لنک جاتا ہوں اور دل ہی دل میں سوچتا ہوں کہ علم دین کی دکان بھی کوئی دکان ہے بھلا؟ باسی مال، سڑے ہوئے پتے، گندی ٹوکریاں۔ میں پر بھدیاں کی دکان میں جھانکتا ہوں۔ کرتار سنگھ کے خوب صورت شال کا جائزہ لیتا ہوں اور دل ہی دل میں گو بھی، مڑ، چندرا، سلااد اور آنساں کے وٹامنز اے، بی، سی کا تجزیہ کرتا ہوں۔ لیکن حساب ٹھیک نہیں جنتا۔ بھی وٹامنز کے اجزا میرے دو روپوں سے آگے نکل جاتے ہیں کبھی میرے دو روپے وٹامنز کی قیمت پر بھاری نظر آتے ہیں۔ اسی ادھیڑ بن میں ساڑھے دس نج جاتے ہیں۔ میں جلدی جلدی کسی

چھا بڑی والے سے گلی سڑی سبزی تکوا کر بھاگ بھاگ واپس آتا ہوں۔ یوں تاک بھوں چڑھاتی ہے۔ خالی پیٹ دفتر جاتا ہوں۔ اور وہ حرامزادہ آفس پر نہنڈنٹ میرے لیٹ آنے پر آنکھیں نکالتا ہے — کیا سمجھے بیٹا؟ — میرے چالیس روپوں پر دو لڑکیوں کے باپ رہتے۔ میں نے ایک کو پھانس لیا۔ تمہارے سارے سارے بارہ سو پر بہت سی لڑکیاں اور ان کی مائیں بھجنھنا رہی ہیں۔ دو ایک کو پھانسو اور عیش کرو۔ ورنہ لکھتے رہو گے بچہ! جس طرح میں کرتار سنگھ کے سال پر لئک جاتا ہوں۔“

ظہیر کی زبان پر عورت کا نام ایک لنیز چٹکارے کی صورت میں آتا ہے۔ کالج کے دنوں میں اسے چاٹ کا شوق تھا۔ جب کبھی اہلی کے پانی سے بھرے ہوئے گول گپے منہ میں ڈالتا تھا، اس کے ہونٹوں سے چار چار انگل بی رال نپک پڑتی تھی۔ اور وہ کسی خاموش لذت سے بلبا اٹھتا تھا۔

”ہائے ہائے، کیا ختنہ گول گپا ہے — جیسے مس کلیانی کے لال لال ہونٹ پکھل رہے ہوں!“

چاٹ کے ہر تازہ لقے کے ساتھ وہ اپنے کالج کی لڑکیوں کا کوئی نہ کوئی حسین حصہ نگل جاتا تھا! مس کلیانی کے ہونٹ، خالدہ کے دیکھتے ہوئے گال، زرینہ کی حنائی انگلیاں — ظہیر کرتا ہے۔ ”عورت شد کی کم تھی ہے۔ وہ زندگی کے خشک اور بے کار چھتے میں رس بھرتی ہے۔ اس کے زہریلے ڈنگ پر نہ جاؤ، اس کی رسیلی مٹھاس دیکھو۔ تم نے نیما کو دیکھا ہے؟ اندر سین ڈسپھر کی خوبصورت یوں۔ وہ پاچی اسی دفتر میں گنمam سا امیدوار تھا لیکن نیما کی رعنائیوں نے دفتر کی شاہراہ پر رنگیں جال بچھادیے۔ آفس کا ایک دل پھیک ناخدا زیر دام آگیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اندر چوبیس امیدواروں کے اوپر سے پھلانگتا ہوا ڈسپھر کی کرسی سنبھال بیٹھا — ہائے عورت کی نگاہ! میرے بھائی! اس کی نگاہ سے زنجیریں کٹ جاتی ہیں۔ لقدریں بدلتی ہیں۔ نگاہ مرد مومن کی تلاش کون کرے۔ ذوق یقین کا سودائی کون ہے — دنیا ہے تو عورت کی گود میں۔ عقیلی ہے تو اس کی مسکراہٹ میں۔ میں دیکھتا ہوں کہ اب اندر سین ہیڈ کلر کی کے خواب دیکھ رہا ہے، نیما کی بلوری گردن میں اب پھر لطیف خم پیدا ہو رہے ہیں۔ خدا کی قسم تم اس سنہری گرداب میں بے ٹکلف کو دجاو۔ ایک بچاری ہیڈ کلر کی کیا چیز ہے، تم میری مانو تو اس

مرمیں گردن کے ایک حلقة پر دفتر کی ساری کائنات اندر میں کو سونپ دو ۔۔۔ ہائے کیا لوچ ہے ظالم کی گردن میں۔ جیسے عمر خیام کی رباعی تحرک تحرک کرناچ رہی ہو ۔۔۔

ظیمیر میں ایک بیس بڑا عیب ہے۔ وہ عورت میں عورت کو نہیں دیکھتا۔ وہ عورت میں اس کا جسم ٹوٹتا ہے اور پھر جسم میں بلوری گردنوں، ناچتی ہوئی آنکھوں اور دھڑکتے ہوئے سینوں کا جائزہ لیتا ہے۔ اس پر بس نہیں وہ جسم کی ہر رعنائی، حسن کے ہر پچ، سینے کے ہر نشیب و فراز کو بیوپاری کی نظر سے ناپ تول کے ان پر قیتوں کے لیبل لگاتا ہے۔

نیلا کی گردن کے خم کی قیمت میرے دفتر کی ہیڈ کلر کی ہے۔ صادقہ اس کی بیوی ہے۔ لیکن ظیمیر کرتا ہے کہ صادقہ کی گھنی اور گھنگھریاں زلفوں کی قیمت چالیس روپے ماہوار ہے۔ چنانچہ پہلی تاریخ کو وہ اپنی ساری تختواہ صادقہ کی جھوٹی میں ڈال دلتا ہے۔ جب کبھی دفتر میں اس کی مٹھی معمول سے زیادہ گرم ہو جائے تو وہ اپنا غبار ہلاکرنے کے لیے چھمی جان یا گلزار بیگم یا رتنا بائی کے کوٹھے میں پناہ لیتا ہے، چھمی جان تین روپے ۔۔۔ گلزار بیگم پانچ روپے ۔۔۔ رتنا بائی دس روپے، کیونکہ اس کے گال پر ایک نحاساتی ہے۔ اور اس کے عتابی ہونٹوں میں کچھ ہوئے انگوروں کا رس چھلتا ہے۔ ایک دن وہ گوراں کے چوبارے میں گیا۔ اس کی جیب آسودہ تھی۔ اس نے ایک ایک روپے کے بیس نوٹ گوراں کے سامنے بچھا دیے۔

گوراں نے کہا۔ ”آپ یہ نوٹ اپنے ہی پاس رکھیں۔ آپ میری قیمت نہیں دے سکتے۔“

ظیمیر نے سوچا، وہ بن رہی ہے۔ اس نے گوراں کو اسی قیمت پر چکایا تھا۔ اس نے اپنا بٹوہ نکال کر ہوا میں اچھالا اور فخر سے بولا۔ ”ماں گو کیا مانگتی ہو جانِ تمنا! آج تمہارا ظیمیر خوشحال ہے۔“

گوراں نے ایک تھکی ہوئی انگڑائی لی۔ ”ظیمیر صاحب،“ میں روز روپیہ کماتی ہوں۔ آپ روز روپیہ لٹاتے ہیں۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ آج ایک لمحہ کے لیے آپ مجھے گوراں نہ سمجھیں۔ ایک عورت سمجھیں۔ ایک لمحہ کے لیے آپ گاہک نہ بنیں، ایک مرد بن جائیں۔ بس ایک دو بے لوٹ لمحے میری حیات کو جاوید کر دیں گے۔“

ظیمیر ہنسنے لگا۔ وہ اُتوکا پٹھے کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ وہ گوراں کے کھوئے کھوئے

اضطراب کو سراہتا تھا۔ اس نے زبردستی اسے بیس روپے دے دیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ازل سے گوراں کی تعمیر میرے لیے ہوئی تھی۔ کائنات میں اس کا وجود میرے وجود کا عکس تھا۔ لیکن جب ہم ملے، تو ہمارے درمیان ایک وسیع اور بھیاںک خلاء منہ بچاؤ کے کھڑا تھا۔ وہ اپنے بھبھیسوں سال میں ہے۔ پچھلے تیرہ برس سے وہ ہر روز بکری کے گوشت کی طرح ترازو میں تل کر بکتی رہی ہے۔ سینکڑوں ہزاروں انسان اپنی پشت ہاپشت کی کچڑ اس پر اچھاں چکے ہیں۔ بنی نوع انسان کی صدیوں کا سیاہ کار زہر گوراں کی رگ رگ میں سمویا ہوا ہے۔ ایک قاتل بیماری کے انگارے اس کے خون میں چٹک رہے ہیں۔ اس کی گلاب کی پتوں جیسی ملائم اور مشکل بار جلد کے نیچے بڑے بڑے گھاؤ ہیں۔ لیکن وہ کہتی ہے کہ محبت کے بے لوٹ لمحے، اس کی حیات کو جاوید کر دیں گے!

میں نے کہا۔ ”گوراں! اگر تو کائنات کے آخری کنارے پر بھی ہوتی، تو میں ارض و سماکی و سنتیں چھاند کر تیرے پاس پہنچ جاتا۔“

اس کا جسم بے داغ جسم نہیں۔ اس کا جسم پامال جسم ہے۔ پھول کی طرح پامال نہیں جو پاؤں کے ایک ہی دباؤ سے ثوٹ کر مرجاتا ہے۔ بلکہ سڑک کی طرح، جس کی چھاتی پر بھک بھک کرتا ہوا سیم رو لر ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر ریتا جائے۔ پیدل چلنے والے جوتیاں چھٹاتے گزرتے جائیں ثم اور نانگے چیخ چیخ کرتے نلتے جائیں۔ موڑیں گرد اڑاتی بھاگتی جائیں۔ سڑک گھستی جائے۔ پتھر ٹوٹتے جائیں، لیکن گزرنے والے گزرتے رہیں۔ چلنے والے چلتے رہیں اور پھر میونپلی کا سیم رو لر بھک بھک کرتا ہوا آئے۔ گوراں میں یہ بات تھی کہ وہ اپنے خوبصورت جسم کو میونپل کمیٹی کی پختہ سڑک کی طرح بچا کر آپ ایک طرف کھڑی ہو جاتی تھی۔ پیدل چلنے والوں کی طرح تھکے ہوئے کلرک، موڑ کی طرح سبک رفتار چھوکرے۔ سیم رو لر کی طرح ٹھجکتے ہوئے موٹے موٹے سینٹے۔ یہ آئے، وہ گئے، یہ گرے وہ پھسلے! یہ بیٹھے وہ بھاگے۔ اور گوراں کنارے کھڑی مسکراتی رہتی تھی، گوراں اور گوراں کے جسم کے درمیان ایک زبردست دیوار چین حائل تھی۔ اس دیوار کی بنیاد ایک نسخی ہی آرزو پر قائم تھی۔ وہ آرزو دنیا کے خزانوں سے موتی یا ہیرے یا ریشم کے انبار نہیں مانگتی۔ وہ زندگی کے دو بے لوٹ لمحوں کی خیرات چاہتی تھی۔ دو چھوٹے چھوٹے دھڑکتے ہوئے لمحے جو اس کی کھڑ

کمر چلتی ہوئی پنچھی کو جاودا نی سکون دے سکتے تھے۔

ظمیر کرتا ہے۔ ”عورت شد کی مکھی ہے۔ وہ زندگی کے خلک اور بیکار چھتے میں رس پکاتی ہے۔“ ظمیر بکتا ہے۔ وہ رتنا بائی کے ہونٹوں کی مٹھاں پر اپنا فلسفہ جاتا ہے۔ صادقہ کی مویقار آنکھوں سے اپنے مقولے چرا تا ہے ’سُور کمیں کا۔ ان دو سوتیلی بہنوں کے سنتے ایثار نے اس کو انداز کر دیا ہے۔ اور وہ ایسی مکھیوں کے چھتے نہیں دیکھ سکتا جو رس دیتی نہیں، رس لیتی ہیں۔ رس چوتی ہیں۔ رس چراتی ہیں۔— بیگم ستار کی طرح، جو بھری محفل میں اپنی جوان چھو کری کو نگاہ کر کے بھڑادیتی ہے۔— ”آہا، بیٹا۔ میری ژروت سے ملو۔ ژروت بڑی شریملی لڑکی ہے۔“ اور پھر وہ قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبان اشاروں ہی اشاروں میں شریملی ژروت کی ریشمی سائزی اور پتلا بلاوزر اتار کر رکھ دیتی ہے۔ یہ ژروت کی صراحی دار گردان ہے۔ یہ رہے ژروت کے مرمریں کستان۔ یہ ژروت کی پچکیلی کر۔— کوئی دل میں بول رہتا ہے۔ شریملی ژروت ایک، شریملی ژروت دو، شریملی ژروت تین۔— قیمت سائزی ہے بارہ سورپے ماہوار!— گوراں بھی یوں ہی بکتی آئی۔ لیکن گوراں کا نام سنتے ہی بیگم ستار کو غش آجائے۔ حاجی عثمان کی بھنوں تین جائیں گی۔ ڈاکٹر رحیم کے ہونٹ بھی بخیج جائیں گے اور غالباً انھیں وہ امید افزا لمحے بھی یاد نہ رہیں گے۔ جب وہ انشورنس پالیسی بخینے والوں کی طرح شادی کا بیمه کر کے اپنی لاڈلی بیٹھیوں کو ملکن شہستانوں کے اندر دھکیل دیتے ہیں۔ ژروت، مجیدہ، زہرہ، خورشید، بھمی، عفت۔— سب خونگوار لڑکیاں ہیں۔ حسین، بیدار حسین، ستاروں کے جھرمٹ کی طرح، جو نیلے نیلے آسمان کے درمیان جگہا رہے ہوں۔ ان کے مہکتے ہوئے پچکیلے جسم۔— او میرے خدا یا! ان کے مہکتے ہوئے پچکیلے جسموں میں چاند اور سورج اور کمکشاں نے اپنا سرمایہ لٹا کے رکھ دیا ہے۔ ان کی نیشی اور بلیغ آنکھوں میں بڑے بڑے خوش آئندہ پام جھلکتے ہیں۔ لیکن ان کی تمناؤں کی معراج مستقبل کے سماں سپنوں میں ہے۔ وہ آنے والی کل کا انتظار کر رہی ہیں۔ کیونکہ انھیں اپنے ہو شربا حسن کا خراج وصول کرنا ہے۔ آراستہ بنگلے، پچکیلی گاڑیاں، بھڑکیلے لباس۔— میں ڈرتا ہوں کہ شاید وہ اپنے مصروف لمحوں میں سے ایک بے لوث لمحے کی زکوٰۃ دے سکیں گی۔

میں نے ظمیر کی خوشامد کی، کہ دوست! تم گوراں کی زندگی کو جاوید نہیں کر سکتے۔

خدا کے لیے اسے میرے پاس لے آو۔ دنیا کی ساری آبادی میں ایک وہ میری مقدس امانت ہے۔ ”مقدس؟ ارے توبہ!“ ظمیر کانوں کو ہاتھ لگاتا ہے۔ ”تم نہیں جانتے گوراں کو، اس کے جسم میں اتے اتے لبے جرا شیم ہیں۔ گلتے ہوئے، زہریلے، مملک کیڑے۔— تم مقدس کہتے ہو، اس سرستی ہوئی لاش کو؟“

میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ظمیر کے منہ پر زور کا تھپٹہ مارا۔ اس کے نچلے جبڑے کا ایک دانت کٹاک سے ٹوٹ کر قالین پر جا گرا۔ ظمیر نے گرم گرم، سُرخ سُرخ خون کی ایک کلی غث سے نگل لی۔ اور اگلے روز گوراں کو لے کر آیا۔ وہ آئی۔ بھجتی ہوئی، پچکھاتی ہوئی، لجائی لجائی سی۔ جیسے زندگی کے طوفان میں کہیں دور افتی لکیر پر ایک روشنی کا مینار آہستہ آہستہ ابھر رہا ہو۔

ایک دن میں نے کہا، ”گوراں، تمہارا چوبارہ تمہیں زیب نہیں دیتا۔ تم اپنے بالا خانے کے پٹ مقفل کر دو۔“

گوراں حیران سی ہو گئی۔ اس کے خوشنما ہونٹ تجب سے کھل گئے۔ ”کیوں؟“ وہ بولی۔

میں نے کہا۔ ”گوراں، تمہارا وجود معمولی سطحوں سے بہت بلند ہے۔ تم بالا خانے کی کھڑکی میں بیٹھنے والی گوراں نہیں ہو۔ تم کسی کے خوابوں میں بنتے والی عروسانہ بیکیل ہو۔ اگلے میئنے ہم دونوں نیلگدی کی شاداب پھاڑیوں پر جانے والے ہیں۔ میں تم کو کوہ نور کے سینے نوریم میں داخل کراؤں گا۔ سینیشوریم کا بڈھا پرنشنڈنٹ میرا دوست ہے۔ وہ تمہارے خون کے قطرے قطرے کو زہریلی چنگاریوں سے پاک کر دے گا۔ تمہاری نس نس میں جو دیکتے ہوئے گھاؤ ہیں وہ بھر جائیں گے۔ تمہارے جیون کو جو گھن کھا رہا ہے، وہ مت جائے گا۔“

”تم سچ کہتے ہو۔“ گوراں نے کہا۔ ”لیکن میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی۔ میرے بالا خانے کے پٹ میری روزی کا راستہ ہیں۔ میں انہیں کیسے بند کر سکتی ہوں بھلا؟“

مجھے گوراں کی جہالت پر غصہ آگیا۔ میں نے اس کی گھنی زلفوں کا گچھا بنا کر اس کے منہ پر بہت سے کوڑے مارے۔ ”تم اپنے بالا خانے سے اپنی روزی کا سمارانہ لو،“

گوراں کیا سچ مج تم سمجھتی ہو کہ میں ساڑھے بارہ سو مہینہ صرف اپنے لئے کمارہا ہوں؟
 گوراں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی آنکھوں میں تیز تیز شعاعیں پھیلیں اور بکھر
 گئیں۔ اس کا اوپر والا ایک دانت سچ سے نچلے ہونٹ میں دھنس گیا اور پھر لیکا یک دوچار
 وحشی جھنکوں کے ساتھ اس نے اپنی احری ساڑھی کو تار تار کر کے رکھ دیا۔ پلک جھپکنے
 میں میرے سامنے گوراں نہ تھی، اس کا جسم تھا۔ خوبصورت مرمریں۔ ستار کے تاروں کی
 طرح کسا ہوا۔ جمنجلاتا ہوا جسم۔

”تم میرے سب سے بڑے گاہک ہو۔“ وہ میرے ساتھ لپٹ کر مجھے دونوں ہاتھوں
 سے نوچنے لگی۔ گوراں کی قیمت بیس لکھے رات تھی۔ تم اسے ساڑھے بارہ سو مہینہ پر چکا
 رہے ہو۔ تم میرے سب سے بڑے گاہک ہو۔ مجھے اپنا شکریہ ادا کرنے دو۔“ اس کے
 لانبے لانبے سُرخ ناخن کنی جگہ میرے جسم میں کھُب گئے۔ ایک خون آشام نظر اس نے
 چاروں طرف دوڑائی۔ میز کے اگالدان کو اٹھا کر زور سے پٹخ دیا۔ اپنی ساڑھی کے الجھے
 ہوئے مکڑوں کو سمیتا۔ اور آہستہ آہستہ چلی گئی۔ جیسے دور سے جھلکنے والا روشنی کا میثار
 سمندر کی لہروں میں تحلیل ہو جائے۔ گوراں کی سکیوں میں لپٹی ہوئی ایک ایک بے لوث لمحہ نہ
 دے سکے۔ تم میرے سب سے بڑے خریدار ہو۔ تم بھی مجھے زندگی کا ایک بے لوث لمحہ
 نہ دے سکے۔“

مایوس، غمیدہ، بیزار گوراں فٹ پاتھ پر ہولے ہولے جارہی ہے۔ جانے دو۔ وہ
 اپنے جسم کی ماں کے۔ شاید اگلے موڑ پر کوئی گزرتا ہوا را ہوا سے خرید لے گا۔—
 خریدنے دو۔ مجھے اس پر کوئی اختیار بھی تو نہیں۔“

دُورنگا

نام ضمیر، پیشہ انجینئری۔ لیکن عرف اسے دورنگا کہتے تھے۔ اس نام سے اس کو چڑھتی۔ لیکن یہ اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس کے منہ پر برص کے بڑے بڑے دھمکتے تھے۔ گالوں پر، ماتھے پر، ہونٹوں پر، کانوں کے پاس، ٹھوڑی کے نیچے، گردن کے ارد گرد، آنکھوں کے پوٹوں پر۔ ہر جگہ سفیدی کے بڑے بڑے چوڑے چوڑے داغ تھے، جن کے درمیان جا بجا اصلی جلد کے کالے کالے نشان بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ جیسے سمندر کے جھاگ پر کوئلوں کے ذرے تیر رہے ہوں۔

کچھ لوگ اسے دھوپ چھاؤں کہتے تھے۔ لیکن یہ نام اس کے دفتر کے کلر کوں اور چپر اسیوں تک ہی محدود تھا۔ کیونکہ وہ اس کے مزاج میں دھوپ کی تیزی اور دسمبر کی کپکپائی دینے والی چھاؤں سے کافی واقف تھے۔

دورنگی جلد، دورنگا مزاج، قسم بھی اس کی زندگی کو ہر پہلو دو غلا بنانے میں مدد دے رہی تھی۔ چنانچہ جب وہ لندن سے انجینئری کا امتحان پاس کر کے لوٹا، تو اپنے ساتھ ایک سفید فام بھورے بالوں والی چھوکری بھی لیتا آیا۔ بار برا ایسٹ اینڈ کے ایک چھوٹے سے قوہ خانے میں برتن دھونے پر ملازم تھی۔ اس قوہ خانے میں برتن دھونے والیوں کی تعداد برتوں سے بھی کچھ زیادہ تھی۔ تاہم لوگ وہاں جو ق در جو قوہ پینے جاتے تھے۔ کچھ من چلے ہندوستانیوں نے اس جگہ کا نام قبہ خانہ رکھ دیا تھا۔ لیکن انگریزی زبان کی بے ریا سادگی میں ہائے ہوز اور ہائے حلی کا امتیاز ممکن نہیں ہے۔ اس لیے جو قوہ پینا چاہتے تھے، وہ قوہ پینے رہے۔ اور جو قوے کی جگہ قوے کے برتوں سے دچپی لیتے تھے، وہ برتوں سے دچپی لیتے رہے۔ دورنگا بھی دچپیوں کا عادی تھا۔ لیکن ایک دن یا کایک

اس کے برتن لباب بھر کے چھلک اُٹھئے، اور برص کے سفید داغوں کی طرح بار براہمی
اس کی زندگی کے ساتھ چپک کے لگ گئی۔ حادثات ہی تو ہیں!

جب وہ لاہور کے گورنمنٹ کالج میں پڑھا کرتا تھا۔ اسے اپنی سیاہ جلد کی یک رنگی
اور پختگی پر ایک عجیب قسم کی کمتری کا احساس ہوتا تھا۔ نیو ہوسل میں ایک لطیفہ تھا، کہ
دنیا کے مکمل ترین چاند گر ہن کا حساب لگانا ہو تو کالج کے رجسٹر سے ضمیر کی تاریخ پیدائش
نکال کے اس میں سے نومینے کے دن تفرق کر دو۔ —! مذاق ہی مذاق میں لڑ کے اسے
اپنے بستر کی سفید چادروں سے اٹھا دیتے تھے۔ پختہ رنگ ہے بھئی۔ پسینے کا ایک قطرہ بھی
نپک گیا، تو داغ پڑ جائے گا! وہ دل ہی دل میں اپنی کلاس کی زیب النساء سے محبت کرتا
تھا۔ وہ کہتا تھا، کہ اس کی محبت گلی انتایہ ہے کہ وہ ایک بار زیب النساء کے عنابی ہونٹوں
کو چوم لے۔ وہ سادگی پسند اور قناعت شعار عاشق تھا۔ اس کا ایمان تھا کہ محبت کو سرمایہ
دارانہ لاجئ کے زہر سے بے لوث رکھنا چاہیے۔ خوبصورت عورت چلتا پھر تا نور ہے۔ وہ
سب کی مشترکہ امانت ہے۔ اس کی ایک پچھلاتی ہوئی کرن زندگی کو سرشار کر سکتی ہے۔
چنانچہ وہ زیب النساء سے کہا کرتا تھا، کہ تو دنیا بھر کے عاشقوں کی مساوی پونجی ہے۔ اس
میں میری محبت کا حصہ صرف اتنا ہے، کہ میں ترے نازک اور خون آشام ہونٹوں سے
ایک چھوٹا سا ملس چڑالوں!

زیب النساء نے کہا۔ ”بہت خوب“ مجھے منظور ہے۔ لیکن کیا آپ مجھے یہ گارنٹی
دیتے ہیں کہ آپ کے ہونٹوں کا رنگ کچانہ نہیں ہے؟ —“

لندن پہنچ کر ضمیر کے ساتھ دو حاوی چیز آئے۔ ایک تو یہ کہ اس کی زندگی میں
دور گلی علامات کا ظہور شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے اس نے بڑے شوق سے ویسٹ اینڈ کی
ایک دکان سے ٹھنائٹ بلو کا بانکا ساؤنر سوٹ بنایا۔ یہ دوسری بات ہے، کہ اس سوٹ کی
نمائش کے وقت اس سے ایک فاش، لیکن معصوم غلطی سرزد ہوئی۔ یعنی جب اس نے
پہلی بار اپنا سیاہ ڈنر سوٹ پہنا اس وقت دون کے ایک بجے لنج کا ٹائم تھا! — شاید قدرت
کو یہی منظور تھا کہ ضمیر کی جلد کی سیاہی اس کی اجلی خواہشات کے راستے میں حائل نہ
ہو۔ اس لئے ایک دن بیٹھے بٹھائے اس کے بدن پر برص کے بڑے بڑے سفید داغ
نمودار ہونے لگے۔ قدرت فیاض بھی ہے اور بخیل بھی۔ بد قسمتی سے وہ ضمیر کے حق میں

بچیل ثابت ہوئی۔ کالی جلد پر سفیدی کا جو عمل جاری ہوا تھا، وہ ادھورا ہی رہا۔ ضمیر کا اور
 والا ہونٹ اپنی اصلی حالت میں تھا لیکن نچلے ہونٹ پر دہی کی مھنکیاں سی بکھری ہوئی نظر
آتی تھیں۔ جیسے وہ بر قائم ہوئی نمکین لیٹی کا گلاس پی کر ہونٹوں پر زبان پھیرنا بھول گیا ہو!
اگر زیب النساء لندن میں ہوتی تو وہ شوخ اور شریر لڑکی ضرور چلاتی۔ «میں نے پہلے
ہی کہا تھا، تمہارا رنگ کچھا ہے۔ جو لندن کے ایک ہی حصہ سے دھمل گیا۔»

دوسراء حادثہ ایسٹ اینڈ کے قوہ خانے میں پیش آیا۔ یعنی بار برا برص کے سفید
داغوں کی طرح اس کی زندگی کے ساتھ چپک گئی۔ اس نے دونوں مصیبتوں سے
چھکنا را پانے کے لئے بہت سی جدوجہد کی۔ بہت ساروپیے لٹایا۔ لیکن کوئی دوا، کوئی اپریشن
اسے نجات دلانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ ٹکست کو ٹکست ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔
وہ تاریکی میں روشنی تلاش کرتا تھا۔ میری جلد؟ میری جلد زخم خورده ہے۔ ہوائی جہاز کے
ایک حادثے میں پڑوں نینک کو آگ لگ گئی۔ لپکتے ہوئے شعلوں نے چار انجن کی اس
نایاب مشین کو دیکھتے ہی دیکھتے خاک کر دیا۔ فرض کی انجام دہی ہر عالم میں لازمی ہے۔
پاکٹ کو بچاتے بچاتے میرا اپنا جسم جلس کے دھواؤ ہو گیا۔ لیکن فرض آخر فرض ہے
— میری یوی؟ میری یوی لنکاشائر کے سرو لیم میکفرسن کی اکلوتی بھیجی ہے۔ ان کے
کارخانوں کی ململ دنیا بھر کی منڈیوں میں کھلتی ہے۔ بار برا بڑی خوددار لڑکی ہے۔ ہماری
پہلی ملاقات پر ام مشرکی گارڈن پارٹی میں ہوئی۔ کوئی حرامزادہ کہتا ہے وہ ایسٹ اینڈ
کے قوہ خانے میں برتن دھویا کرتی تھی؟ —

جب وہ جہاز سے اترے تو بھین کے تاج محل میں ان کی ملاقات را جکмар دلاور سنگھ
سے ہوئی۔ دور نگاہ کار آزمودہ شکاری تھا۔ لندن میں اس نے بہت سے زائلے گر کیے
تھے۔ ایسٹ اینڈ والے کافی ہاؤس کا مالک قوے کے ساتھ بسکٹوں کی جگہ جوان چھوکریاں
بیچتا تھا۔ ایسٹ اینڈ کی لینڈ لیڈی مالدار مہمان چھانے کے لیے اشتہار کی جگہ اپنی
خوبصورت لڑکیاں دیا کرتی تھی۔ دو رنگے نے آتے ہی بنسی کے ساتھ بار برا کا کچلتا ہوا
بدن چپکا کر کنڈی دریا میں ڈال دی۔ دلاور سنگھ لاپھی چھلی کی طرح پکا، اور پھنس کے
انک گیا۔ شمعیں، وسکی، کاک ٹیل اور تاج محل ہوٹل کی بھڑکی رقص گاہ آدمی رات
تک بار برا سفید ریشم کے پھوٹوں کی طرح دلاور سنگھ کی بانسوں سے لپٹی ہوئی ناچتی رہی۔

اگلی صبح یک راجہنار کو یاد آیا کہ اس کی ریاست کے لیے ایک قاتل انجنینر کی فوری ضرورت ہے۔ دو رنگے نے تجھیں عارفانہ برتا۔ ”ناچیز ملازمت کے قاتل کماں ہے۔ کمار صاحب! اپنی طبیعت تو سیلانی ہے۔ آج یہاں کل وہاں۔ اور پھر یہ انجنینر تو وقت کاٹنے کا بہانہ ہے۔— بار برا کے چچا سرویم میکفرسن کے کارخانوں میں۔— راجہنار دلاور سنگھ نے لکاشاڑ کے سرویم میکفرسن کے کارخانوں کی تفصیل بڑے اشناک سے سنی اور پھر سوزو گداز کے ساتھ اپنی نیوں حالیں کا نقشہ بیان کیا۔— رعایا کی غوث پر لمبی لمبی آہیں بھریں۔ تجارت اور صنعت کی پستی کا روٹا رویا۔ اپنے پیک درکس ڈیپارٹمنٹ کی ناالہیت پر لعنت بھیجی۔ اور پھر ریاست کی ترقی کے امکانات پر بھی روشنی ڈالی۔ گھنے اور وسیع جنگل، تیز روپہاڑی ندیاں، نیلم اور سونے کی چھپی ہوئی کامیں۔ ہزاروں سال سے زمین کی چھاتی خزانوں کے انبار سنحالے بیٹھی ہے۔ اگر مسٹر ضمیر چاہیں تو آسانی سے اس نایاب دولت کو بے نقاب کر کے ریاست کے لاکھوں بھوکے نگنے انسانوں کو مالا مال کر سکتے ہیں۔— بار برا نے بھی کماکہ اپنا وطن چھوڑنے کے بعد اب یہی میرا وطن ہے۔ یہاں کی غلاظت اور پستی کو دور کرنا ہمارا انسانی فرض ہے۔— اور اس وقت تاج محل ہوٹل کی بالکنی پر کھڑے ہو کر دس شنگ ہفتہ پر جھوٹے برتن دھونے والی اور ساڑھے چار شنگ راست پر بکنے والی چھوکری نے اپنا اخلاقی اور انسانی فرض بے باق کر کے رکھ دیا۔ اس نے راس کھاری سے لے کر ہمالیہ پرست تک جتنے گندگی کے ڈھیر ہیں، اور گندگی کے ڈھیروں میں جتنے رینگنے والے انسانی کیڑے ہیں۔ ان سب کی نجات کا بیڑا اٹھایا، اور مسٹر ضمیر الدین جلالی، احساس فرض سے مجبور ہو کر سرویم میکفرسن کے کارخانوں کی جگہ سورج نگر کی ریاست میں انجنینر بن گئے۔

”بے شرم ہے سالا۔“ رمضان علی اور یسٹر کھاتا تھا۔ ”اس سے تو اچھا تھا کوئی نہ میں بٹھا رتا اپنی ماں کو۔“

”بھی عورت کیا ہے، بڑی نیکی ہے نیکی۔“ تیرتھ رام اکاؤنٹینٹ چٹھا رے لیا کرتا تھا۔ ”جہاں دیکھو چل رہی ہے۔ اسی کو کہتے ہیں رفتار کا زمانہ۔“

”سالے لنگور کی ٹھکل تو دیکھو۔“ خزان چند ڈرا فل میں اپنے نے انجنینر سے بیزار تھا۔ ”نقشوں کی الف سے ب تک نہیں آتی اور مصیبت میں ڈال رکھا ہے، ہم کو ماں

کے خصم نے۔"

"جب دیکھو نئے میں گٹ ہوتا ہے، بن کا یار۔ جہاں جاتا ہے۔ پسلے چھو کری مانستا ہے۔ میں نے کہا سنہال کے رکھا ہوتا سالی ٹیکسی کو۔" پنڈت بالک رام کو طیش آتا تھا۔

"ارے میاں، ہٹاؤ قضیہ۔" مولوی تمیز الدین کا خیال تھا۔ "جو چھو کری دلتا ہے، وہ چھو کری لے گا بھی۔ لاحول ولا قوت لیکن یار، پاجی کا جسم یوں مہکتا ہے، جیسے۔۔۔ تھو تھو۔" سارے دفتر نے کسی خیالی بدبو سے گھن کھا کر اپنی ناکوں پر رومال رکھ لیے۔ اصل میں دورنگے کے تن بدن میں ایک عجیب قسم کی تیزی سڑاند بی ہوئی تھی۔ لندن جانے کے بعد اس نے کھانے کے بعد کلی کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اور کمود کے بعد پانی کی جگہ ٹائلک پیپر کا استعمال جاری کر دیا تھا۔ ایک تو ہندوستانی موسم۔ دوسرے ہندوستانی معدہ۔ یہ روگ ٹائلک پیپر کے بس کا نہ تھا۔ چنانچہ دورنگے کا منہ اور پتلون ہمیشہ بڑے زور سے مرکا کرتے تھے۔

دورنگاریاست کی وزارت کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس لیے بار برا کے لطیف لوچ میں اور بھی زیادہ لطافت بھرنے کی ضرورت تھی۔ اسے ساڑھے سات سورپے ماہوار ملتے تھے۔ لیکن اس حقیری رقم کے پس منظر میں سورج گھر کی کھلی ہوئی تجویریاں تھیں۔ بار برا کے میک اپ کی قیمت تینواہ سے پوری ہوتی تھی۔ اس کے لباس کا خرچ کمار کے تھفون سے چلتا تھا اور دورنگا؟۔۔۔ دورنگے کا گزارہ رشت پر تھا۔ وہ رشت میں روپیہ بھی لیتا تھا، اور عورت بھی۔ اس کے دستخط آٹھ آنے سے لے کر پانچ ہزار تک بکتے تھے۔ اس کی رات سڑک کوئئے والی پہاڑی سے لے کر کسی معتوب اور سیز کی سمجھی ہوئی دلمن کے ساتھ گزر جاتی تھی۔ اگر عتاب کے نزول سے عورت یا روپیہ ملنے کی امید ہو، تو عتاب نازل کرنا بذات خود ایک خونگوار عمل ہے۔ ایک ہزار؟ وہ اپنے عمل سے مطالبہ کرتا تھا۔ ایک ہزار ممکن نہیں۔ یوی؟ یوی نہ سکی، بھو؟ ماں؟ بیٹی؟۔۔۔ دورنگے کی نظر میں شور کے گوشت سے لے کر چیل کے انڈے تک سب حلال تھا۔ اور ایک روز جب امام بخش چپڑا سی کے سامنے زندگی، موت اور روزی کا مسئلہ درپیش تھا تو اس نے آنکھیں بند کر کے اپنی فوبرس کی محمودہ کو انجنیئر صاحب کے کمرے میں دھکیل دیا۔

محمودہ دیر تک انجنیئر کے منہ پر کالے اور سفید داغوں پر انگلی پھیر کے ہستی رہی اور پھر تالیاں بجا بجا کر کرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بھاگنے لگی۔ ”آہا جی، تم ننگے ہو گئے میں ابا کو بتاؤں گی۔ آہا جی تم ننگے ہو گئے۔“

دورنگے کے مجھے میں روپوں کی بھری ہوئی تھیں اور چھوکری کے بھرے ہوئے جنم کے درمیان ترقی کے دروازوں کا کھل جاسم سم پوشیدہ تھا۔ ترقی کے دروازے ہی نہیں، روح اور جسم کا رشتہ قائم رکھنے والے دونوالوں کا دارود مدار بھی ایک چھوکری کے کالے، پیلے یا بھورے جسم پر قائم تھا۔ اگر کسی روز اس کی جیب یا گود خالی رہ جاتی تھی تو آسمان سے آئے والی روزی کا ایک سورج بند ہو جاتا تھا۔ ایک روز جب دورنگے — بدلو سے مسکے ہوئے دورنگے — کی نوک قلم نے قاضی عبدالقدوس، روزِ محمر کے رزق پر بندش کی مہر لگادی، تو بچارے قاضی کو اپنی نمازیں اور اپنے روزے بے کار نظر آئے گے۔ ان کی امیدوں کا آسرا خدا تعالیٰ مند کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کی دال روٹی فرشتوں کے دوش پر آسمان سے اترتی ہے — اور اب جو انہوں نے دیکھا کہ ایک بد صورت، گھناونا دورنگا انسان کے آب و دانے پر مطلق طور پر قادر ہے — تو انہوں نے منہ پھاڑ کر اپنے خدا کو ایک فخش مکالی دی۔

ایک روز دورنگا با غصے میں بیٹھا ہوا اوٹکھ رہا تھا، یہ ایک کوٹھی کے صحن سے پہلے گالیاں اور پھر چھینیں سنائی دیں۔ وہ بھاگ کر اندر گیا۔ اس کا خانہ مام جمال خاں کچن کے پاس پڑا جیخ رہا تھا۔ اس کی چھاتی پر کوٹھی کا مہتر چیتی کی طرح سوار بیٹھا تھا۔ اس کے اکڑے ہوئے پنجے جمال خاں کی گردان کو نوج رہے تھے — سلا حرامی۔ ہماری مہریا کو ہاتا ہے؟ خون پی لیں گے سالے حرامی کا۔“ صحن کے کونے میں ایک کالی کلوٹی، بھیتی سی عورت سمجھی ہوئی کھڑی تھی۔ دورنگا ہنئے لگا، کہ یہ الٰو کا ہٹھہ مہتر کی پیٹھ پر لیے یوں اکڑ رہا ہے۔ چڑیل ایسی صورت ہے حرامزادی کی۔ اس نے بڑھ کر مہتر کی پیٹھ پر کس کے ایک لات جمالی — شاید ایسے ہی کچھ شدید جھٹکے ہوتے تھے، جو کبھی کبھی دو رنگے کی چھاتی میں سوئے ہوئے ضمیر کو بیدار کر دیتے تھے۔ ایک لمحہ کے لیے اسے اپنی پار برایاد آئی۔ وہ شاید اس وقت کمار بہادر کے ڈرینگ روم میں نیم بہمنہ اپنا میک اپ کر رہی ہو گی۔ کمار پھکیلے دیوان پر لیٹا ہوا اسے ہر پہلو اور ہر زاویے سے جھائک رہا ہو گا۔

خیال ہی خیال میں ضمیر غصے سے بیتاب ہو کر کمار کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا۔ اس نے اپنی تیز ناخنوں والی انگلیاں کمار کی پھولی ہوئی گرون میں گاڑ دیں۔ وہ زبان نکال کر جھکا کہ کمار کا گرم گرم خون چاث جائے۔ اور عین اس وقت کسی نے اس کی پیٹھ پر زور سے لات جما دی۔ یہ دور نگا تھا۔ دور نگا زور زور سے ہنسنے لگا۔ ڈیم نان نس! اس نے جما خاں کے سینے پر چڑھے ہوئے مہتر پر دوچار لاتیں اور کس کے مار دیں۔ شکل تو دیکھو چڑیل کی جس کے لیے اکڑ رہا ہے سالا، اگر مہتر میں کچھ ہمت ہوتی تو وہ ضرور جواب دیتا کہ یہ سالا تو چڑیل کے لیے اکڑ رہا ہے لیکن تم اپنی پھول جیسی باربرا کے لیے کیوں نہیں اکڑ جاتے؟

آخر ایک دن دور نگاچجج اکڑ گیا۔ باربرا کے لیے نہیں اپنی ملازمت کے لیے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ چند روز سے ایک گنٹھیا کامارا ہوا ساتھ سالہ پارسی بڑھا اس کے دفتر میں دخل در معقولات دینے لگا ہے۔ یہ مشربائی والا بسمی کی کسی سینٹ کپنی کا ہیڈ اکاؤنٹنٹ رہا تھا۔ اب وہ کمار کی درخواست پر ریاست سورج نگر میں سینٹ کے کارخانے قائم کرنے آیا تھا۔ ریاست میں لامم شوون کی کوئی پہاڑی تو نہ تھی، لیکن مشربائی والا کے ساتھ اس کی جوان بیٹی ضرور تھی۔ مس باٹی والا کے سینے پر بفلی چوٹیوں والے اونچے اونچے کسار تھے۔ ان مرمریں چٹانوں سے اول درجے کا سینٹ کریدنا کوئی پیچیدہ عمل نہ تھا۔ دور نگا ریاست کی صنعت و حرفت کو ترقی دینے کے لیے اپنے ساتھ ایک خوشنوار ششم کا کیڑا لیتا آیا تھا۔ مشربائی والا نئے کارخانوں کے لیے سینٹ کی پہاڑیاں اٹھا لایا تھا۔ رفتہ رفتہ شہتوں کی ٹھنیوں کے سامنے مرمر کی چٹانیں سراٹھا کے جم گئیں، اور ایک روز مشرب ضمیر الدین جلالی خرابی صحت کی بنا پر استغفار دے کر لکاشاڑ کے سرو لیم میکفرسن کے کارخانوں کی تلاش میں بحثکتے ہوئے دہلی آگئے۔

دہلی میں اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ باربرا کو بجلی، پانی، بھاپ کے ایک خفیہ ہسپتال میں داخل کروا دیا۔ وہ دیکھتے تھے کہ راس کماری سے لے کر ہمالیہ پرست تک ہزاروں غلات کے ڈھیر ہیں۔ اور ان ڈھیروں میں لاکھوں کیڑے رینگتے اور مرتے ہیں۔ وطن عزیز چھوڑنے کے بعد باربرا نے ایسے ہی کٹافت کے گھواروں کی نجات کا بیڑا اٹھایا تھا۔ کیا فطرت کی مربان طاقتیں بجلی، پانی، بھاپ کے اثر سے اس کا ہاتھ نہ بٹائیں گی؟

جلترنگ

صحیح سے اس کے دوبار نکسیر پھوٹ پچکی تھی۔ خالد کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے نہتھوں میں گرم گرم ریت ڈال کر اندر سے جلس دیا گیا۔ ہو۔ سانس کی ہوا بھڑکتی ہوئی لاشین کے دھوئیں کی طرح کثیف اور کھٹی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ وہ تنگ آکر ناک کو روپال سے بند کر لیتا تھا۔ اور منہ کھول کر سانس لینے لگتا تھا۔ لیکن چند ہی لمحوں میں اس کا گلا خشک ہو کر سوکھے ہوئے پتے کی طرح چُمرانے لگتا تھا۔ وہ زور زور سے رو رینا چاہتا تھا، لیکن رو نہ سکتا تھا۔ اب وہ سیانا ہو گیا تھا۔ اگلے سال میزیریکولیشن کے امتحان میں بیٹھنے والا تھا۔ محلے کی لڑکیاں جن کے ساتھ وہ مٹی کے گھروندے بنائے کھیلا کرتا تھا۔ اب اس کے سامنے جسم چُڑا کر سمٹ جاتی تھی۔ یہاں تک کہ جمنانبائی بھی اس کو اپنے ساتھ چارپائی پر بٹھا کر روزنامہ انقلاب زور زور سے پڑھ کر سنانے کو کہا کرتا تھا۔

جما پہلوان کے ساتھ چارپائی پر بیٹھنے کا اعزاز محلے میں بہت کم لوگوں کے حصے میں آتا تھا۔ گلی کے "نکر پر اس کا نور تھا" جس کے ماتھے پر "خوش لذیذ ہوٹل از طرف جمال دین پہلوان خادم قوم" کا سائز بورڈ لٹکا رہتا تھا۔ ہوٹل میں ایک باورچی تھا۔ اس کا نام "تاج تھا" موقعہ و محل کے لحاظ سے جما پہلوان اسے خانسامان، بہلر، بوائے، تاجو اور "آلہ کی دم فاختہ" کے مناسب القاب سے بلا یا کرتا تھا۔ خوش لذیذ ہوٹل کے عقب میں ایک بوییدہ چھبھا تھا۔ جس کے نیچے بہت سی نیڑھی ترجیحی چارپائیاں پچھی رہتی تھیں۔ شر میں آئے ہوئے مقدمہ باز دستیوں میں یہ جگہ بہت ہر دلعزز تھی۔ کیونکہ جموں پہلوان صرف ۲۲ آنے نقد کے عوض انہیں کھانے کے لیے گوشت اور چپاتی، سونے کے لیے ایک چین بھیں چارپائی اور مقدمہ لٹنے کے لیے مشورہ مفت دیا کرتا تھا۔ ہاری ہوئی آسانی کے

لیے پہلوان بڑی چاہکدستی سے اپل دائر کرنے کے نوٹکے، گرمیوں میں وہی کی لئی اور سردیوں میں چائے کے ساتھ پر اٹھے تیار رکھتا تھا۔ جیتنے والوں کے لیے تاج دین خانسماں مرغ زنخ کر لیتا تھا یا پلاڑ اور قورے کے ساتھ شامی کباب بنالیتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ایسے موقعوں پر خوش لذیذ ہوٹل کے نرخ ذرا بے لذت حد تک اوپنچے چڑھ جاتے تھے، لیکن اگر ڈوبتی ہوئی امیدوں کو تنکے کا سارا مل رہا ہو، اور بلیوں۔ اچھلتے ہوئے دل کے سامنے عین موقعہ پر بھنا ہوا مرغ اور کارے کارے شامی کباب رکھ دیجے جائیں، تو دکیلوں، مختاروں، پیش کاروں اور گلرکوں کی زد سے بچے ہوئے چند حقیر نکلے یاروں کے یار جموں پہلوان کے ہوٹل میں خرچ کرنے میں بھلا کس کو اعتراض ہو سکتا تھا؟

ہوٹل کے سامنے سڑک پر ایک مضبوط سی چارپائی پڑی رہتی تھی۔ اس پر جموں پہلوان تنکیے لگائے میر مجلس کی حیثیت سے بیٹھتا تھا۔ گاہکوں، ملاقاتیوں اور مسافروں کے لیے آس پاس لکڑی کے بچ اور لوہے کی کریاں پڑی رہتی تھیں بیٹھے بٹھائے دل میں کئی بار پہلوان کو شک ہوتا تھا کہ شاید گوشت ٹھیک طرح بھونا نہیں گیا، شاید کبابوں میں مرچ زیادہ ہو، شاید قیمتے میں نمک کم ہو۔ اس لیے وہ ہر گھری دو گھری کے بعد اپنے خانسماں، ہتلر، یا بوانے کو آواز دے کر گوشت کا بھرا ہوا پالہ یا کبابوں کی پلیٹ منگوا کر چکھ لیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی تاج دین صدائے احتجاج بلند کرتا تھا کہ ”پہلوان جی ایک ہی دفعہ اطمینان سے کیوں نہیں کھا لیتے؟ اب ہوٹل کی بکری کے لیے خاک چیز بچے گی؟“

”ابے چل کمیں کا“ الو کی دم فاختہ نہ ہو۔ ”پہلوان اپنے چوڑے سینے پر ہاتھ مارتا تھا۔ ”جان ہے تو جمان ہے پیارے“ تیرے باپ کی کمائی کھاتا ہوں سالے؟ آیا بڑا ہوٹل کا مالک۔“

مالک تو جو ہو سو ہو، لیکن خوش لذیذ ہوٹل کو لذیذ رکھنا تاج دین کا فرض تھا۔ چنانچہ اس فرض کی انجام وہی کے لیے وہ بھی عموماً دروازے کی اوٹ میں چھپ کر سالن اور کبابوں کا نمک چکھ لیا کرتا تھا۔ خادم قوم اور خادم ہوٹل اور نوکر کی فرض شناسی کا سارا نزلہ بچارے مسافروں پر گرتا تھا۔ لیکن جموں پہلوان کا مریبناہ برتاو اور حکیمانہ چرب زبانی کبھی کسی کو یہ محسوس کرنے کی اجازت نہ دیتی تھی کہ سالن میں بوٹیوں کی جگہ پیاز کی بڑی بڑی گنٹھیاں تیر رہی ہیں اور کبابوں میں قیمتے سے زیادہ بیسن کی ملاوٹ ہے!

شام کے وقت جب خالد سکول کے کھیلوں سے لوٹا تو جموں پہلوان اسے آواز دے کر اپنی چارپائی پر بٹھا لیتا تھا۔ ”آؤ بیٹا خالد بابو۔۔۔ ارے او تاج دین ایک پلیٹ میں مصالحہ دار بھنی ہوئی بوٹیاں تو لاوڑرا۔۔۔ دیکھتے نہیں بیٹا خالد بابو آیا ہوا ہے۔۔۔ اور جب پہلوان اور خالد دونوں مل کر بوٹیوں کا چٹکارہ ختم کر لیتے تھے تو روزنامہ انقلاب کا دور شروع ہوتا تھا۔ خالد فرفراخبار سناتا، اور جموں پہلوان لیئے ہی لیئے خبروں پر تبصرہ جاری رکھتا۔ وہ شہید ان طرابلس کے نام پر چندہ اکٹھا کرنے کے لیے رضا کاروں کی ایک ٹولی کے ساتھ بمبی، کلکتہ اور حیدر آباد کی طرف گھوم آیا تھا۔ اس لیے وہ بین الاقوامی معاملات پر رائے زنی کرنا اپنا علمی حق سمجھتا تھا۔ اگرہ کے پچھم میں چین کا بادشاہ بمبی کے پاس ہاگ کا ٹک کا ملک، انگریزی ولایت کے عقب میں طرابلس کا میدان جنگ۔ جموں پہلوان کے تبصرے میں تین چار چیزیں خاص طور پر نمایاں ہوتی تھیں۔ خالد کو کبھی کبھی اس بے شکی لاف زنی پر نہیں آتی تھی۔ لیکن وہ پہلوان کو نوکنا خلاف مصلحت سمجھتا تھا۔ ایسا کرنے سے نہ صرف جموں پہلوان کی چارپائی پر بیٹھ کر مصالحہ دار بوٹیاں اڑانے کا مزا کر کر اہو جانے کا ڈر تھا۔ بلکہ پہلوان کی نظر میں اس کا علمی درجہ گر جانے کا بھی اندیشہ تھا۔ چنانچہ خالد مناسب طور سے پہلوان کی باتوں میں لقہ ہی دیا کرتا تھا۔ پہلوان خوش ہو کر اس کی گردن پر ہاتھ پھیرتا۔۔۔ ”شabaش، بیٹا خالد بابو۔ خوب علم کمار ہے ہو، جلدی جلدی کانج کرو، بیٹا! ڈپٹی کمشنز بن کے رہو گے۔۔۔ ہاں، ہوں پہلوان کی بات پھر پر لکیر ہے۔۔۔ ہاں!“ ڈپٹی کمشنز کا نام سن کر مقدمہ باز مسافروں کے کان کھڑے ہو جاتے تھے۔ وہ دم بھر کے لیے حقے کی نے چھوڑ کر خالد کو ایک عجیب سی عقیدت مندی کے ساتھ دیکھنے لگتے تھے۔ اس وقت ان کے دل میں خفیہ سے ارمان اٹھتے تھے، کہ وہ کسی روز اپنے بیٹوں کو شر لا کر خالد سے ملا دیں۔ قسم تو سب کی اپنے اپنے ساتھ ہے۔ لیکن کون جانتا ہے کہ یہ ملاقات کسی وقت ان کے بیٹوں یا پوتوں کی مقدمہ بازی میں کام آجائے! ”پتا پر پوت، گھوڑے پر گھوڑا۔ بہت نہیں تو تھوڑا۔“ جموں پہلوان کما کرتا تھا۔ کیوں نہ ہو اپنے باپ کا بیٹا ہے۔ شabaش میرے شیر! جلدی جلدی کانج کرو بیٹا خالد بابو۔۔۔“

جموں پہلوان کے منہ سے اپنے باپ کا ذکر سن کر خالد کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بھی اگرے کے پچھم میں چین کے بادشاہ کی طرح کوئی فرضی ہستی ہے۔ اس نے اپنے

مال باپ کو دیکھا تک نہ تھا۔ وہ ابھی ڈریڈھ برس کا تھا۔ جب اس کے والدین ریل کے
حاوٹے میں کٹ کر مر گئے تھے۔ خالد کو اس کے ماںوں نے اپنے زیر سایہ لے لیا تھا۔
ماںوں تو تجارت کے لیے زیادہ عرصہ باہر رہتے تھے۔ لیکن مہمانی نے خاصی توجہ سے اس کو
پالا تھا۔ وہ کسی حد تک اس کے ساتھ شفقت کا بر تاؤ بھی کرتی تھی۔ البتہ جہاں معاملہ
خالد اور عزیزہ کے درمیان ہو، وہاں مہمانی کا انصاف کھلم کھلا عزیزہ کا ساتھ دیتا تھا۔ عزیزہ
اس کی اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ عمر میں خالد سے تین برس بڑی تھی۔ لیکن خالد مجبوراً اسے
اپنے کندھے پر بٹھا کر بازار لے جایا کرتا تھا۔ عزیزہ غصے میں آکر اس کا منہ نوج لیتی تھی،
قلم توڑ دیتی تھی، کتاب چھاڑ دیتی تھی۔ اور اگر مہمانی سے پٹھا، تو غریب خالد۔۔۔

ایک روز وہ دونوں رضائی میں لیئے ہوئے بیس تک گنتی یاد کر رہے تھے۔ کسی بات
پر الجھ گئے۔ عزیزہ نے کھٹ سے اسے گردن پر کاٹ کھایا۔ خالد کی قیض خون سے لتحر
گھنی، اور وہ شاید پہلا موقعہ تھا، جب مہمانی نے خالد کے لیے عزیزہ کے منہ پر ایک زور کا
تھپڑ مارا۔ خالد کی گردن پر بائیس طرف دانتوں کا ایک گمراہانشان اب تک نئے چاند کی
طرح نمایاں تھا۔

شاید بچپن کے دبے ہوئے نقش تھے، جن کی وجہ سے خالد کے دل میں اب تک
عزیزہ کے لیے ایک مہم سی بے انتہائی ڈر اور شاید نفرت کا ملا جلا جذبہ باقی تھا۔ وہ عزیزہ
کے ساتھ نہایت عمیق سرد مری کا بر تاؤ کرتا تھا۔ لیکن عزیزہ ایسی نہ تھی وہ خالد کے آرام
کا ہر ممکن خیال رکھنے لگی تھی۔ وہ ہر طرح سے اس کے ساتھ خوبصورت باتیں کرنے کی
کوشش کرتی تھی۔ لیکن خالد رکھائی سے ٹال دیتا تھا۔ عزیزہ اس کے کپڑوں پر استری کر
دیتی تھی، کمرے کی چیزیں قرینے سے سجادیتی تھی۔ اگر اس کے سر میں درد ہوتا تھا تو سرد بدا
دیتی تھی۔ اگر فٹ بال کھلتے ہوئے اس کے پاؤں میں موج آ جاتی تھی، تو اس کی رضائی
میں بینچ کر گھنٹوں پاؤں دیاتی رہتی تھی۔

ایک دن مہمانی پڑوس کی شادی میں گئی ہوئی تھی۔ خالد انفلو نُزا کے شدید بخار میں
بیٹلا پڑا تھا۔ اس کے انگ انگ میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ عزیزہ نے اس کا سر
دبا کر دبائے، کمر دبائے، گھنٹے دبائے، لیکن خالد کراہتا رہا۔ عزیزہ بولی۔

”میں ایک ترکیب کرتی ہوں خالد، تم سیدھے لیٹ جاؤ، میں تمہارے سارے جسم

پر ایک ساتھ دباؤ ڈالتی ہوں۔"

عزیزہ نے اپنے بھرپور جسم کے سارے گداز کو خالد پر مسل ڈالا، لیکن اس کے درد میں کمی نہ ہوئی۔ عزیزہ لاکھ کمٹی رہی کہ ذرا ٹھہرو، ابھی ٹھیک ہو جاؤ گے۔ لیکن وہ جنبھلا کر اٹھا، اور کمبل اوڑھ کر دوسرے پانگ پر جالیٹا۔

اگلے سال وہ میزرك کا امتحان دینے والا تھا۔ سکول میں گرمیوں کی چھٹیاں ہو گئی تھیں۔ وہ صبح سوریے کتابیں لے کر کمپنی باغ چلا جاتا تھا۔ اور دوپہر تک آم کے پیڑوں کی چھاؤں میں لیٹ کر پڑھتا رہتا تھا۔ اب کئی روز سے کمپنی باغ نہ جاسکا تھا۔ کیونکہ دوپہر کے وقت اسے نکسیر آ جاتی تھی۔ ممانتی کا خیال تھا، کہ گرمی کا غبار ہے، تھوڑا بہت نکل جائے تو اچھا ہے۔ تاہم احتیاط کے لیے اس نے خالد کو گاجر کی کلونجی بنادی تھی، اور صبح شام تازہ کھن میں کالی مرچ، اور کدو کے مفرز ملا کر اسے چٹا دیتی تھی۔ لیکن آج صبح سے اس کی دوبار نکسیر پھوٹ چکی تھی۔ خالد کو یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے اس کے نہنبوں میں گرم گرم ریت ڈال کر اندر سے ججلس دیا ہو۔

اس نے بیزار ہو کر تولیہ ندھے پر ڈالا۔ اور غسل خانے کی طرف چل دیا۔ شاید ٹھنڈے پانی کی بالٹی میں سرڈیوں کر اسے تیکین ہو۔ لیکن غسل خانے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اسے غصہ آیا۔ یہ بھی کوئی نمانے کا نام ہے بھلا۔ وہ غصے سے بڑبراتا ہوا گھوما، اور گھومتے ہی یونہی نادانستہ طور پر اس نے کھڑکی کی ایک دراز سے اندر کی طرف جھانکا۔ جھانکتے ہی اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا، اور بھلی کی طرح تڑپ کر پیچھے ہٹ گیا۔ پھر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا، ٹھکا، جھجکا اور چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھ کر ایک بار پھر جھانکا۔ گھوما، پھر پھکچایا۔ لیکن پھر جھانکا۔ اس بار اس کی آنکھیں دراز کے ساتھ جم کے رو گئیں، جیسے مقناطیس کے ساتھ لو ہے کے نکڑے چمٹ جاتے ہیں!

یہ عزیزہ تھی۔ وہ جنمگاتے ہوئے موتی کی طرح صدف سے باہر نکلی کھڑی تھی۔ یا شاید وہ بھلی کی ایک آوارہ لڑی تھی جو کالی گھٹاؤں کے دیزیز پر دوں سے باہر نکل آئی ہو۔ اس نے اپنے گھنے بالوں کی لٹوں کو کھولا، اور ہاتھی دانت کی چھوٹی سی سنگھی کو ان کے پیچ و خم میں الجھا کر دیر تک کھیلتی رہی۔ پھر اس نے زلفوں کے انبار چھوڑ، بازو اٹھا کر دونوں ہاتھ جوڑے اور کمان کی طرح تن کر انگڑائی می۔ خالد ڈرا، کہ شاید زلزلہ آجائے گا۔

اور سنگ مرمر کے دو تاج محل گر کر ٹوٹ جائیں گے! اگرے میں محبت کا ایک مرمری خواب سویا ہوا ہے۔ اگرے کے پچھم میں چین کا بادشاہ حکومت کرتا ہے — لیکن اگرے کے اس طرف بھی تاج محل ہیں۔ برلنی چوٹیوں کی طرح دیکھتے ہوئے کوہستان۔ ہمالیہ کی چھاتی پر بنائے ہوئے بلوری مینارے — عزیزہ نے دونوں ہاتھوں سے بال سمیث کر بالٹی میں ڈال دیئے۔ پھر اس نے سراٹھا کر گردن کو زور سے جھٹکا۔ برسات کی کالی گھنائیں بکھر کر پھیل گئیں۔ بارش کی پھوار فضا میں جھملانا نہ گئی۔ ایک گستاخ قطرہ صبح کے ستارے کی طرح تاج محل کے کلنس میں لٹک گیا۔ عزیزہ شرارت سے اس پر پھونکنیں مارنے لگی۔ وہ جھوٹا رہا۔ جیسے سفید گلاب پر جڑے ہوئے شبتم کے موتنی کو شرم صبح تحریرے مار رہی ہو۔ اور جب وہ مجبور ہو کر ایک مچلتے ہوئے آنسو کی طرح گرنے لگا، تو عزیزہ نے جھک کر اسے ہونٹوں کے درمیان دلوچ لیا۔ وہ نہ رہی تھی۔ پانی کی لمبیں پہاڑی چشمیں کی طرح اپنا جلترنگ بجانے لگیں۔ تاج محلوں کے دامن میں جمنا کے سیماں دھارے بننے لگے — کوہساروں پر کمکشیں کا غبار سا چھا گیا۔ میدانوں پر قوس قزح کے فوارے سے چھوٹنے لگے۔ یہ مچلتا ہوا سیلاپ کھاں جا رہا ہے؟ اس بے پناہ طوفان کو کس سمندر کی گود سنبھالے گی؟ — خالد کی باہیں سانپ کی طرح بل کھا کر کھڑکی کی سلاخوں کے ساتھ لپٹ گئیں۔ پتھر کی دیوار میں ریشم جیسا لوچ آگیا۔ وہ دم بدم دیوار کے پہنے میں سایا جا رہا تھا۔ شاید اگلے لمحے وہ جھپاک سے اندر جا گرے گا۔ گرتے گرتے اس کو ایک جھٹکا سالگا۔ اس کی آنکھیں دم بھر کے لیے بند ہو گئیں۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ برفانی چوٹیوں کے ساتھ لپٹا ہوا اللوکی طرح گھوم رہا ہے۔ وہ ترپ کر پچھے ہٹ گیا۔ اس نے سر کو جھٹکا دے کر آنکھیں کھول دیں، اور جلدی سے تو یہ اٹھا کر اپنی خشک ناک پر رکڑنے لگا۔ اسے شک ہوا کہ شاید نکسیر پھر بسہ رہی ہے!!

لے دے

لینے دینے کے بیوپار میں یا تو بننے کو محارت ہے یا ملا اور پنڈت کو۔ دونوں کے خون میں اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے کی رمق ہے، اگرچہ ان کا لینے والا ہاتھ ان کے دینے والے ہاتھ سے عمود درازی مائل ہوتا ہے۔ لیکن یہ جو ایک معلق قسم کی لے دے انسانی سرشت میں گویا ازل سے موجود ہے، اسے نہ لینے سے سروکار ہے نہ دینے سے، البتہ تو تو میں میں والی گردان میں جتنی باحاوارہ شکفتاں نکل سکتی ہیں، وہ بے شک اسی ایک جذبے کی محتاج ہیں۔

غالباً ہماری پہلی لے دے کا آغاز اس وقت ہوا جب آماں حوا اور باوا آدم بیک بنی و گوش جنت کے با غہموں سے گول کیے گئے۔ میاں ابلیس کے ہونٹوں پر ضرور مسکراہٹ پھیل گئی ہو گی۔ جب اس کے ٹھکرائے ہوئے خاکی مسجد کی زبان پہلی بار لذت منوعہ سے آشنا ہوئی۔ اس کے بعد، مگر جا گھر کی زبان میں، جب آسمانی رحمتوں کے دروازے دوبارہ کھل گئے، اور باوا آدم کے بیٹوں اور آماں حوا کی بیٹیوں نے جو ق در جو ق اس دنیائے فانی کو نوازنا شروع کیا تو گویا طوفان نوح کے نام ضرورت ہے، کا پہلا اشتہار تیار ہونے لگا۔ اب تو اللہ دے اور بندہ لے۔ یا تخت یا تخت۔ سر سے کفن باندھ کے۔۔۔ وغیرہ وغیرہ، قسم کی نازک خیالیاں عملی جامد پانے لگیں۔ زن، زر، زمین کی آغوش میں جو روایتی لے دے کا چرچا ہے، اس نے ایاں کھا کر ایک طرف تو ملک گیری کی ہوس کو بھڑکایا، اور دوسری طرف زہنی بغاوت کے بیچ بوئے۔ پہلی صورت میں سکندر اعظم اور ہتلر کی جماعت کے بزرگ پیدا ہوئے۔ دوسری صورت میں خبر، آج کل کے افسانہ نویس ہی سی۔ لیکن یہ طے ہے کہ روزمرہ کی عامیانہ زندگی میں لے دے کی نشوونما میں جو ترقی ہوئی اس کے

عملی پہلو کا سرا بلا شرکت غیرے دکاندار کے سر ہے۔ خواہ وہ اناج کی منڈی میں ہو، یا کوٹھوں کے بازار میں۔ اور اس کے عملی پہلو کی ترتیب میں بی بھیارن کا جو ہاتھ ہے، اسے تسلیم نہ کرنا بے انصافی ہو گی۔ دروغ بر گروں راوی۔ حکایت ہے کہ سرانے میں مسافروں کی بانٹ چھانٹ میں جب کبھی ہمسایہ بھیارنوں میں ذرا شدید قسم کا تبادلہ خیالات ہونے لگتا تھا۔ تو انہوں نے تو تو میں میں کی فرسودہ ترکیوں سے آتا کر ایک تازہ سلیقہ شام یہ ایجاد کیا کہ میرا مسافر تیرے مسافر کو۔

طوبیلے کی بلا بند رکے سر! لیکن محلی ڈھلی گلوج کے مقابلہ میں یہ بلا واسطہ طرز بیان زیادہ مقبول ہوا۔ چنانچہ اب بہ نفس نفیس لڑنے کی بجائے نواب صاحب بیڑ، اور شاعر حضرات شعر لڑانے لگے۔ خدا جنت نصیب کرے، جن دونوں مشاعروں کی دعوم دھام تھی، ادب کا معیار اپنے جوں پھر تھا۔ نو عروس کی طرح جج کر محفل جبی ہوئی ہے۔ متانت، سنجیدگی۔ وقار کا غلبہ ہے۔ لوگ ہمہ تن گوش دو زانو بیٹھتے ہیں۔ چروں پر سکوت ہے۔ لیکن آنکھوں میں صبر ٹکن بے تابیاں ترپ رہی ہیں کہ نکلو تو میدان میں، ہم بھی دیکھیں کتنے پانی میں ہو۔ بارے شمع کو گردش ہوئی ایک طلاطم سا اٹھا، اور کسی نے گرج کر مطلع داغا۔ اب کیا تھا، مصر سے مصرع ٹکرانے لگا۔ رویف سے رویف الجھی، قافیے سے قافیہ بھرا۔ مضمون لڑنے لگا۔ اور پلک جھکنے میں گویا پانی پت کا تاریخی میدان سمٹ کر اس سخنی سی مجلس میں اٹھ آیا۔ نظروں کے تیر تان تان چھوڑے گئے۔ پلکوں کی شمشیر نے برق کی طرح کونڈ کر داد شجاعت دی۔ کالی زلفیں، زہرناک ناگنیں بن کر لمرائیں۔ گھنگھریا لے بال زنجیریں بن کر پھیلے۔ کچھ بچارے قید ہوئے۔ کوئی بدل ہوا۔ کسی نے آہ کی۔ کریں واہ واہ کانغرو لگا کر ترپنے لگا۔ اور جب متوذن نے اللہ اکبر کی بائگ دی، تو شمع گل ہوئی۔ سب نے اٹھ کر دامن جھاڑے، اور خراماں خراماں حاصل مشاعرو گنگناتے ہوئے اپنی راہ لگے۔

لیکن ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں! رفتہ رفتہ ہوا کا رخ بدلنے لگا۔ بزرگوں کو ٹکایت ہے کہ جوں جوں شاعری کا جو ہر کیا بہوت آگیا، شاعروں کی تعداد بڑھنے لگی۔ مشاعروں کی جگہ قولوں کا رنگ جما۔ میرزا سودا کے غنچے اور قلمدان کی جگہ رسالوں نے سنہماں، اور غالب و نوق کی تیکھی تیکھی نوک جھوٹک نے تنقیدی مقالوں کا بروپ لیا۔

تقتیل کو ذرا ثقل تم کی لے دے ہی سمجھئے۔ لیکن جب وہ پھٹے ہوئے لفافوں یا کھلی چینیوں کی صورت میں تقسیم ہونے لگے، تو یوں نظر آتا ہے، جیسے وہ صیغہ تذکرہ و تائیش کی رو سے لے دے کا اسم مختلف ہو! مثلاً دو شاعر دست و گردیاں ہو گئے۔

ایک نے ہاںک لگائی۔ ”ہونہ“ ذرا اپنا الف مقصورہ تو دیکھو! کمر ہے کہ شیر حمی، سینہ پکا ہوا۔ جیسے دے کا مریض کھانس رہا ہو۔“ دوسرے صاحب بضم حنائے۔ ”اخاہ مینڈکی کو بھی زکام ہوا؟ ذرا اپنی حائے حلی کا پیٹ تو سنجھالو، جیسے اپھارے کامرا ہوا بینا ذکاریں لے رہا ہو۔“

تیرے صاحب نے اس معركہ آرائی کو دیکھا تو ان کی رگ تقتیل بھی پھرڑکی۔ اور وہ اللہ کا نام لے کر دھم سے دونوں کے درمیان کو دوڑے۔ ”اجی صاحب! کمال کا الف مقصورہ اور کمال کی حائے حلی۔ ذرا اس خاکسار کا قت، تو ملاحظہ فرمائیے۔ واللہ کس بلا کا سڈول ہے۔ اور نقطوں کی گولائی۔ خدا کی تم تختے ہیں تختے۔“

اس بخابجشی میں اب ج کا اپریشن ہوتے ہوتے وہ تو بچارے لد گئے۔ لیکن اب تینوں طرف سے ہونے لگا کہ میرا شعر تیرے شعر کو۔ میری نظم تیری نظم کو۔

بات میں سے بات نہ لٹکتی ہے۔ لیکن فی زمانہ اس ادبی دھینگا مشتی کا سب سے بڑا اکھاڑہ وہ ادب ہے، جسے سوایا اتفاقاً ”ترقی پسند کما جاتا ہے۔ تخلی اور بیان کی اس نئی روشن نے زندگی کے تاریک اور گمنام پہلوؤں کو اجاگر کیا“ اور مستقبل کے لئے نئی نئی شاہراہوں کا نشان دکھایا۔ اس راہنمائی میں ماضی کے جمود اور حال کے اضطراب میں ایک بے پناہ نکر لازم تھی۔ چنانچہ نئے ادب کے دوش بدوش نئے ادیب پر بھی بے اختیار کچھ اچھلا۔ اجی صاحب روئی پر اپینڈزا ہے، روئی! لڑپچرنا ہوا ہپتال ہوا، کہ جدھر دیکھو کھانسی، بخار، دمہ، سل، درد گردہ! عشق ہے تو نرسوں کے ساتھ، رازو نیاز ہوتا ہے تو اپریشن کے وارڈ میں۔ واللہ دہلی کے دو اخانے بھی شرما جائیں! گویا دنیا بھر میں مزدور کی نوکری، سڑک کوئٹے والا انجمن، اور اونچی اونچی چینیوں کے سوا کچھ رہا ہی نہیں۔ چھوکری ہے تو اس کے سینے پر کچھ ناشپاتیاں پک رہی ہیں۔ عورت ہے تو پامال۔ بن ہے تو کسی بھوکے ننگے آرٹسٹ کے ساتھ بھاگنے پر تملی ہوئی۔ جوان بیٹی باغ کے مالی کو دیکھ کر فٹ کھا

جاتی ہے۔ گیارہ بچوں کی ماں بند ہوئیں ننھے کی فکر میں ہے۔ اور پھر ہسڑا کا دورہ۔ بیویوں کو ہسڑا، بھائیوں کو ہسڑا۔ شاید پچارا ادب بھی اسی دورے میں مبتلا ہے! اس کی بات بات میں جنسی بھوک کے انگارے ترپتے ہیں۔ اگر وہ آرٹسٹ ہے، تو اس کا مائل ننگا ہوتا ہے۔ اگر وہ شاعر ہے تو اس کا عربان تخلیل جسمانی آزادی کے ساتھ ساتھ قافیہ رویف کی قید سے بھی آزادی چاہتا ہے۔ اگر وہ افسانے لکھتا ہے، تو اس کے جوان چھوکرے گرنہ بھیڑوں کی طرح منہ پھاڑے جوان لڑکوں کا پیچھا کرتے ہیں۔ اور جنسی بندشوں سے گھبرائی ہوئی عورتیں فٹ پر فٹ کھاتی ہیں۔ پیاسے ہونٹ، ڈھیلی شلواریں، پوشیدہ امراض، روئی پر اپیگنڈا ہے، روئی!

جواب ملتا ہے کہ حضرت آپ نے وہ شلوار کیوں پہنی جو آسانی سے ڈھلک جائے۔ زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ تہذیب کی کینچلی بدل گئی۔ اخلاق کا معیار از سرنو تعیر ہوا۔ با غصہوں کی جگہ کارخانے بن گئے۔ کوئلے کی جگہ ریڈیو نغمہ سرائی کرنے لگے۔ تخلیل کی جگہ ہوائی جہاز پرواز کرنے لگے۔ بالاخانوں کی جگہ کلب گھرنے سنہالی۔ حرم سرا کا رتبہ ہوٹلوں نے ہٹھیا لیا۔ اور آپ ہیں کہ ”بلبل کی انکھیوں میں رگ گل کی پھانس“ تلاش فرم رہے ہیں! قبلہ، دریا میں رہ کر گھر مجھ سے بیڑ؟ بر تھ کنشوں کا زمانہ، عورت کویوں با ادب باللاحظہ ہاتھ لگانا جیسے نماز کی تبعیج ہو!۔۔۔ اور پھر اس جنسی بھوک کی لت کس کو نہیں؟ آپ کی ادبی کائنات میں عورت کی ذات کے سوا اور ہی کیا؟ آپ کے چمن میں پھول اس لیے کھلتے ہیں کہ وہ کسی معشوق رعنائی سچ پر بچھائے جائیں۔ بلبل کی نغمہ سرائی میں آپ کی چیمتی مغفیہ کا سرو دچھلتا ہے۔ اور پھر یہ وصل اور فراق کا جھگڑا کیا ہے؟ محظوظ کے کوچہ میں یہ ہائے دائے کیسی؟ آپ وہاں سر کے بل جاتے ہیں۔ آنکھوں کا فرش بچھاتے ہیں۔ دیوار سے سرپھوڑتے ہیں۔ دربان کی خوشامد ہوتی ہے۔ وصل کا شریت چھنتا ہے۔ اور آپ خالی بو تلیں اٹھائے مارے مارے پھرتے ہیں۔۔۔ اگر سچ مجھ آپ کے دل اور دماغ پر اس عورت کو پالینے کا بھوت سوار نہیں ہے۔ جو بالاخانے کی کھڑکی میں بن ٹھن کر بیٹھتی ہے، یا جو حرم سرا کی چار دیوار، میں ابز سے قید ہے، تو آپ کے طسمی رنگ محل بے معنی نظر آتے ہیں۔ اور ادب کے میدان میں (بقول آپ کے) آپ کی شہسواری بے کار سی تفریح معلوم ہوتی ہے۔ عورت!۔۔۔ وہ آپ کی رگ

رگ میں سائی ہوئی ہے۔ آپ کی غزلوں میں اس کا قصیدہ ہے، آپ کی نظموں پر وہ سوار ہے، وہ آپ کے تخیل میں تیرتی ہے۔ اور جب معاشرت کے اصولوں سے مجبور ہو کروہ کھلم کھلا آپ کی توجہ ساتی، کلام کی طرف مائل ہونے لگتی ہے۔۔۔ نو خیز ساتی، جس کی میں مشکل سے بھیگی ہوں۔۔۔ جس کے چہرے پر سبزے کا ہلکا سا آغاز ہو۔۔۔ قبلہ، کیا لینا کیا دینا۔۔۔ ادب ترقی پسند ہو یا غیر ترقی پسند رومان کا گھوارہ ہوتا ہے۔ آپ اپنے رومان کو زندگی سے نوج کر ایک دماغی خلاء میں لے جاتے ہیں۔۔۔ نئے ادیب کا رومان گلیوں کے نکر پر ہوتا ہے، مزدوروں کی بارکوں میں، پہاڑی چشمیوں کے پاس، میوپل کمیٹی کے ٹل پر، ریل کے ڈبے میں، گھر کی چار دیواری کے اندر۔۔۔ کیونکہ اس کے آگے اور پیچھے زندگی کی انٹک مشین چلتی رہتی ہے۔ بنائی ہوئی، بگاڑتی ہوئی، کھلتی ہوئی۔۔۔ آپ کے عشق اور معشوق جنوں اور پرپیوں کی بستی سے اترتے ہیں یا مخلوں کی سیج پر اگتے ہیں یا خوابوں کی ٹھنڈی دنیا میں بنتے ہیں۔ اس کا عاشق دن بھر دفتر میں کام کرتا ہے یا کارخانے کی چمنیاں صاف کرتا ہے یا ہوٹل میں جا کر شراب پیتا ہے۔ اس کی محبوبہ ایک شریف زادی ہوتی ہے، کہ جس کے تخیل کو دبی ہوئی خواہشوں نے آوارہ کر دیا ہو۔ یا ایک ماپوس جوانی کہ جس کی قسم ایک بہت بوڑھے یا بہت موٹے یا ان جوڑ سے مرد کے ساتھ ٹانگ دی ہو۔۔۔ یا پھر وہ ایک ستی سی، بمحضی ہوئی شمع ہوتی ہے۔ جسے خود آپ کے اصول ہر روز نئی محفل میں بھڑکنے کے لیے مجبور کرتے ہوں۔ آپ اپنے ہیرو اور ہیروئن کی شادی رچا کر انھیں جملہ عروی میں دھکیل دیتے ہیں، اور واپس آکر نو مہینے کے بعد بچے کا بے صبری سے انتظار کرتے ہیں۔ ترقی پسند ادیب جملہ عروی کے پردے گرا کر واپس نہیں آ جاتا۔ وہ خلوت خانوں کے چور دروازے تلاش کرتا ہے اور دبے پاؤں پس پر وہ کے رموز ٹھولتا ہے۔ بارہا اس نے دیکھا کہ نو دمیدہ غنچے بے دردی کے ساتھ کسی پھر پرانی، بوسیدہ جھوٹی میں پھینک دیے گئے ہیں۔ ایک ہلدی اور نمک کا سوداگر کسی روشن دماغ حساس لڑکی کو گود میں لیے بازار کے بھاؤ سنارہا ہے۔ کوئی آرٹسٹ نوجوان ایک بچے پیدا کرنے والی مشین کا بوجھ اٹھانے پر مجبور ہے۔۔۔ یہ زندگی کی ستم نظر یغیاں ہیں۔ آپ انھیں نظر انداز کرتے ہیں۔ ترقی پسند ادیب ان کا پیچھا کرتا ہے۔

لیکن چھوڑیئے جناب، کماں کی بات کہاں جا پڑی۔ نہ کسی کے لینے میں نہ دینے میں۔

یہ مضمون ایک برس فوجی افسر کی ڈائری کے چند اقتباسات کا ترجمہ ہے۔ یہ افریقہ ۱۸۳۹ء میں کراچی آیا تھا اور ۱۸۴۵ء میں اس کی ڈائری لندن کے اشاعتی ادارے جیس میدان نے شائع کی تھی۔ مصطفیٰ نے اپنا نام صبغہ راز میں رکھا تھا۔

کراچی

۱۳ فروری ۱۸۴۵ء کی صبح کو جنگی جہاز "ولینزی" اور بار برداری کے جہاز "حنا" نے قلعہ منورا کے مقابل لنگر ڈال دیے۔ ہمارے کمانڈر نے قلعہ کے حاکم کو للاکارا کہ فوراً ہتھیار ڈال دو۔

"میں بلوچی بچہ ہوں" قلعہ کے حاکم نے جواب دیا۔ "ہم قلعہ خالی کرنے سے پہلے مرجانے کو ترجیح دیں گے۔"

چلو اچھا ہوا۔ موت کے آرزومندوں کو موت ضرور ملنی چاہئے۔ یوں بھی ان مغدور بلوچیوں کو تمیز اور تمذیب سکھانا ہمارا فرض ہے۔ یہ تو وہ فرض ہے جس کو ادا کرنے کے لیے ہم نے اپنا عزیز وطن چھوڑا۔ اور اب ان کا لے پانیوں میں دربدار مارے مارے پھر رہے ہیں۔

ہمارے فوجی دستے جہاز سے اتر آئے اور منورا کی چٹان کی طرف بڑھے۔ چٹان کے دامن میں کچھ دیرستا کہ ہم نے اپنی اپنی رانفلیں بھر لیں اور ان پر تمیز دھار خون کی پیاسی کرچوں کو چڑھایا۔ منورا کی چٹان پر موت کا سایہ واضح طور پر منڈلا رہا تھا۔ لیکن موت کے فرشتے کس کا انتظار کر رہے تھے؟ ہماری رجمنٹ کے دل کچھ بیٹھ سے گئے لیکن کمانڈر نے کڑک کر للاکارا۔

"برھانیہ عظیم کے بہادر سپتو۔ تاج اور ملک کے نام پر ——" تاج اور ملک کے نام پر ہم نے بے دریغ حملہ کر دیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے منورا کا قلعہ سر ہو گیا۔ قلعہ میں ایک ضعیف العمر سردار تھا۔ ایک جوان عورت تھی۔ اور ایک

نخا سا بچہ تھا۔ لاحول ولا قوہ گورنر جزل نے گلکتہ سے ایک پیغام میں ہماری بہادری کو سراہا اور ہمارے کمانڈر کی عالی ہمتی۔ ہوش مندی کی بہت تعریف کی۔

منورا کا قلعہ سر ہوتے ہی کراچی کا شر بھی ہمارے قبضہ میں آگیا۔ دوپہر کے قریب ہم نے بندرگاہ پر اُرتنا شروع کیا۔ سمندر میں زبردست تلاطم تھا۔ لروں کے زیر و بم میں ہمارے کمانڈر کی محبوب بکری پانی میں گر گئی جو اس نے بہمنی میں خرید کر بڑے شوق سے پالی تھی۔ تین کالے ساہی بکری کو بچاؤ کے لئے اسلجہ سیست ایک ساتھ سمندر میں کو دیکھتے۔ دو ساہیوں نے بکری کو کندھوں پر اٹھایا۔ تیر را ساہی اپنے اسلجہ کے بوجھ سے بے دم ہو گیا اور آن کی آن ڈوب گیا۔ رام جی نائک فرض کا پابند انسان تھا۔ ڈوبتے وقت بھی اس نے اپنی رانقل کو بڑی مغبوطی سے تمام رکھا تھا افسوس کہ یہ ہتھیار سمندر کی زمین کی کے کام نہ آسکے گا۔ ہماری رجحت میں پہلے ہی رائفلوں کی بہت کی ہے۔

کراچی کی پورٹ کو بندرگاہ کہنا تم غرفی ہے۔ پھر بھی یہ مقام سارے ساحل پر بہترن جگہ ہے۔ اسے اچھی طرح ترقی دی جائے تو، کراچی گلکتہ کا مقابلہ کر سکتی ہے ہم اس بندرگاہ کو چنتہ تعمیر کر دیں گے۔ تجارت درآمد برآمد کے لئے یہ جگہ بہت موزوں ہے۔ یوں بھی وسطی ایشیا میں جنگی ذخیرے جمع کرنے کے لئے یہ مقام بے حد اہم ہے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کراچی کا قدیمی نام کروکالی ہے۔ جس کا ذکر یونانی دیومالا میں آتا ہے۔ یہ تاریخی رشتہ کراچی کے لئے باعث فخر ہے۔ لیکن ایک چھوٹی سی وقت یہ ہے کہ کراچی کا شر فقط ڈریڈھ سو سال پہلے آباد ہوا تھا۔

کراچی میں داخل ہوتے ہی انسان کے کان، ناک اور آنکھیں بڑی شدت سے متاثر ہوتی ہیں۔ سماں کے لئے چاروں طرف ایک مرہیہ نہام موسمیقی پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں بازار والوں کی جیخ پکار، عورتوں میں گالی گھوچ۔ کتوں کی لمبی تانیں اور گردھوں کی مسلسل ڈھینپھوں ڈھینپھوں خاص طور پر نمایاں ہے جا بجا گلی سڑی مچھلیوں کے ڈھیر لگئے ہوئے ہیں ان کا تعفن قوت شاما کو مدد رہتا ہے۔ شر میں نالیوں کا رواج نہیں۔ گندے پانی کا نکاس عمل تباہ سے انجام پاتا ہے۔ جو کوڑا کرکٹ گروں کے اندر کام نہیں آتا وہ گروں کے باہر رکھ دیا جانا ہے۔ صفائی کا زیادہ تر کام کوؤں چیلوں اور کتوں کے پرداز ہے چھوٹی چھوٹی تاریک دوکانوں سے ہلدی۔ کڑوے تیل کی تیز لپٹیں آتی رہتی ہیں۔ ان نوع

بنوں خوشبوؤں کو سونگھ کریوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے تازہ تازہ لاشوں کو حنوط کیا جا رہا ہے۔

مکان مٹی کے بننے ہوئے ہیں کھڑکیاں ناپید ہیں۔ البتہ چھوٹے چھوٹے روشنداں نوں میں سوکھی ہوئی مچھلیاں گرد میں اٹی پڑی ہیں۔

مرد لبے اور تن آور ہیں۔ عورتوں کے لباس شوخ اور رنگین ہیں۔ مسلمانوں کی پہچان ان کی لمبی لمبی سمجھنگھر بالی داڑھیاں ہیں۔ ہندوؤں کا رنگ زردی مائل ہے۔ کالے کالے سرخ ہونٹوں والے جبھی زاد سنتے پانی کی مشکلیں اٹھائے پھرتے ہیں۔ موٹے موٹے بننے دبلے پتلے ٹوٹوں پر اینٹھ کر بیٹھتے ہیں۔ مسلمانوں کے عمد سے انھیں گھوڑوں اور خچروں پر بیٹھنے کی اجازت نہیں۔

گھروں اور دکانوں کے سامنے بیٹھ کر بر سر عام ٹالکٹ کیا جاتا ہے۔ مسلمان کیکرایہ نام کی ٹھنڈیاں گلے میں مار مار کر منہ کی صفائی کرتے ہیں۔ ہندو سفید مٹی میں سرسوں کا تیل ملا کر صابن کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ نہانے کے لیے دریائے لیاری ہے۔ اس میں پانی نہیں ہوتا۔ چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں پانی جمع کر کے اس میں مچھلیاں دھوتے ہیں غسل کرتے ہیں اور پھر یہی پانی مٹکوں میں بھر کے پہا جاتا ہے۔

آج ”مگر پیر“ کا میلہ ہے۔ یہ جگہ کراچی سے کوئی نو میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہ میلہ ” حاجی مگر“ کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ کسی وقت حاجی پیر اور اس کے تین بھائی یہاں آ کر رہے تھے۔ آتے ہی انہوں نے اس مقام پر کرامات کے انبار لگایے۔ ایک بھائی نے ایک انگلی سے گرم پانی کا چشمہ کھوڈا۔ اس پانی کا درجہ حرارت ۹۰ درجہ ہوتا ہے۔ دوسرے بھائی نے غالباً دوسری انگلی سے ایک اور چشمہ نکالا جس کا پانی ۲۰ درجہ گرم ہے۔ تیرے بھائی نے چند پھولوں کو مگر مجھے میں تبدیل کر دیا۔ چوتھے بھائی نے اپنی مسوک کو زمین میں گاؤ کر کھجور کا درخت پیدا کر دیا۔ ایک طویل عرصے کے بعد جب سب سے بڑا بھائی مر گیا تو اس کے مزار پر ” حاجی مگر پیر“ کا مقبرہ تعمیر ہو گیا۔ ایک چھوٹے سے تالاب میں اسی یا انوے کے قریب مگر مجھے ہر وقت موجود رہتے ہیں اگرچہ یہ مگر مجھے پھولوں کی اولاد ہیں لیکن ان کے جسم بے حد غلیظ اور بدیوار ہیں۔ سب سے بڑے مگر مجھے کا نام مور صاحب ہے۔ درگاہ کا متولی ایک ننگ دھڑک لباس افقر ہے۔ ”آؤ آؤ“ کا نزہہ لگا کر

مگر مجھوں کو اکٹھا کرتا ہے اور عقیدت مند بکریاں اور دُبّنے ذبح کر کے چڑھادا چڑھاتے رہتے ہیں کچھ گوشت اور پیچھوڑے مگر مجھ کھایتے ہیں اچھا اچھا مال فقیر لے جاتا ہے۔ ”واہ واہ سبحان اللہ“ مگر مجھوں کو گوشت کھاتا دیکھ کر عقیدت مند تحسین و آفرین کے نعرے لگاتے ہیں۔

”مبارک باد۔ مبارک باد“ فقیر گوشت سنجال کر جواب دلتا ہے ”تماری نذر قبول ہوئی۔ اب دنیا اور آخرت میں تم سرخور ہو گے۔“

میلے میں کراچی سے ناچنے والی لڑکیوں کا ایک گروہ بھی آیا ہوا ہے۔ ان کی آنکھیں کالی اور بال لبے ہیں۔ عقیدت مندوں کے دل روحاںیت میں رچے ہوئے ہیں لیکن ان کے جسم ان لڑکیوں کے گرد منڈلاتے رہتے ہیں۔ ”مگر تالاب“ کا کچھ تبرک کے طور پر فروخت بھی ہوتا ہے۔ جوان عورتیں ایک طرف بینہ کر اس کچھ تبرک کے طور پر اپنے جسم پر ملتی ہیں۔ اس عمل میں زائرین کو چند خوبصورت اجسام کی زیارت بھی نصیب ہو جاتی ہے۔

میلہ ختم ہونے سے پہلے شیدی ناج ہوتا ہے۔ ایک دائرے میں سرخ، بزر اور نیلے رنگ کے بہت سے جھنڈے گاڑ دیے جاتے ہیں۔ انگلیوں میں عود اور لوبان سلکایا جاتا ہے۔ ڈھول بجھتے ہیں اور بہت سے ملے جلے مرد اور عورتیں شیم بیضوی داروں میں ناچنا شروع کرتے ہیں۔ حاضرین قل قل کے فلک شکاف نعرے لگاتے ہیں۔ ناچنے والے مرد جھوم جھوم کر گاتے ہیں۔ عورتیں مست ہو کر اپنی کمر پکاتی ہیں کوئے منکاتی ہیں اور والہانہ طور پر بانیں پھیلا کر کبھی گرتی ہیں کبھی بیٹھتی ہیں اور کبھی گھٹنے نیک کر زمین کے ساتھ سرمارتی ہیں۔ ان کے چمکیلے اور آبنوی بدن پر پسینے کے قطرے عجب بمار دیتے ہیں

دن بھر کی گرمی۔ گرد اور غبار کے بعد کراچی کی رات بڑی سانی ہوتی ہے۔ صاف شفاف آسمان پر تارے ٹھماتے ہیں۔ چاروں طرف صحرائی پر اسرار خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ فضا میں سمندر کی ہلکی ہلکی سی ننی رچی ہوئی ہے۔ کراچی کے پیچھے صرف ڈیڑھ سو سال کا غربیانہ ورشہ ہے۔ لیکن اس کے سامنے مستقبل کی لامحدود صدیاں ہیں۔ شاید ایک وقت ایسا بھی آئے جب اس کی بندرگاہ کپی بن جائے اور تاج کے نام پر آنے والے

فوجیوں کی بکریاں سمندر میں نہ گرنے پائیں۔ شاید یہاں کی سڑکیں پکی بن جائیں اور ان پر، کہیں کہیں سایہ دار درخت بھی لگا دیے جائیں۔ یہاں کے کوڑے کرکٹ کے متعفن انبار صاف ہو جائیں۔ اور پینے کا پانی لیاری ندی کے خلک کناروں پر غلیظ اور کثیف گڑھوں میں جمع نہ کیا جائے۔ شاید —

پیالہ پیگ

شام کی سیاہی پھیلتے ہی دور ساحل پر روشنی کے نئے نئے سے نشان ابھرنے لگے۔ ایس۔ ایس۔ سیر تھے سورج و اخبار دنوں سے برابر ایک قوی ہیکل دیوبکی طرح سمندر کا سینہ چیرتا آ رہا تھا، اب منزل کو قریب پا کر آسودہ خرامی پر اتر آیا۔ موجوں کے طوفانی تھیزے جو سمندر کی وسیع بیکرانی میں جماز کو ایک تنکے کی طرح مارے مارے پھرتے تھے، رفتہ رفتہ مدھم پڑنے لگے۔ اور ان کی تندی، تیزی اور ابھار پر ایک بے جان سا سکون چھانے لگا جو منزل کو پا کر ہر آرزو پر چھا جاتا ہے۔

وہ روشنی جو سب سے نمایاں ہے، شاید ملا بارہل پر ہوگی۔ نہیں، ملا بارہل پر اتنی تیز روشنی کماں سے آئی۔ یہ تو تاج محل ہوٹل ہے۔ ہاں، ممکن ہے۔ لیکن شاید یہ میجنک ہو؟ نان سن! یہ گور نمٹ ہاؤس کا بلب ہے۔ کیا عجب کہ یہ کانگرس بھون ہو؟ یا یا محمد علی جناح ہاں ہو؟ یا کیونٹ پارٹی کا دفتر؟ اور وہ نورانی لکیر جو دائیں طرف کمکشاں کی طرح کچھی چلی گئی ہے، ضرور میرن ڈرائیور پر قلعہوں کی جگہ گاہٹ ہے۔ رات کے اندر ہیرے میں وہ یوں نظر آتی ہے، جیسے سلمی کے کالے اور گھنے بالوں کی ماںگ میں انشاں بھری ہوئی ہو۔ جیسے پارہتی بائی ٹلے دار کالی سازی پنے چھما ستاروں کا ہجوم نورانی لہروں کی طرح جھلما رہا ہو۔ جیسے ہلدا بیدنگ کا سچوم پنے بیچ پر لیٹی ہوئی ہو، اور اپنے مرمری شانوں اور سینے کو کمان کی مانند تان کر قوس قزح سی انگڑائی لے رہی ہو۔ ڈیک پر مسافروں کا ہجوم گرد نیں اٹھا اٹھا کر، آنکھیں چھاڑ چھاڑ کر، ساحل کے اُبھرتے ہوئے نشانوں کا عید کے چاند کی طرح انتظار کر رہا تھا۔ کچھ دور بینیں لگائے کھڑے تھے۔ کچھ دل کی آنکھیں واکیے ہوئے تھے۔ اور بڑھتی ہوئی تاریکی میں روشنی کا ہر نشان اور ساحل کی

جانب زندگی کا ہر آثار ان کے رُگ و پے میں برقی جھنکوں کی طرح اثر انداز ہوتا تھا۔ پورٹس ماؤچ سے لنگر اٹھانے کے بعد اٹھارہ دن سے برابر یہ ساڑھے بارہ سو کالے، گورے، پیلے، بھورے مرد، عورتیں اور بچے ایک خوشحال قبیلے کی طرح ایک ساتھ رہ رہے تھے۔ ڈائیگ روم میں وہ اکٹھے کھانے پر بیٹھتے تھے۔ بار روم میں سیاسیات، فلسفہ، ادب، جنیات پر دلچسپ مباحثے ہوتے تھے۔ کبھی سونمنگ پول میں تیرنے کے مقابلے۔ کبھی ڈیگ ٹینس کے میچ۔ فینشی ڈریس بال۔ بچوں کی دوڑیں۔ برجن۔ فلیش۔ کانسرٹ۔ اور کبھی کبھی کیبنوں کے آس پاس یا ڈیکوں کے خاموش کونوں میں یا چمیزوں کی اوٹ میں دزویدہ رومانوں کے مختصر لمحات۔ اتنے مختلف لوگوں کو اتنے دن ایک دوسرے سے اس قدر قریب رہنے کا موقع بہت کم نصیب ہوا تھا۔ اور اس احساس میں بھی ایک عجیب یگانگت کا جذبہ تھا، کہ اگر وہ ڈوبیں گے تو بھی ایک ساتھ اور منزل تک پہنچیں گے، تو بھی ایک ساتھ اگرچہ ایس ایس سیٹر تھے مور میں ڈوبنے کا امکان پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ لیکن سفر میں دلچسپی اور Adventure چاشنی بھرنے کے لیے، بہت سی عورتیں اور بہت سے مددل ہی دل میں اس خطرناک امکان کو زندہ رکھنے پر مصروف تھے۔ اور لائِن بیلٹ کی پریکش کے ساتھ ساتھ انہوں نے یہ منصوبے بھی گانجھ رکھنے تھے، کہ اگر کسی سنگلار خ چٹان سے نکلا کر جہاز پاٹھ ہو جائے، تو وہ کس کس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ڈوبنا پسند کریں گے۔ جیسے جیسے بمبئی کی منزل قریب آتی گئی، سمندر کی بے پناہ لہروں کے طوفان دھیتے پڑتے گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ مسافروں کی برا دری میں بھی کہیں کہیں انا نیت، کہیں انفرادیت، کہیں رنگ، کہیں نسل، کہیں مذہب کے امتیازات سر اٹھانے لگے۔ جان میکفرسن جو طویل رخصت سے واپس آنے کے بعد صوبہ بھار میں بھاگپور کی کمشنری کا چارج لینے والا تھا بکھہ دنوں سے باقیوں سے الگ تھاگ رہنے لگا تھا۔ اور صرف اب اس نے بار میں سیاسی مباحثوں، سونمنگ پول میں ڈائیگ اور فینشی بال میں پوسٹ میں بننے کے مشاغل ترک کر دیے تھے۔ اور کھلے کار کا تیص اور خاکی نکر چھوڑ کر اب باقاعدہ سوت پہننا شروع کر دیا تھا۔ ممز جیکسن نے کہیں بوائے کو پلیز اور بیلٹ کو تھیک یو کہتا بند کر دیا۔ کیونکہ اب اس کی مملکت قریب آ رہی تھی جس میں اس کا خاوند پورے ضلع کا حاکم اعلیٰ تھا۔ اس ضلع کی آبادی ناروے کی آبادی کے برابر اور رقبہ ڈنمارک کے ملک

سے زیادہ تھا۔ یہ اعداد و شمار مز بیکسن کے نوک زبان تھے اور وہ انہیں بر منگھم اور لنکا شاڑ کے کارخانوں میں کام کرنے والی ہجیوں، خالاؤں اور بہنوں کو سنا سنا کر جیران و پریشان کر دیا کرتی تھی۔ کل شام سے سردار جسونت سنگھ بھی نہ بار آیا تھا، نہ فلیش میں اور نہ ہی اس نے ڈزر کے بعد ماہیا کے دردناک دوہے گا گا کر ہندوستانی میموں کو رلانے اور گوری میموں کو ہنانے کی کوشش کی تھی۔ یگانگت اور انسانیت کا خول جو سمندر کی وسعتوں نے جہاز کے مسافروں پر چڑھا دیا تھا، اب ان وسعتوں کو عبور کرنے کے بعد برف کے تودے کی طرح پکھلتا جا رہا تھا اور جب سر شام دور ساحل پر روشنی کے نشان ابھرنے لگے، تو ہر مسافر کا دائرہ انسانیت محدود ہو کر اجنبیت اور مغارست کے اسی لکنے پر آگیا، جس پر وہ پورٹس ماؤنٹ سے روانہ ہوئے تھے۔ پنج سمندر کے راز سمندر ہی میں ڈوب گئے اور ساحل کی آنکھ کبھی ان سے آشنا نہ ہو سکے گی۔

ڈیک پر ایک نفساً نفسی کا عالم تھا۔ ہر شخص کی خواہش تھی، کہ ساحل پر جو نئی روشنی جھملائے اس پر سب سے پہلے اسی کی نظر پڑے۔ اور ہر روشنی کے ساتھ دلوں میں تصوّرات کی ایک نئی دنیا آباد ہو جاتی تھی۔ کسی کو اس میں مالا بار ہل نظر آتا تھا۔ کسی کوتاج محل ہوٹل یا میجنک۔ یا گورنمنٹ ہاؤس۔ یا کانگرس بھوون۔ یا محمد علی جناح ہال۔ یا کیونٹ پارٹی کا دفتر۔ یا نجمہ کی مانگ میں افشاں۔ یا دل افروزبائی کے سینے پر جھملاتے ہوئے سلمے ستارے۔ یا ہلدا کے جسم کے کمکشانی عکوس۔۔۔۔۔

جان میکفرسن سوچ رہا تھا۔ کہ اگر بجا گپور کی کمشنری کا ناظراً اور ہیڈ ارڈلی اس کی پیشوائی کے لیے بمبئی نہ پہنچے ہوئے، تو آئی۔ سی۔ ایس کی باعث میں سالہ ملازمت میں یہ اس کے دل پر تیراچر کا ہو گا۔ پہلا چر کا اس کے دیرینہ خادم افضل کے ہاتھوں لگا تھا۔ افضل کوئی سولہ برس سے اس کا بیرا تھا۔ جس طرح جان میکفرسن کو آئی۔ سی۔ ایس کی ملازمت میں ایک بے تاج قسم کی بادشاہی کا چکا پڑ گیا تھا۔ اسی طرح افضل کو بھی سفید آقاوں کی خدمت کی چاٹ تھی۔ یہ شوق اسے سینہ پہ سینہ اپنے دادا سے دراثت میں ملا تھا۔ اور کمپنی بہادر کے زمانے سے اس خاندان کے کسی فرد نے انگریزوں کے سوا کسی ہندوستانی گھرانے میں خدمت گزاری کی ذلت برواشت نہیں کی تھی۔ اسی وجہ سے افضل کے ضمیر میں ایک ایسی دوغی سرشت کی آمیزش تھی، جو اسے بیروں اور خانہ اماوں

کی عام برادری سے کچھ درجہ ممتاز اور ہندوستانی عیسائیوں کے نچلے طبقہ کے ساتھ کسی حد تک ہمدوش کرتی تھی۔ چنانچہ وہ لباس میں قیص، پتلون اور نیلے کمرہنڈ والی سفید اچکن کا نہایت شدت سے پابند تھا اور زبان میں چرچ مشری سوسائٹی کے پادریوں الی انگریزی نما اردو استعمال کرتا تھا۔ یہ سلیقہ اس نے ابتداء میں محض فیشن کے طور پر اختیار کیا تھا۔ لیکن امتداد زمانہ نے اس کی فطرت کا ایک جزو بنایا۔ یہاں تک جوں جوں اس کے آقا جان میکفرسن کی اردو میختی اور سورتی گئی، افضل کی زبان اپنے مرکز سے پھسل کر عجیب و غریب تر اکیب، بندشوں، اور اسالیب کی دلمل میں پھنستی گئی۔ یوں تو جان میکفرسن ہر چوتھے پانچویں سال باقاعدگی سے طویل رخصت پر انگلستان جایا کرتا تھا۔ لیکن اس بار جب وہ روانہ ہونے لگا، تو بہت کچھ ہچکچا ہٹ اور تشویش کے بعد افضل نے ڈرتے ڈرتے اس سے پوچھا۔ ”صاحب، اگر آپ سے نہیں کھاتا تو ہم کچھ بولنا مانگتا۔“

”ہاں، افضل، تم بولنے ملے۔ مگر یاد رکھو ہم بلایت سے تم کے واسطے اور کوٹ نہیں لانا سکتا۔ ادھر یہ جس باہوت کم تی اور باہوت منگا ملتا۔“

”اوور کوٹ کا بات نہیں صاحب۔“

”ہم سمجھتا ہے کہ جنگ ختم ہو گیا ہے۔ لیکن ابھی تک بلایت میں شاید سُگرٹ لائٹ آسانی سے ملنے نہیں مانگتا۔ ورنہ ہم تمہارا یہ پورا خواہش پورا کرتا تھا۔“

”پرواہ نہیں صاحب۔ ہم اپنا ڈیمائڈ نہیں بولنا مانگتا۔“

جان میکفرسن نے کن انگلیوں سے افضل کی طرف دیکھا۔ ہر بار ولایت جاتے وقت افضل اسے اپنی فرمائشوں کی فہرست دیا کرتا تھا۔ جس میں مختلف النوع کی چیزیں شامل ہوتی تھیں۔ رست و اچ۔ سُگرٹ کیس۔ اوور کوٹ۔ پرانے سوٹ۔ فونٹن پین۔ سیفٹی ریزر۔۔۔ اور ایک بار اس نے دبے لفظوں میں یہ خواہش بھی کی تھی، کہ اگر ولایت میں تھیں اور چالیس سال کی عمر والی کوئی میم صاحب خالی ہو، تو افضل برضاء و رغبت اسے قبول کرنے کے لیے تیار ہو گا۔ کیونکہ صاحب، آپ جانتا ہے کہ ہمارا کچھ اس کنٹری کے نیٹوگر سے بہت ہائی ہے۔ نیٹو عورت سے ہمارا گزر ہونا نہیں مانگتا۔ وہ ہمارا یونگ کوچ نہیں سمجھتا۔ کانٹا چھری نہیں جانتا۔ کمود نہیں کرتا۔۔۔ ہم ان کے ساتھ سک ہوتا۔ صاحب، ہم ان کے ساتھ مرجائے گا۔“

اس فرماںش پر جان میکفرسن نے اسے ذرا سختی سے ڈاٹ دیا تھا اور بڑی بے رحمی سے اس پر انکشاف کیا تھا، کہ ولایت کی میم صاحب افضل جیسے جاہل، غیر مہذب اور کینے انسان پر لبے سے لمبا پاپ لگا کر تھوکنا بھی پسند نہیں کرے گی۔ آج افضل کی گفتگو سے اسے شک ہوا کہ کہیں اس کی یہ پرانی خواہش تو عود کرنیں آئی؟ چنانچہ حفظ ماتقدم کے طور پر جان میکفرسن کی پیشانی پر تیوریوں کی بہت سی جھریاں نمودار ہو گئیں۔ افضل اپنے آقا کی رگ کو خوب پہچانتا تھا۔ اس لیے وہ اس کے دل میں سراخانے والے شبہات کو بھانپ گیا۔

”نہیں صاب۔ فکر نہیں۔ وہ بات بھی نہیں ہے۔“

”کون بات؟“

”میم صاب والا بات، صاب۔ ہم اپنا پوزیشن خوب جانتا ہے، صاب۔ ہم وہ خیال ڈس کر دیا۔“

جان میکفرسن کے ماتھے کی جھریاں مدھم پڑ گئیں۔ اور اس نے رومال نکال کر اس میں بڑے زور سے ناک صاف کی۔

”صاب،“ ہم یہ معلوم کرتا مانگتا کہ کیا اب صاب اس کنٹری میں واپس آئے گا؟“ جان میکفرسن کے تن بدن میں ایک زبردست جھٹکا لگا۔ جیسے اس نے اچانک برتن رو کو چھولیا ہو۔ اس نے رومال نکال اس میں اور بھی زور سے دوبارہ ناک صاف کی۔

”صاب، آج مارنگ جب ہم بازار کرنے گیا، تو وہ وہ راشکل رام پر شاد فروٹ والا بولتا کہ مسٹر افضل، اب تمہارا صاب واپس آنے نہیں سکتا۔ ہم سب انگریز لوگ کو خلاص کرتا مانگتا۔“

جان میکفرسن نے تیسرا بار رومال نکال کر اپنے دماغ میں سرسراتے ہوئے بوجھ کو ہلکا کیا۔ اگر روٹا خلاف شان نہ ہوتا، تو یقیناً اس کی آنکھیں بھی اسی شدت سے اس کی ناک کا ساتھ دیتیں۔

”صاب، علی بخش بوچ بھی یہی ڈرٹی بات بولتا۔ اور زائن دھوپی بھی مسخری کرتا کہ مسٹر افضل اب برٹش راج ایک دم خلاص ہونا مانگتا۔ صاب، اگر بریک فاسٹ لیٹ نہیں ہوتا تھا۔ تو ہم ان سب ڈیم سوانن کو باری باری سے مزا چکھاتا تھا۔ لیکن صاب صرف اپنا

انفرمیشن کے واسطے ہم پوچھنا مانگتا ہے کہ کیا اب صاب اس کنسٹری میں واپس آئے گا؟
 جان میکفرسن کے دل پر دوسرا چکال لندن میں اس وقت لگا۔ جب وہ برکلے اسٹریٹ
 میں ٹامس گک کے ہاں آیے۔ ایسی سیر تھی مور میں اپنا بر تھر ریزرو کروانے گیا تھا۔
 ”جان میکفرسن، اس کواڑ، او۔ بی۔ ای۔ سی۔ آئی۔ ای۔ سی۔ ایس۔ کمشنز،
 بھاگلپور۔ بھار۔ انڈیا۔“ رجسٹریشن سیکشن والی لڑکی اس کا پتہ لکھتے لکھتے اچانک رک گئی۔
 اس نے رجسٹر پر جھکا ہوا سراخا کر اپنے موٹے شیشے والی عینک کے پیچھے سے جان میکفرسن
 کی طرف یوں دیکھا، جیسے وہ اس کے پاس چاند کی طرف سفر کرنے کا ملک خریدنے آیا ہو
 پھر لڑکی کے لمبوڑے سے چہرے پر ادا سی چھا گئی۔ اور اس نے ایک سرد آہ بھر کر جان
 میکفرسن پر دکھ اور رحم سے بھرپور نگاہ ڈالی۔

Going to Collect your things sir
 لڑکی نے از راہ ہمدردی گفتگو کا آغاز کیا
 اور جان میکفرسن کو کاؤنٹر کے سامنے کھڑے کھڑے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی
 ریڑھ کی ہڈی چور چور ہو کر پتلون میں گر گئی ہو۔

اب اگر بھاگلپور کی کمشنزی کا ناظراً اور ہیڈ ارڈلی اس کے استقبال کے لیے بمبئی نہ
 پہنچ ہوئے تو یہ اس کے ضعیف دل پر تیسرا جدید ضرب ہو گی۔ اگر وہ نہ آئے ہو —
 اگر وہ نہ آئے — نہ آئیں۔ اپنی بلا سے جان میکفرسن نے صرف دو ہی روز تو بمبئی میں
 ٹھہرنا تھا۔ اور گورنمنٹ ہاؤس کا دعویٰ رقعہ اس کو لندن ہی میں مل گیا تھا۔

ادھر بھی اگر وہ نہ آئے؟ یہ بھیانک خیال رہ کر اس کے سینے پر سمندر کی تند
 لہروں کی طرح نکراتا تھا۔ اور دور بمبئی کے ساحل پر یکے بعد دیگرے ابھرنے والے
 روشنی کے نشان تاریک دھبیوں میں بدل جاتے تھے۔ اگر جان میکفرسن کو یہ یقین ہوتا کہ
 بمبئی کے ساحل پر اترتے کوئی اس کی نوپی اچھال کر سمندر میں پھینک دے گا، یا زبردستی
 اس کی پتلون اتار کر بھاگ جائے گا، تو بھی غالباً اس کے دل میں اس سے زیادہ پریشانی کا
 احساس نہ پیدا ہوتا جتنا کہ اب ناظراً اور ہیڈ ارڈلی کے آنے یا نہ آنے کی بیم و رجا سے پیدا
 ہو رہا تھا۔ وہ چھپلے با یہیں برس سے ایک عظیم الشان سلطنت کو اپنے شانوں پر اٹھائے
 کھڑا تھا، تاکہ اس پر کبھی آفات غروب نہ ہو۔ اس فرض کی انجام دہی میں اس نے دن
 اور رات، خون اور پیمنہ ایک کر دیے تھے۔ اس نے مچھروں کی پرواکی تھی نہ ملیرا کی۔

سانپوں کا خیال کیا تھا نہ بچھوؤں کا۔ من شڑوک سے ڈرا تھا نہ ہیضے یا طاعون یا کالا آزار سے۔ اس نے اپنی جوانی کا رس، اپنے دماغ کا جوہر، اپنے قلب کا سکون بے دریغ قربان کیا تھا، تاکہ بريطانیہ کے تاج میں کوہ نور کی چمک ماند نہ ہونے پائے۔ لیکن اب جب کہ اس کے آرام کے دن قریب آ رہے تھے، قدم قدم پر اسے ایک نیا دھکا لگ رہا تھا۔ بات بات پر اس کے دل پر نئے نشتر چلتے تھے۔ اب اس کی آنکھوں میں وہ پرانا نور باقی نہ تھا، جس سے وہ تاج کی دھندھلاتی ہوئی تابانی کو جلا بخش سکتا۔ نہ ہی اب اس کے کندھوں میں وہ سکت تھی جس کے سارے وہ اپنی سلطنت کو کبھی غروب ہونے والے آفتاب کے رخ پر سارا دیے رکھتا۔ — جان میکفرسن کے سینے میں یہ خلش یوں جوش مار رہی تھی جیسے سوڈا واٹر کی بوتل کا دھانہ بھک سے پھٹ گیا ہو۔ اس کی کن پیوں میں خون کی گردش ابلجے گئی۔ گلے میں مچھلی کے کائی نئے پھنس گئے۔ اور آنکھوں پر دوربین لگا لی۔

”ہیلو جان۔ کہو یار، آج جاتی بمار کی بازی لگے گی؟“ سردار جسونت سنگھ نے پیچھے سے آکر اس کے کندھے پر ٹھکنی دی۔ اور دوسرے ہاتھ سے تاش کی گذی کو عین اس کی ٹاک کے نیچے زور سے پھر پھڑایا۔

جان میکفرسن کو یہ حرکت بہت ناگوار گز ری۔ یکاک اس کی آنکھوں میں اترے ہوئے آنسو نشک ہو گئے۔ اس کی خمیدہ گردن میں تاؤ آگیا۔ سردار جسونت سنگھ کو کوئی جواب دیے بغیر اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اور غصے سے وہاں سے چلا یا۔ لمحہ بھر کے لیے سردار جسونت سنگھ دم بخود کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ پھر اس نے جلدی جلدی ادھر ادھر دیکھ کر جائزہ لیا۔ کہ کسی اور نے تو اس کی یہ گت بننے نہیں دیکھ لی؟ سامنے کچھ دور مز جیکن کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ایک زہریلی، کائیں والی مسکراہٹ جس میں نفتر، خارت، اور طنز کے نشتر سانپوں کے ڈنگوں کی طرح لرا رہے تھے۔ جب سردار جسونت سنگھ کی آنکھیں اس سے چار ہو میں، تو مز جیکن نے بڑے وقار، بڑے غور سے اپنے سر کو کئی بار جنبش دی، کہ ہاں، زرا اپنی اوقات تو پہچانو۔ تم حد سے زیادہ بڑھ گئے تھے۔ تمہارے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ — سردار جسونت سنگھ کے سینے میں گالیوں کا ایک غبار سا اٹھا۔ وہ دیر تک ڈیک پر کھڑا زیر لب گالیاں نکال ٹال کر اپنا سینہ ہلکا کرتا رہا۔ لیکن اس کے دل میں غصے کا جوش علہ بھڑک رہا تھا، وہ کسی پہلو مختڈانہ ہوتا تھا۔ پھر اس

کے قدم اسے بے اختیار بار روم میں لے گئے۔ بار روم میں لگے ہوئے آئینے میں دیکھ کر وہ حیران ہو گیا، کہ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی ایک باریک سی لرا بھری ہوئی تھی۔ کیا یہ وطن پنچھے پر خوشی کے آنسو ہیں؟ لیکن اس کے دل کا چورپاکار پکار کر اسے جنجنحوڑ رہا تھا، کہ سردار جسونت سنگھ، تم اپنے آپ کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔ یہ خوشی کے آنسو نہیں۔ بلکہ دراصل تم رو رہے ہو۔ کیونکہ جان میکفرسن نے تمہارے منہ پر تھوک دیا ہے۔ اور مز جیکسن تمہاری درگت پر جی کھول کے مسکرا رہی تھی۔۔۔

”بُوائے، ایک پیگ و سکی۔“ اس نے گلا پھاڑ کر پکارا۔

”لندن پیگ صاحب، یا پٹیالہ پیگ؟ بار میں نے حسب معمول دریافت کیا۔ سردار جسونت سنگھ نے خود اسے مختلف پیگوں کے پیانے سکھائے تھے۔ لندن پیگ سب سے چھوٹا تھا، فرنچ پیگ اس سے زیادہ، امریکن پیگ اس سے بھی زیادہ، اور پٹیالہ پیگ سب سے بڑا، کوئی نصف گلاس کے قریب۔ سردار جسونت سنگھ اپنے دل کی دکھتی ہوئی گمراہیوں میں کھویا ہوا تھا۔ اس نے بار میں کی بات نہ سنی۔

”لندن پیگ صاحب، یا پٹیالہ پیگ؟ بار میں نے دوبارہ پوچھا۔“

”لندن پیگ کی ماں کو۔۔۔“ سردار جسونت سنگھ نے چونک کر ایک بھدی سی گالی دی۔ دو تین پٹیالہ پیگ پی کر اس کا دل پکھہ ہلکا سا ہو گیا۔ اور اسے یوں محسوس ہونے لگا کہ جو گالی اس نے لندن پیگ کی ماں کو دی تھی، وہ اصل میں جان میکفرسن، مز جیکسن بلکہ جزیرہ انگلستان کی ساری ماڈل کو یکساں طور پر لگتی تھی۔ اس خوشنگوار احساس سے اس کے قلب اور دماغ پر کچھ آسودگی، کچھ سکون، کچھ سرور چھا گیا۔ اور وہ بار میں بیٹھا جھوم جھوم کر لندن پیگ کی ماں، بن اور بیٹی کو نئی نئی اچھوتی گالیوں سے نوازتا رہا اور پٹیالہ پیگ پر پٹیالہ پیگ پیتا رہا۔

آدمی رات کے قریب جب رابرٹ لانگ جو نیویارک پوسٹ کے نامہ نگار خصوصی کی حیثیت سے ہندوستان آ رہا تھا، اپنی روزانہ ڈائری لکھنے بیٹھا۔ تو اس نے یہ قلم بند کیا:

”جہاز بمبئی کے ساحل کے عین سامنے لٹکرانداز ہے۔ کل صبح دس بجے یہ بلیز پاٹریم

میں داخل ہو کر اپنے مسافروں کو بند رگاہ پر اگل دے گا — جیسے مجھلی نے حضرت یونس علیہ السلام کو اگل دیا تھا! یہ تشبیہ میری اپنی نہیں۔ بلکہ میں شاہد کے خیال کو استعمال کر رہا ہوں۔ جب کبھی وہ جہاز کی زندگی سے آتا جاتا ہے، تو کہا کرتا ہے کہ رابرٹ پڑھو، کہ اے خدا تیرے سوا اور کوئی نہیں۔ تیری ذات پاک ہے۔ بے شک میں بہت ہی بڑا گنگار ہوں۔ شاہد کرتا ہے، کہ جب حضرت یونس نے مجھلی کے پیٹ میں یہ دعا مانگی تھی تو اس نے انہیں ساحل پر اگل دیا تھا۔ شاید اس دعا کی مدد سے ہمیں بھی اس مگر مجھے جیسے جہاز سے جلد نجات مل جائے!

”رات کے اندر ہرے میں بہبی میں بھلی کے قمقوں اور میرن ڈرائیور پر چلتی ہوئی موڑ کاروں کی روشنیوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اس وقت اس شر میں کوئی خصوصیت دکھائی نہیں دیتی۔ یہ امریکہ یا یورپ یا انگلستان کا کوئی بھی شر ہو سکتا ہے۔ اس وقت اسے دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا، کہ یہ ”شریوگیوں“، ”ہمارا جوں“، ”گاندھی“ اور جناح کی سرزی میں پر واقع ہے۔“

”آج رات میں نے ایک عجیب واقع دیکھا۔ ڈنر کے بعد جب میں سب سے اوپر والے ڈیک پر حسب معمول چھل قدی کے لیے گیا، تو ایک کونے سے سکیوں کی لگاتار آواز آرہی تھی۔ مجھے حیرانی ہوئی۔ کیونکہ عموماً اس وقت اس ڈیک پر میرے سوا اور کوئی نہیں ہوا کرتا۔ میں نے دیکھا، کہ جان میکفرسن ڈیک کے جنگل پر جھکا ہوا بے اختیار بلکہ بلک کرو رہا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد مز جیکسن شاید اس کی تلاش میں اوپر آئی، تو وہ بھی اس کے ساتھ مل کر رونے لگی۔ سردار جسونت سنگھ ساری شام بار میں بیٹھا ہوا شراب پیتا، گالیاں بکتا، گاتا اور دھاڑیں مار مار کر روتا رہا۔ سارا دن شاہد مجھے نظر نہیں آیا۔ رات کو ڈنر پر بھی وہ موجود نہیں تھا۔ میرے دریافت کرنے پر کیبین بوائے نے بتایا کہ وہ بھی اپنے بر تھ پر منہ ڈھانپے پڑا رہا ہے۔ شاید وہ بھی رو رہا ہو۔ حیرت۔ شاید یہ اس پر اسرار ملک کی خاصیت ہے۔ نہ معلوم اس کی فضا میں کتنی المناک صدیاں کپکپا رہی ہیں۔ میں اپنے دل پر بھی ایک عجیب سا بوجھ محسوس کر رہا ہوں۔ اس کی کوئی خاص وجہ بھی نہیں۔ لیکن ہر لمحہ یہ بوجھ بڑھتا ہی جاتا ہے۔ شاید دو چار خاموش آنسو بہانے سے یہ مبسمی خلش مٹ جائے۔ لیکن میں ابھی اس باحول کاشکار نہیں ہوا۔۔۔“